دل گداز تحریریں، • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

March
2017

Pakistanipoint.com

Waqar
Azeem

20

سے زائد ناقابل یقین

خوفناک سچی بیانیاں اس

شمارے میں موجود ہیں

☆ ..... ''مسئلہ یہ ہے'' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆ ..... ایم اے راحت کا تہلکہ خیز سلسلہ ''زرد لومڑی'' تصوف کی دنیا کا شاہکار، کاوش صدیقی کا نیا سلسلہ ''خانقاہ''

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکولیشن

0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مغدام اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

قیمت فی شمارہ 60 روپے جلد: 34 - شمارہ: 03 مارچ 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام لبام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی تحریر کو ادارہ کی اجازت کے بغیر کسی بھی طرح شائع کرنا قابل تعزیر جرم ہے۔ ادارہ کسی بھی تحریر کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے لیے اس کے کسی بھی طرح استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

07 ہمت ہی تو چاہیے — منزہ سہام

09 احوال — کاشی چوہان
قارئین کے خطوط اور حال
احوال کا دل چسپ سلسلہ

29 لائف بوائے — اسماء اعوان
حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو
اپنے اندر کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

35 گھاسی رام کا بھوت — محمد سلیم اختر
ایک ظالم چوہدری کے ظلم کا شاخسانہ
اک بیٹے کی خوف بھتی

44 سلومی اور رامی — جاوید راہی
اس شخص کا قصہ حیرت جو آج بھی
اک روح کے زیر اثر ہے

50 ہم زاد — افتخار چوہدری
اس شخص نے ہم زاد قابو کرنے کے لیے
سب کچھ کر لیا تھا، مگر جب ہم زاد طاقتو

60 چھٹی منگنی — سباس گل
اُس دوشیزہ کی داستانِ عجب، جسے اپنوں
کا کیا گیا کالا جادو چٹ کر گیا مگر.....

74 چھل — ثمینہ طاہر بٹ
اُس لیکچرار کی عجب کتھا، جو وعدہ نبھانے کے
لیے اجل سے مہلت لے آئی تھی

81 عامل کا اشناپ — ہارون الطاف
ایک عامل کا اشناپ آج بھی اُس
قبرستان پر برس رہا ہے

86 نیم والے بابا جی! — نازیہ بتول رضا
اک برگزیدہ ہستی کی
داستانِ عجب

96 میری قبر پہ نہ آنا — حنا بشریٰ
خلق کے لیے اک نقارۂ تحریر عبرت سامانی
لیے ایک داستان حیرت

101 مالا کون تھی؟ — نفیسہ سعید
مالا کو بارش کی بوندوں سے بڑا ڈر لگتا تھا
پھر اک بارش ہی اسے بہا کر لے گئی

107 لال چُنری — الماس فاطمہ ارمان
اُس آتما کی کہانی جو ایک
لال چُنری میں قید تھی

113 یہ ہماری ہے — عطیہ ہدایت اللہ
اُس پُراسرار مخلوق کی کہانی، جس کی سچائی آج
بھی بکھری پڑی ہے

118 ایک ڈاکٹر کی موت — شیخ معظم الٰہی
ایک ڈاکٹر کا دل خراش واقعہ جو ایک بدرو
کا ذریعۂ حیات بن گیا تھا

128 نیا گھر — نینا خان
اس ایک نیا گھر لینا ہی اس خاندان
کے لیے غضب ہو گیا تھا

136 زرد لومڑی — ایم اے راحت
جاسوسی کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے والا
ایم اے راحت کا سلسلہ

152 اتاؤ — حمیرا خان
ایک طلائی مخلوق

158 ساتواں منکا — ناصر خان
سانپ اور انسان کی دوستی کی
ایک منفرد کتھا

164 نورانی ناگ — ڈاکٹر ثمینہ خان
اُس نیک ناگ کی کہانی، جس نے
اللہ کا گھر آباد کروایا تھا

170 دسواں میل — ممتاز احمد
ایک پُراسرار کہانی جس نے ایک مسافر کو
جنگل سے دربدر کیا اور پھر خود بھی دربدر ہو گیا

176 برف کے شہر — قمر علی عباسی
پاکستان کی برف پوش وادیوں کی سیر
کراتا ایک منفرد سفرنامہ

186 جن دوست — ارم ناز
ایک مصنفہ کی کماں حیرت تحریر جس کی
دوستی آج بھی ایک جن سے ہے۔

189 کچھ یاد رہا، کچھ بھول گئے — نیئر شفقت
مدرسے کے رستے میں اُس دن پُو پھٹتے
ہی اتنے بینگن کہاں سے آ گئے تھے

192 وہ شادی کس کی تھی؟ — عصمت پروین عظیمی
بڑے بھیا کے ساتھ پیش آنے والے پُراسرار
واقعات، جو آج بھی اُن کی یاد دلاتے ہیں

195 ادھورا چلّہ — مجید احمد جائی
اُس نوجوان کا قصہ جو محبوبہ کو پانے کے لیے
ادھورا چلّہ کاٹ بیٹھا تھا

198 میں زندہ ہوں — مور شاہد حسین
وہ نوجوان اچانک ہی ایک بدروح
کے ہتھے چڑھ گیا تھا

202 روٹی دے دو — شیما عبدالقیوم
آج بھی ہمارے محلے میں اُس
مقتول کی بھوکی روح بھٹکتی ہے

204 قوسِ قزح — رانا حبیب الرحمن
جیل کی سلاخوں کے پیچھے فیوڈل سسٹم
کے شکار ایک نوجوان کی سرگزشت

216 خونی ہرم — عاطر شاہین
اک سادہ لوح نوجوان جو مصر میں اپنی
ہم سفر کی بھینٹ دے آیا تھا

226 خانقاہ — کاوش صدیقی
خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے
جڑی ایک مرد درویش کی داستانِ عجب

242 مسئلہ یہ ہے — ادارہ
آپ کا مسائل کا حل، سچی
کہانیوں کا لازوال سلسلہ

252 ہائیڈ پارک — ڈی خان
زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ
جہاں قارئین خود ترتیب دیتے ہیں

257 تیرِ نیم کش — قارئین
قارئین کی سخن فہمی کو
آزماتا ایک دلچسپ سلسلہ

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، 7 OE تالپور روڈ، کراچی

سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 1900 روپے، افریقہ 365 ڈالر، کینیڈا، آسٹریلیا 365 ڈالر، ایشیا، یورپ 355 ڈالر

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچّائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچّائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جُرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

ہمت ہی تو چاہیے

کراچی میں تیمور خان اور لاہور میں کئی تیمور خون میں نہلا دیے گئے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سولہ معصوم اپنی جانوں سے گئے۔ بے شمار زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئے۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ خودکش بمبار کے ساتھ 3 سہولت کار بھی تھے جن کی تلاش جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیشہ کی طرح چند روز گزریں گے اور یہ سانحے بھی قصۂ پارینہ ہوں گے۔ کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ اول تو ملزمان پکڑے نہیں جاتے اگر پکڑ بھی لیے جائیں تو عدالت سے سزائیں نہیں ہوتیں، لہٰذا راوی دہشت گردوں کے لیے تو چین ہی چین لکھتا ہے۔ وہ اگر خود اپنے آپ کو بم سے نہ اڑائیں تو کوئی مائی کا لعل نہیں جو انہیں کیفر کردار تک پہنچا سکے۔ ایک عرصے سے سن رہے ہیں کہ سہولت کار اصل مجرم ہیں تو آخر ان پر گرفت کیوں نہیں کی جاتی۔ ان کو تلاش کرنا اتنا بھی مشکل نہیں..... وہ جو نہتے اور معصوم شہریوں کو خون میں نہلانے والوں کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہیں، جن کی پیاس صرف خون سے بجھتی ہے، جن کے چہرے بھیڑیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جو قاتلوں کے دستِ راست ہیں..... جو معصوموں سے جینے کا حق چھین لیتے ہیں۔ ان سہولت کاروں کو پکڑنا اتنا بھی مشکل نہیں۔ بس ذمہ داران کو ہمت کرنی ہوگی۔ بس ذرا سی ہمت..... انہیں یہ سوچنا ہوگا کہ یہ زندگی عارضی ہے۔ کل مرنے والا بھی اور مارنے والا بھی، سب اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے اور انصاف ہوگا۔ ایسا انصاف کہ یہ سہولت کار اپنے ہونے پر پشیمان ہوں گے۔ میں ذمہ داران سے اپیل کرتی ہوں کہ تھوڑی سی ہمت کریں بس ذرا سی..... اور اپنا چہرہ آئینے میں غور سے دیکھیں، ہر چہرے کے پیچھے ایک سہولت کار نظر آئے گا۔ ایک خونی بھیڑیا نظر آئے گا۔ بس ذرا سی ہمت ہی تو چاہیے.....

منزہ سہام

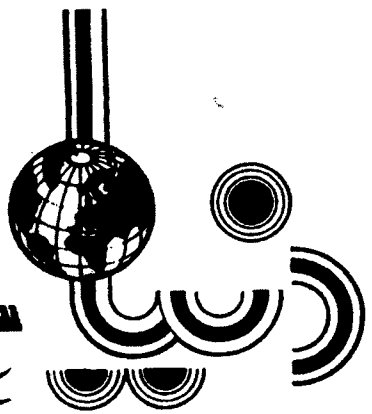

دنیا میں کس جگہ
سچی کہانیاں
کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو
زرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرسالانہ

کویت	55امریکی ڈالرز	ایران	55امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55امریکی ڈالرز	سری لنکا	55امریکی ڈالرز
یواے ای	55امریکی ڈالرز	جاپان	55امریکی ڈالرز
مصر	55امریکی ڈالرز	لیبیا	55امریکی ڈالرز
یونان	55امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55امریکی ڈالرز
فرانس	55امریکی ڈالرز	جرمنی	55امریکی ڈالرز
برطانیہ	55امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55امریکی ڈالرز
ناروے	55امریکی ڈالرز	پولینڈ	55امریکی ڈالرز
امریکہ	65امریکی ڈالرز	کینیڈا	65امریکی ڈالرز
افریقہ	65امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے II C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو! سلامت رہو، سوچا تھا اِک قرض ہے جو ادا کرنا ہے۔ قدیم وعدوں کی میلی میلی قبروں کے میلے میلے کتبوں کو محبت کی شبنم سے دھونا ہے۔ سچ کی صلیبیں جو ٹوٹ کر قبروں میں اوندھی پڑی ہیں انہیں پھر سے جوڑنا ہے۔ دن گزرے، ماہ گئے سال گزرے، صدی آئی۔ جگہ جگہ محبت کی عظیم ڈھیریاں، اپنی پامالیوں پر شکوہ کناں ہیں۔ دیوں کی لویں بھی ابر آلود ہو کر سلگ رہی ہیں۔ محبت کے دن کو تک رہی ہیں۔ محبت کے شہر بسانا بہت مشکل ہوتا ہے اور اگر یہ شہر در بدر ہو جائیں محبت آروزؤں کے ماتھے پر عقیدتوں کی تاج پوشی کیونکر ممکن ہے۔ زندگی بے معنی ہو کر شہر سے باہر کے ایک خالی پلاٹ سی ہو جاتی ہے، جس کی ویلیو کبھی نہ کبھی بڑھے گی کی آس لیے پڑی رہتی ہے اور یہ Value ہی کی ساری بات ہوتی ہے جسے فیوچر اور پاسٹ کے بجائے Present میں جانچتے ہیں۔ ایوارڈ تقریب کے بعد یہی توقع تھی کہ ہوا کا شور تھم جائے گا مگر وائے نصیب بعد میں تو تقریب کے چرچے شور سے محبتوں کے طوفان بن گئے۔ کاغذ کی کشتی نے آخر طوفان کے بعد ساحل پا ہی لیا۔ میں نے اپنے لکھنے والوں کو اپنی Value کا احساس ہی نہیں دلایا بلکہ اپنے دل میں ان کی جو قدر جو اہمیت تھی اسے دنیا کے سامنے Face to Face کر دیا۔ باتیں کرنے سے بات نہیں بنتی۔ پیارو! اگر خلوص اور ایمانداری آپ کے اندر رچی بسی ہے تو سمجھ لیجیے آپ کی محبتیں اپنی گواہی آپ ہیں۔ پیارو! شکریہ..... محبتوں کا مان رکھنے کے لیے، محبتوں کے دوام کے لیے، سچ کی زبان بننے کے لیے، ہر طرف میرے لکھنے والوں کی دھوم مچ گئی، میرا خواب سچ ہوا۔ سچی کہانیاں نے سب کچھ سچ کر دکھایا۔ اب اپنے سچ کی لاج آپ نے رکھنی ہے۔ اپنی تحریریں اتنی جاندار اور اعلیٰ پائے کی لکھیے کہ آپ کی تحریر پر کوئی انگلی نہ اٹھائے۔ بس اب بہت احتیاط سے آپ سب نے قلم کی حرمت کا پاس رکھنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی احوال کا آغاز کرتے ہیں۔ سب سے پہلی احوالی ہیں وہاڑی سے ہماری ہر دلعزیز اور لیجنڈ لکھاری، کامیاب ترین ڈراموں کی رائٹر اور ہماری آپی اقبال بانو لکھتی ہیں۔ ''جیتے رہو۔ خوش رہو۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ سچی کہانیاں مسلسل مل رہا ہے اور یہ تمہاری محبت ہے میں تمہاری محبتوں کی مقروض ہوں۔ فروری 2017ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ سچ کہوں تو دن بہ دن سچی کہانیاں میں نکھار آتا جا رہا ہے اور محنت بولتی ہے۔ تمہاری محنت نظر آتی ہے۔ بہت مبارک ہو۔ منزہ سہام مرزا کا اداریہ دل کھینچ لیتا ہے۔ خدا کرے ''طیبہ'' کو انصاف ملے۔ سچی کہانیاں کے ایوارڈ منعقد ہوئے۔ تم لاہور آئے۔ افسوس میں اس شاندار تقریب میں شریک نہ ہو سکی۔ بھئی آئندہ تم سردی اور بارشوں میں ایسی شاندار تقریب نہ کرنا اور نہ ہی جون جولائی میں۔ بہت مبارک ہو یہ زبردست تقریب منعقد کرنے پر۔ تمہارا احوال زبردست ہوتا ہے میں سارے خطوط پڑھتی ہوں۔ لگتا ہے جیسے یہ بھی میں نے لکھے ہیں اور آخر میں تمہاری نظم..... مزا آ جاتا ہے۔ سلیم فاروقی صاحب بچھڑ گئے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند کرے، (آمین)۔ دوشیزہ کے آفس میں ان سے سلام دعا ہوئی تھی۔ آہ! پلوں کے نیچے سے پانی گزر گیا۔ کتنے برس گزر گئے شمار کروں تو انگلیاں ٹیڑھی ہونے لگتی ہیں۔ فروری کے سچی کہانیاں کی سب کہانیاں بہترین ہیں تم بہت عرق ریزی سے سلیکٹ کرتے ہو۔ کاوش صدیقی کی ''خانقاہ'' بھی اچھی تحریر ہے اور ایم

اے راحت صاحب کی ''زرد لومڑی'' پسند آئی ہے۔ ناول ''زہر عشق'' بھی بہت خوب صورتی سے اختتام پذیر ہوا۔ تمہاری بہترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ مبارک ہو۔ کتابی شکل کا انتظار ہے۔ ''عشق نمبر'' کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ احمد سجاد بابر نے ناہید اختر پر بہت شاندار آرٹیکل لکھا ہے۔ اچھا لگا عرصے بعد ناہید کو دیکھنا۔ ''استانی جی کا عشق'' ممتاز احمد کی مزے کی تحریر ہے اور باقی سب کہانیاں بھی پسند آئیں کس کس کی تعریف کروں۔ اللہ کرے ''زورِ قلم اور زیادہ.....! حسب خواہش تمہیں دو کہانیاں بھجوا رہی ہوں جب جی چاہے لگا دینا اگر پسند آئیں تو۔ تمہارے ادارے کے سب افراد کو میرا بہت سلام اب اجازت دو۔ آج بہت سالوں بعد یہ خط لکھا ہے اور بڑا عجیب سا لگ رہا ہے، عادت نہیں رہی نا۔''

☆ پیاری آپی! آپ کیا آئیں کہ لگا احوال کی قسمت کا ستارہ عروج چھو گیا۔ آپ کی محبت میرے لیے نشان منزل ہے۔ زندگی کی ہر اچھی اور سچی دعا آپ کے لیے۔

☆ نازیہ بتول رضا کی کراچی سے احوال میں آمد ہے، لکھتی ہیں۔ ''کاشی بھیا! شمارہ یکم فروری کو مل گیا۔ یقین تھا کہ میری کہانی لگے گی۔ شکریہ کہ آپ نے میرے یقین کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ اب قارئین کی قیمتی آرا کا انتظار ہے۔ گزرتے سال نے ہم سب کو بہت دکھی کیا۔ امجد صابری اور جنید جمشید جیسی شخصیات ہم سے چھین لیں۔ اب تک یقین نہیں آتا۔ ابھی یہ غم تازہ ہی تھا کہ بانو قدسیہ صاحبہ ہم میں نہیں رہیں۔ بہت بڑا نقصان ہوا ہے ادبی دنیا میں۔ اللہ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔ اور سلیم فاروقی صاحب کی مغفرت فرمائے۔ کہانیوں پر تبصرہ نہیں کر سکتی کیونکہ بھائی کی شادی 20 فروری کو ہے اور ہم بری طرح مصروف ہیں۔ آپ سب سے دعاؤں کی گزارش ہے۔ امید ہے سب ساتھیوں نے بہترین لکھا ہوگا۔ آخر میں سب لکھاریوں کو مبارک باد کہ جنہوں نے اپنی محنت سے ایوارڈ حاصل کیے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سب کے لیے دعائیں اور سب مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔''

☆ اچھی بہن! بھائی کی شادی کی مبارک باد قبول کریں اور آپ ہماری دعاؤں میں ہر پل ساتھ ہوتی ہیں۔ تبصرہ.....! خیر امید ہے اگلی بار ضرور مکمل تبصرہ آپ کی طرف سے آئے گا۔

☆ قمر شہداد کوٹ سے یہ آمد ہے ہمارے پیارے بھائی مور شاہد حسین کی لکھتے ہیں۔ ''بھیا فروری کا شمارہ عشق نمبر بہترین سرورق کے ساتھ ملا۔ اداریہ ''میری طبیعہ'' لفظ لفظ موتی۔ اپنوں کی محبتوں کی محفل احوال اپنے عروج پر تھی۔ آپ ہمیشہ کی طرح دل کو چھو لینے والی باتیں کر رہے تھے۔ بشیر احمد بھٹی، رانا محمد شاہد، ولیم بیگ۔ فلک شیر تابش، بسمیں غزالہ نیساں۔ سید ملازم حسین شیرازی کے تبصرے زبردست تھے۔ فیصل ندیم بھٹی سلام دعائیں۔ غلام مرتضیٰ علوی آپ کی صحت کے لیے پرخلوص دعائیں۔ عابد علی بھٹی، نینا خان، احمد بلال، محمد اعجاز احمد، بھلی کرے آیا (خوش آمدید)۔ حنا بشریٰ شاندار تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ صائمہ مجید (بھابی) سلامت رہیں۔ ادی تحسین جونیجو جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں۔ خوش وسلامت رہیں۔ سدرہ انور ملی، محمد اسماعیل بروہی، ادی زرینہ جونیجو، منشی محمد عزیز مئے، مبدالغفار عابد امید ہے خیر خیریت سے ہوں گے۔ آپ کی تازہ نظم Sweet Eyes دل کو بھا گئی۔ ایوارڈ حاصل کرنے والے تمام ساتھیوں کو ڈھیروں مبارک باد اور دلی دعائیں۔ سلیم فاروقی، خواجہ حسین کی آنٹی اور مجید احمد جائی کی چچی کی بخشش اور مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ 4 فروری کو رات دس بجے ہماری تائی جان بھی انتقال کر گئی ہیں۔ ان کی بخشش کے لیے دعا کیجیے گا آپ سب۔ ''لائف ہوائے'' بے مثال تھی۔ حق، عاشقوں کے امتحان، چینی سے فاطمہ تک، انا اور امید، عشق سراب، پرموشن، تھوڑی سی محبت چاہیے، تیرے لیے ہم ہیں بنے، بس تری گلی میں، محبت کا وی اینڈ بے مثال تحریریں تھیں۔ قسمت کی دیوی بھی اچھی تھی۔ احمد سجاد بابر، ناہید اختر کا زندگی نامہ لائے۔ زرد لومڑی، قوس قزح دلچسپی سے بھرپور۔ استانی جی پسند آئی۔ بخت نامہربان منفرد تھی۔ باقی تمام مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ خانقاہ دلچسپی سے بھرپور سلسلہ ہے۔''

☆ پیارے مور! تبصرے کا شکریہ۔ بس اسی طرح ہمارے ساتھ رہو۔

اظہارِ تشکر

پرل پبلی کیشنز' پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کے کامیاب انعقاد پر.....

اپنے لکھاریوں' قارئین اور ادب پروروں کا تہہ دل سے شکر گزار ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم زندہ دلانِ لاہور کی محبتوں کے دل سے ممنون ہیں۔

بالخصوص ہم مشکور ہیں پرنٹ کاسٹ میڈیا' فنکار آن لائن' لاہور ٹی وی' صحافی برادری اور قابلِ عزت مہمانانِ گرامی کے.....

سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ 2016

بانی سہام مرزا

☆دبئی سے ہماری بہت پیاری آنٹی تسنیم منیر علوی نے ہمیں یاد کیا ہے۔ لکھتی ہیں۔ ''پیارے بیٹے کاشی سلام دعاؤں کے پیغام قبول ہو۔ کیسے ہو بیٹا! آج کل تو ایوارڈ کی تقریب جو جلد سجنے والی ہے اس کی تیاریوں میں مصروف ہو گے۔ آنکھوں دیکھا حال تو قلم بند ہوگا تو ہم بھی شریک بزم ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔ ہماری کہانی اب تک موصول ہوگئی ہوگی اور یقیناً اب کی بار ''انجام'' سے جلد آگاہی بھی ہوگی۔ تم سے موبائل پر بھی رابطہ بہت محال ہے۔ آخر کیوں؟ (مصروفیت)۔ ایک سچی کہانی ارسال خدمت ہے۔ ایک مسافر کی مختصر سی کتھا..... کہانی کی صورت میں حاضر ہے۔ دوران سفر انجانے میں کیا ہو گیا۔ یہ ہی اصل کہانی کا ماخذ ہے۔ سچی ہے اس لیے یقین لے کر ''سچی کہانیاں'' میں جگہ پائے گی۔ بہرحال ''انجام'' سے ضرور باخبر کرنا۔ کوئی رسالہ پیش نظر نہیں اس لیے تبصرہ ادھار ہے۔ انشاء اللہ ''احوال'' میں ''احوال'' لکھیں گے۔ اراکین بزم کی خدمت میں تسلیمات۔''

☆اچھی آنٹی! خدا آپ کو سلامت رکھے، تا قیامت رکھے۔ آپ کے یہ چند حروف بھی میرے لیے اعزاز ہیں۔ کہانی جلد اشاعت پذیر ہوگی۔ احوال میں تبصرے کا منتظر ہوں۔

☆ہماری ساتھی غزالہ کرن گلفشاں کالونی جھنگ روڈ فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ ''بھیا بے مزا ہیں۔ آپ نے تو کمال کر دیا جو کہا وہ پورا کر دکھایا۔ لاہور آ کر ایوارڈ تقریب منعقد کرنا آپ کی ہمت، جوش اور ولولہ ظاہر کرتا ہے۔ آپ اپنے رائٹرز کو بہت چاہتے ہو۔ عزت دیتے ہو۔ بھیا ہمیشہ خوش رہو۔ آپ کی طرف سے تقریب میں شرکت کا ایس ایم ایس موصول ہو گیا تھا مگر تقریب میں حاضر نہ ہو سکی۔ ایک تو فیصل آباد سے لاہور آنے کے لیے کوئی ساتھ نہ تھا، دوسرا دن بھر برکھا برستی رہی اور بارش کی وجہ سے آنا ممکن نہ تھا۔ جس کے لیے بہت معذرت خواہ ہوں۔ تقریب کا احوال اور روداد کا شدت سے انتظار ہے۔ حسب سابق پرچہ اس بار بھی بہت شاندار تھا۔ جو کہانیاں بہت پسند آئیں ان میں حق، عاشقوں کے امتحان، جینی سے فاطمہ تک، پروموشن، بے چاری شمو اور استانی جی کا عشق بہت شاندار اور عمدہ کہانیاں تھیں۔ عابدہ طارق کی ''بڑی باجی'' بہت حساس کہانی تھی۔ سب پڑھنے والوں کو درجہ بدرجہ سلام اور آداب آپ سب اپنا خیال رکھیے گا۔ ملتے ہیں اگلے ماہ تب تک کے لیے بائے بائے، ٹاٹا۔ تمام ایوارڈ یافتگان کو بہت بہت مبارک باد۔''

☆اچھی غزالہ! تمہارے پیارے تبصرے نے محبت کی ہر کرن کو منعکس کر کے احوال کو جگمگا دیا ہے خوش رہو۔

☆بشریٰ کنول جناح کالونی فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ ''سلام کے بعد عرض ہے سب سے پہلے تو یہ بتائیں پچھلے ماہ میرا خط کیوں نہیں لگا؟ (ملا ہی نہیں اس لیے نہیں لگ سکا)۔ فروری کا ''عشق نمبر'' پہلی تاریخ کو مل گیا۔ کاشی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ پاکستان کے دل لاہور میں ایوارڈ تقریب منعقد کرنا بہت ستائشی اور مستحسن قدم ہے۔ رائٹرز کو ایوارڈز سے نوازنا یقیناً ان کی محنت کا معاوضہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کی قدر افزائی ہے۔ اس سے ان میں مزید اچھا لکھنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ایوارڈ حاصل کرنے والے تمام رائٹرز کی خدمت میں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ جن احباب کو ایوارڈ نہیں مل سکے وہ دل چھوٹا نہ کریں۔ بس اچھا لکھتے جائیں یقیناً اگلے سال وہ بھی ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں ہوں گے۔ آپ کی طرف سے تقریب میں شرکت کی دعوت بروقت مل گئی تھی مگر کچھ گھریلو مصروفیات اور اسکول ڈیوٹی کے بے حد ضروری امور نمٹانے تھے، جس کے باعث حاضر نہ ہو سکی۔ میرا تقریب میں آنے کا بھرپور ارادہ تھا۔ میرا میکہ لاہور میں ہی ہے مگر نہ آ سکی۔ امید ہے آپ میری معذرت قبول کر لیں گے۔ ویسے تو مجھے دائیں بائیں سے تقریب کی بہت ساری اپ ڈیٹس مل چکی ہیں پھر بھی تقریب کی روداد کے تفصیلی احوال کا انتظار ہے۔ سلیم فاروقی صاحب کی وفات کا بہت افسوس ہے اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔ اس بار کہانیوں کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ ابھی تک مکمل پرچہ نہیں پڑھ سکی صرف چند ایک کہانیاں پڑھیں ہیں جن میں حق، عاشقوں کے امتحان، جینی سے فاطمہ تک، پروموشن، بے چاری شمو، استانی جی کا عشق اور بڑی باجی بہترین کہانیاں تھیں۔ لکھاریوں نے اچھی تخلیقات لکھیں۔ باقی پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔

سچی کہانیاں کا ''مختصر کہانی نمبر''

عام شماروں سے قطعی مختلف و منفرد ایک معرکۃ الآرا شمارہ

''مختصر کہانی نمبر''

ہم وہاں تک رسائی رکھتے ہیں

جہاں عام سوچ کی پہنچ نہیں

آپ کے پسندیدہ لکھاریوں کی اعلیٰ پائے کی کہانیوں سے سجا.....

''مختصر کہانی نمبر''

بہت جلد آ رہا ہے

مختصر کہانی نمبر میں اپنی تخلیقات اِس طرح ارسال کریں کہ 30 مارچ تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

سچی کہانیاں کا ''ایوارڈ نمبر''

سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی پہلی تقریب 26 جنوری 2017ء کو قذافی اسٹیڈیم کے پنجابی کمپلیکس میں شان و شوکت کے ساتھ انجام پائی۔

ایوارڈ تقریب کی مکمل روداد، ایوارڈ پانے والے لکھاریوں کے تاثرات اور تقریب کے یادگار لمحات کی مکمل تفصیل اور تصویری جھلکیاں، سچی کہانیاں کے ایوارڈ نمبر میں شائع کی جائیں گی۔

انشاءاللہ ماہ اپریل 2017ء کا شمارہ سچی کہانیاں کا ایوارڈ نمبر ہوگا۔

(لکھاری ساتھیوں سے گزارش ہے کہ اپنے تاثرات اس طرح ارسال کریں کہ 25 فروری تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔ سچی کہانیاں کا ماہِ اپریل کا شمارہ ''ایوارڈ نمبر'' ہوگا۔

اب اگلے ماہ تبصرے کے ساتھ احوال میں حاضری دوں گی۔''

☆ اچھی بشریٰ! تبصرہ پسند آیا آپ کا۔ ایوارڈ تقریب کی کامیابی پر خدا کا ممنون ہوں۔ آپ سب سے انشاء اللہ اگلی ایوارڈ تقریب میں ضرور ملاقات ہوگی۔

☆ ہمارے ہر دلعزیز لکھاری ساتھی اور بھائی جان ممتاز احمد سرگودھا سے اپنی محبتیں لیے حاضر ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''پیارے کاشی! السلام علیکم۔ نئے سال کا دوسرا شمارہ خوب صورت اور دلکش ٹائیٹل سے مزین ''عشق نمبر'' موصول ہوا جو کہ اپنی مثال آپ ہے۔ بہن منزہ سہام کے قلم سے خون کے آنسو رلا دینے والا اداریہ ''میری طیبہ'' کے عنوان سے ارباب اقتدار کو جھنجوڑ رہا تھا۔ سب سے پہلے ادارہ سچی کہانیاں اور بالخصوص کاشی چوہان خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے کراچی سے لمبا سفر کر کے لاہور آ کر پہلے سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ کی پروقار اور شاندار تقریب کا انعقاد کروا کر تمام رائٹرز اور قارئین کے دل جیت لیے۔ بلاشبہ رائٹرز کی عزت افزائی، حوصلہ افزائی کرنا بہت بڑا کارنامہ اور ادب دوستی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ دعا ہے اللہ کریم سچی کہانیاں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)۔ ایوارڈ تقریب میں اپنے محترم رائٹر ساتھیوں دوستوں سے ملاقات ہوئی سب دوست اپنی محبتوں اور چاہتوں کے پھول نچھاور کرتے مسکراتے چہروں کے ساتھ انتہائی خلوص سے ملے دل بہت خوش ہوا۔ اللہ پاک سب کو سلامت رکھے، شاد رہیں آباد رہیں یہ خوب صورت محفلیں سجتی رہیں ملاقاتیں ہوتی رہیں اور یہ محبتیں ہمیشہ قائم دائم رہیں (آمین)۔ میں سچی کہانیاں ادارہ کا تہہ دل سے شکر گزار اور انتہائی ممنون ہوں کہ مجھے اتنے بڑے اعزاز کے قابل سمجھا اور لگاتار تین سال کے موسٹ پاپولر رائٹرز کے اسپیشل ایوارڈ سے نوازا۔ اس عزت افزائی نے بہت حوصلہ دیا۔ کچھ دوستوں کی تقریب میں کمی شدت سے محسوس ہوئی یقیناً اپنی مصروفیات اور انتہائی ناگزیر مجبوریوں کے باعث شرکت نہیں کر سکے ہوں گے۔ اللہ پاک سب کو سلامت رکھے۔ تمام ایوارڈ اور سرٹیفکیٹس حاصل کرنے والے رائٹرز ساتھیوں کو بہت بہت مبارک ہو۔ دعا ہے اللہ کریم سب کو اور زور قلم عطا فرمائے۔ (آمین)۔ سابق مدیر سچی کہانیاں سلیم فاروقی کے انتقال کی خبر نے دل مغموم کر دیا۔ اللہ پاک ان کی مغفرت اور درجات بلند فرمائے۔ (آمین)۔ احوالیوں کے خوب صورت محبت ناموں کی خوشبو سے احوال مہک رہا تھا۔ نئے آنے والے تمام ساتھیوں کو خوش آمدید۔ سب سے پہلا محترمہ سیمیں غزالہ نیہاں صاحبہ کا بے حد ممنون اور شکر گزار ہوں کہ بہت خلوص سے ایوارڈ کی مبارکباد دی۔ پیاری بہنا حنا بشریٰ آپ نے بہت اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا بہت شکریہ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں اور جو اچھا لکھتا ہے وہ داد کا مستحق ہوتا ہے، داد ملنا اس کا حق ہوتا ہے۔ مجید احمد جائی، فیصل ندیم بھٹی، محمد شاہد حسین اور بھائی علی رضا آپ سب نے بہت محبت اور خلوص سے یاد کیا بہت شکریہ آپ سب کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ کاشی چوہان کی نظم Sweet eyes نے احوال کو چار چاند لگا دیے بہت عمدہ نظم تھی۔ موضوع کے اعتبار سے تمام عشق نمبر کی کہانیاں ایک سے ایک بڑھ کر تھیں۔ اقبال بانو کی کہانی ''حق'' بہترین کہانی تھی۔ ''عاشقوں کے امتحان'' کے عنوان سے ایم قاسم بلوچ بہت شاندار کہانی لے کر آئے، ویلڈن قاسم خان۔ ''جینی سے فاطمہ تک'' عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف گامزن موضوع بتول کی کہانی ایک شاہکار کہانی تھی۔ ثمینہ طاہر کی کہانی ''پروموشن'' یادگار کہانی تھی۔ ارم ناز کی ''بے چاری شمو'' ایک منفرد کہانی تھی۔ عابدہ طارق کی پہلی کاوش ''بڑی باجی'' کا تھیم اور کہانی کا پس منظر بہت عمدہ اور حقیقت پر مبنی تھا یہ سچ ہے قربانی دینے والوں کے ہاتھ کچھ نہیں آتا وہ تہی دامن رہ جاتے ہیں۔ انا اور امید، عشق سراب، تھوڑی سی محبت چاہیے، تیرے لیے ہم ہیں بنے، بس تیری گلی میں، محبت کا دی اینڈ، قسمت کی دیوی، بخت نامہربان، عشق کی معراج، گڑیا اور تم میرے، بہت اچھی اور بہترین کہانیاں تھیں۔ تمام مصنفین کی محنت کا عکس تحریروں میں نظر آ رہا تھا۔ ہائیڈ پارک میں صائمہ بشیر کی نعت ''کب ہوگا اذن سفر'' نے روح کو معطر اور سیراب کیا۔ ''مجھے تم یاد آتے ہو'' عظمیٰ شکور کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ عبدالوحید مزاج، علی رضا، غلام مرتضیٰ علوی، خواجہ حسین، ایم حسن نظامی، راشد لطیف ہیرے والا اور تحسین جونیجو کے انتخاب بہت پسند

نئے سال میں..... ہم اور آپ..... ہم قدم

آپ کا اپنا سچی کہانیاں نئے سال میں آپ کے لیے..... اُن نئے سلسلوں کا آغاز کر رہا ہے، جو یقیناً آپ کے لیے، بہت کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ صرف آپ کے لیے.....

ایک سیلفی ہو جائے:

قارئین کی خوشیوں سے جڑا وہ سلسلہ جس میں آپ اپنی خوشیوں بھرے دن کی ایک یادگار تصویر بھیج سکتے ہیں۔ اُس تصویر کو ہم سچی کہانیاں کی زینت بنا دیں گے۔ جلدی کریں اور ہمیں بھیج دیں اپنا ایک یادگار پل۔

سپر ریڈر ایوارڈ:

نئے سال 2017ء میں سب سے زیادہ سالانہ خریدار بننے یا بنانے والے قاری یا لکھاری کے لیے ایوارڈ تقریب میں..... سپر ریڈر ایوارڈ کا اعلان کیا جائے گا (تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ سوچنا چھوڑیں اور سالانہ خریدار بن جائیں)

I Am The Best

نوجوانوں کے لیے بہترین موقع..... اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ سلور اسکرین کے لیے پرفیکٹ ہیں۔ اداکاری آپ کے خون میں شامل ہے تو فوری طور پر اپنی چار مختلف پوز میں تصاویر ہمیں بھیج دیجیے۔ ہم آپ کے اور سلور اسکرین کے درمیان پل کا کام کریں گے۔

آئے۔ تحسین جونیجو، زرینہ جونیجو، ام عادل، مسز نوید ہاشمی، کنول عمران خان، منشی عزیز مے، مسز نگہت غفار، فرح انیس، سید العزیز جی آر، روبینہ ناز روبی، عمارہ ناز، مقصود احمد بلوچ، شاہد رفیق سہو بھٹی آپ سب کدھر غائب ہو؟ آپ سب کے بنا احوال کی محفل ادھوری ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو!''

☆ پیارے بھیا! ایوارڈ تقریب کے لیے آپ کی محبت میرا مان تھی۔ آپ قدم بہ قدم ساتھ رہے۔ میرے لیے یہ محبتیں ہی سب کچھ ہیں۔

☆ کوٹ مومن سے فرزانہ گل لکھتی ہیں۔ ''ماہ فروری کا ''عشق نمبر'' 4 تاریخ کو مارکیٹ سے ملا۔ آپ نے ایوارڈ کی تقریب کا وعدہ پورا کر دیا۔ بھیا جی مبارکباد کے مستحق تو آپ ہیں جو اتنی محنت اور لگن کے ساتھ یخ بستہ موسم اور برستی بارش میں تقریب منعقد کرنے میں کامیاب ہوئے اور سچی کہانیاں سے جڑے لکھاریوں کو ان کی محنت کا صلہ دیا ان کو اعزازات سے نوازا۔ جنوری اور فروری میں شائع ہونے والی فہرست کا جائزہ لیا تو میں اس نتیجے پر پہنچی کہ سب لکھاری یقیناً ایوارڈز کے صحیح حقدار تھے۔ فہرست میں میرٹ نظر آیا کہانیاں واقعی اس قابل تھیں کہ انہیں ایوارڈ یافتہ کہانیاں قرار دیا جاسکے۔ یہ ادارے کی اعلیٰ ظرفی ہے اور درست فیصلہ ہے۔ احوال کے آغاز کا ایک ایک لفظ بغور پڑھا ہاں بھیا پتہ لوگ صرف زبانی جمع خرچ کرتے ہیں اور جھوٹے وعدوں کے قلابے ملانے میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں مگر عملی طور پر صفر ہوتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا آپ ان لوگوں کو بے نقاب کرتے جنہوں نے الزامات لگائے۔ اکانی بھائی کی جن کی نہ تو لوٹی اپنی عزت ہوئی ہے اور نہ ہی وہ دوسروں کی عزت کرنا جانتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر صرف اپنی ذات کے گرد گھومتا ہے۔ بس کسی طرح انہیں ایوارڈ مل جائے خواہ تحریر اس قابل ہو یا نہ ہو بس اللہ اللہ خیر صلا۔ اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت دے پچھلے ماہ خط تھوڑی تاخیر سے سپرد ڈاک کیا تھا لگتا ہے آپ کو دیر سے ملا جس کی وجہ سے احوال میں شامل نہ ہوا۔ اس بار ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ جن کہانیوں کو نمبر ون قرار دیا جاسکتا ہے ان میں حق، عاشقوں کے امتحان، جینی سے فاطمہ تک اور پروموشن شامل ہیں۔ نگار خانے سے پاگل خانے تک میں قسمت کی دیوی وندرفل کہانی تھی۔ ''لاری اڈا'' بہت شاندار ہے۔ اب تک شائع ہونے والی دونوں کہانیاں بہت زبردست رہیں۔ دونوں سلسلے بہت اچھے ہیں۔ مختصر کہانیوں میں بڑی باجی، بے چاری شمو، عشق کی معراج اور گڑیا بہترین کہانیاں تھیں۔ اب تک کے لیے اتنا ہی اگلے مہینے پھر حاضری ہوگی۔''

☆ پیاری فرزانہ! سلامت رہو تبصرہ اچھا لگا اور سب سے اچھی لگی تمہاری محبت اور تمہارا خلوص۔ جگ جگ جیو!

☆ تنزیلہ عرف تانی، منڈی بہاؤالدین سے لکھتی ہیں۔ ''پچھلے ماہ خاندان میں شادیوں کی وجہ سے احوال میں حاضر نہ ہوسکی۔ یقیناً کسی نے بھی میری کمی محسوس نہیں کیا ہوگا۔ سچی کہانیاں 3 فروری کو ملا ٹائٹل بہت ہی جاذب نظر تھا۔ سُروں کی ملکہ اپنی پسندیدہ گلوکارہ کی تصویر ٹائٹل پر اور ان کی زندگی کی پوری روداد پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ طیبہ پر ہونے والے ظلم کو ادارہ میں منزہ سہام نے کاٹ دار لفظوں سے اجاگر کیا، انشاء اللہ ظالم اپنے انجام تک پہنچیں گے اور آئندہ کسی کو اس طرح کا ظلم کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ احوال میں اس بار خطوط کچھ کم تھے۔ جی، فیصل ندیم بھٹی میں بالکل خیریت سے اور فٹ فاٹ ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔ ایوارڈ تقریب بالآخر خوش اسلوبی سے سرانجام پاگئی۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ رائٹر حضرات کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی۔ میں گزارش کروں گی کہ اب ہر سال تقریب منعقد ہوتی رہنی چاہیے۔ جنہوں نے اپنی محنت سے اچھا لکھ کر ایوارڈ حاصل کیے ان سب کو مبارکباد پیش کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ وہ مزید بہتر لکھیں گے۔ ایوارڈ حاصل کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی ایوارڈ حاصل کرنے کے حقدار تھے۔ فروری کے ''عشق نمبر'' میں شائع ہونے والی کہانیاں لاجواب تھیں۔ حق بہت زبردست کہانی تھی۔ ''عاشقوں کے امتحان'' دل موہ لینے والی بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ ''جینی سے فاطمہ تک'' کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ زبردست کہانی تھی۔ ''استانی جی کا عشق'' واقعی ایک سچا اور لازوال عشق تھا۔ بس کنڈکٹر اور پڑھی لکھی ٹیچر کا پاکیزہ عشق کامیاب ہوا مگر آخر میں ٹریجڈی نے دل افسردہ کر

خواتین کی محبوب قلم کار

رفعت سراج کی تازہ ترین شاہکار ''دامِ دل''

رفعت سراج کے جادو گر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

''دامِ دل'' ..... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

''دامِ دل'' ..... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی..... اور جب محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو.....

''دامِ دل'' ..... کہانی ہے اُس ماں کی ..... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی رویوں نے سولی چڑھا دیا

''دامِ دل'' ..... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریہہ چہروں سے نقاب اُتارنے والوں کی

''دامِ دل'' ..... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی ..... جن کی ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول ''دامِ دل''

آپ کے اپنے ماہنامہ ''دوشیزہ'' ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

دیا۔ بے چاری شموائیسی بے شمار کہانیاں ہمارے معاشرے میں بکھری پڑی ہیں۔ ارم ناز نے خوب صورت الفاظ سے عمدہ کہانی ترتیب دی۔ ''بڑی باجی'' قربانی ایثار اور ذمہ داریوں کو نبھانے کا درس دیتی بہترین کہانی تھی۔ عابدہ طارق نے کامیابی اور عمدگی سے کہانی لکھی۔ انا اور امید، عشق سراب، پرموشن اور محبت کا دی اینڈ بہترین کہانیاں تھیں کچھ مصروفیات کی بنا پر پورا رسالہ نہیں پڑھ پائی جس کی وجہ سے اتنا ہی تبصرہ۔ اب اجازت چاہوں گی اس پیغام کے ساتھ کہ خوش رہیں خوشیاں بانٹیں۔''

☆ پیاری تنزیلہ! تبصرے کا شکریہ بس ہر ماہ آپ کا تبصرہ احوال کی زینت بنے گی۔ کر وعدہ!

☆ ہماری پیاری آپا مسز نوید ہاشمی بہت دنوں بعد احوال میں شرکت کر رہی ہیں لکھتی ہیں۔ ''دوستوں اور ساتھیوں امید کرتی ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ بات ہو جائے ایک ایسے شخص کی جو ارادے کا پکا، لگن کا سچا، ہمت محنت جس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اگر ہمت ہو، محنت ہو، محبت ہو تو ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔ کاشی چوہان کا رواں لے کر چلا اپنے شہر سے دوسرے شہر۔ سردی نے راستہ روکا سردی بولی اپنے گھر کے نرم گرم بستر چھوڑ کر مت جاؤ، دھند میں کہاں جاؤ گے راستہ بند ملے گا۔ مت جاؤ آگے کی منزل نظر نہیں آرہی کچھ دکھائی نہیں دے رہا رک جاؤ۔ بادل نے کہا راستہ روکے ہم بھی کھڑے ہیں برس جاؤں۔ بارش برسی مگر کہاں صاحب۔ کاشی چوہان نے اپنے شہر سے دور دوسرے شہر محفل سجائی اور کیا خوب سجائی۔ 30 شہروں کو ایک جگہ جمع کر کے اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا کاشی چوہان نے۔ ہم سب آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ میرے تمام دوستوں کو جن جن کو ایوارڈ ملا ہے دل سے بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں اور شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کاشی چوہان اور منزہ کا مسز نوید ہاشمی کو یاد رکھا۔ ایوارڈ دے کر محبت بڑھا دی۔ مجھ میں بھی لگن بھر دی کہ آپ سب کو نہ بھول پاؤں۔

''اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو☆ نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے۔''

ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ سوچا تھا شاید ایوارڈ کی وجہ سے اس میں کچھ کمی بیشی ہو جائے گی مگر نہیں جی یہ میگزین کاشی چوہان چلا رہے ہیں۔ اس کا نکھرنا جائز ہے۔ اس کا کمتر نا ممکن ہے۔ احوال میں تمام نئے دوست ملے نئے اور پرانے دوستوں کو خوش آمدید۔ خواجہ حسین کی آنٹی، مجید احمد جائی کی چچی کی مغفرت کی دعا۔ 2016ء کے ایوارڈ یافتگان کی جولسٹ آئی ہے ان سب کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔ کہانیوں میں مومنہ بتول، ممتاز احمد، ارم ناز کی کہانی پسند آئی۔ ''ہائیڈ پارک'' میں صائمہ بشیر عظمیٰ شکور راشد لطیف چھا گئے۔ ''تیر نیم کش'' میں غلام مرتضیٰ، رضوانہ کوثر، عدیل بھٹی، مائرہ خان کے بہترین اشعار تھے۔ ہمارے پرانے دوست لکھاری کہاں چلے گئے کاشی چوہان آپ کو پکار رہے ہیں۔ لوٹ آؤ دوستوں میں بھی اب اتنی مصروفیت کے باوجود اپنے ڈائجسٹ کے لیے وقت نکال رہی ہوں۔ مور شاہد، عادل حسین، کاشف عبید، بشیر احمد، نفیسہ قفل، ظفر علی، سمدرہ انور علی، شائستہ، سحر علی، محمد شہزاد، عبدالغفار عابد، فریدہ جاوید جن کے نام یاد نہیں آرہے وہ بھی پلیز واپس آجاؤ اور سچی کہانیاں میں اتنے رنگ بھر دو کہ سب بے ساختہ کہہ دے۔ ''تم ہی تو ہو'' سلامت رہو، خوش رہو، اب اجازت۔''

☆ پیاری سی آپا! یقین جانیں آپ کے تبصرے نے مجھے جو دلی خوشی دی اس کی مثال نہیں۔

☆ لاہور سے یہ آمد ہے ہماری آپی! فریدہ فری کی لکھتی ہیں۔ ''سچی کہانیاں ایوارڈ کراچی کے بجائے لاہور میں منعقد ہوا بے حد خوشی ہوئی ہم بھی اس تقریب میں شامل تھے کیونکہ کاشی چوہان نے ہمیں بھی انوائیٹ کیا تھا اور سب لاہور والے تشریف لائے تھے جس میں فیصل آصف جو ملتان سے ہمارے گھر آئی تھیں وہ ہماری پیاری دوست اور بہن ہیں اور نسیم نیازی، زمر نعیم، رضوانہ کوثر اور بشریٰ سعید سے مل کر بے حد خوشی ہوئی اور فیصل آباد سے بھائی صاحبان اور مجید احمد جائی سے بھی ملے اور ہمارے بے حد پیارے بھائی طارق محمود سے مل کر تو بے حد خوش ہوئے۔ تقریب بے حد شاندار تھی۔ وائٹی گرام بے حد اچھے تھے اور ایوارڈ اتنے

ڈیڈی

[illegible] لکھاری ساتھی رفعت سراج گزشتہ دنوں بہت گہرے صدمے سے دوچار ہوئیں۔ آپ [illegible] نے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ پہلی اولاد ہونے کے باعث رفعت سراج نے انھیں [illegible] لیا [illegible] ہوئیں۔ طویل العمری کے باوجود بھی ڈیڈی کی ہمت' حوصلہ اور جوانمردی دیدنی تھی۔ آپ نے محبت کرنے والوں کی تعداد بے شمار تھیں۔ کار سرکار کے علاوہ درس وتدریس کی کتب سے بھی تاعمر ارتباط رہا۔ اسی باعث آپ ہر کس وناکس میں مقبول ترین شخصیت میں شمار ہوتے تھے اور پھر جب اعجاز بھائی نے مجھے خبر دی کہ ڈیڈی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے ہیں تو چند لمحے تو میری سکتے کی سی حالت رہی۔ کان دو برسوں میں سارے ہی علم پرور ہمیں اکیلا چھوڑ جائیں گے؟

یہی سوال میرے ذہن میں گونجا جو ہنوز جواب طلب ہے اور اپنی تشفی چاہتا ہے۔ ڈیڈی کے لیے فوری طور پر 5 قرآن پڑھوائے اور اپنی جانب سے محبت کے چند پھول ڈیڈی کی طرف روانہ کر دیے کہ یہی جانے والوں کے لیے زادِ راہ ہوتا ہے۔

ادارہ پرل پبلی کیشنز اس دکھ کی گھڑی میں رفعت سراج اور ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ ہے اور مرحوم کی مغفرت اور اعلیٰ درجات کے لیے دعا گو ہے۔

خوب صورت تھے کہ دیکھ کر رشک آرہا تھا کہ ہم بھی کہانیاں لکھتے کہانیاں تو بے شمار ہیں مگر لکھنے کی سستی ہو جاتی ہے۔ سب ہی بہت اچھا تھا مگر منزہ جی ایک چیز کی بے حد کمی لگی آپ خود ہی سمجھ گئی ہوں گی۔ ڈولی جی ہمیں بے حد پسند آئیں کیونکہ ہم حسن پرست بھی ہیں۔ کاش ہم ان کے ساتھ ایک تصویر بنوا لیتے ان کو بے حد سلام دعا۔ نسیم سکینہ صدف کو ہم کس طرح بھول سکتے ہیں ان سے مل کر بھی بے حد خوشی ہوئی۔ ہمارے ہاتھ میں بہت تکلیف ہے سب کو بے حد سلام اور دعا آپ لاہور کیوں نہیں آئیں آپ سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ کاشی کے گھر والے بے حد پسند آئے خاص کر ان کی بھانجی۔ جس نے میرے ساتھ تصویر بھی بنوائی تھی۔''

☆ اچھی آپی! آپ بھی ہمیں بے حد پسند ہیں اس لیے تو آپ کو یاد رکھا اور دعوت دی تھی۔

☆ سرگودھا سے ہماری پیاری بہن صائمہ بشیر احوال میں حاضر ہیں۔ عرض کرتی ہیں۔ ''ابھی میں ایوارڈ کی تقریب کی ویڈیو دیکھ رہی تھی۔ اتنا اچھا پروگرام کسے نہ پر آپ کو تو بہت ہی مبارک اور میرا ذاتی خیال ہے کہ اس پروگرام کی کامیابی کا سہرا آپ کے سر ہے (میرا پورا ادارہ شامل ہے اس کامیابی میں) کیونکہ اپنے شہر سے دور نئی جگہ پر پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا جب کہ موسم کا وہ عالم تھا کہ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی، پھر وقت اور جگہ بدل جانا، اتنے کم وقت میں اتنا کامیاب پروگرام کرنے پر میں آپ کی ہمت کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کاشی آپ نے یہ ذمہ داری بہت ہی احسن طریقے سے نبھائی اللہ آپ کو سلامت رکھے اور آئندہ بھی اتنی ہمت اور لگن سے کام کرنے کی توفیق دے، آمین۔ میں اپنے تمام لکھنے والے بہن بھائیوں کو دلی مبارک باد پیش کرتی ہوں جن کو ایوارڈ ملے اور ان کی کاوشوں کو سراہتی ہوں۔ کاشی آپ نے مجھ ناچیز کو بھی اس اعزاز سے نوازا آپ کا بہت شکریہ۔ ہم لوگوں نے تو اس پروگرام کو بہت ہی انجوائے کیا۔ خاص طور پر جو آخری آئٹم تھا ''تیرے عشق نچایا'' اس نے تو ایک سحر سا طاری کر دیا تھا۔ قابل داد تھا وہ۔ میری زندگی کا تو ویسے بھی یہ پہلا پروگرام تھا اس سے پہلے میں کبھی کسی ایسے پروگرام کا حصہ نہیں بنی۔ اس لیے میں نے بھی بہت انجوائے کیا۔ ایک بار پھر اپنے بہن بھائیوں کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔''

☆ پیاری آپی! سرگودھا سے آپ کی آمد نے محبتوں اور ہمارے حوصلوں کو دوام بخشا۔ بس خدا آپ سب کو اپنی امان میں رکھے کہ آپ ہی کے دم سے ہم ہیں۔

☆ لاہور سے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی حنا بشریٰ نے بہت محبت سے اپنے خط کو سجا کر ہمارے پاس بھیجا ہے،

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد.....

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار....."

لکھتی ہیں۔ ''السلام علیکم کاشی بھیا! 26 جنوری کو علم وادب کے ستاروں سے چمکتی دمکتی بھیگی بھیگی شام، پہلی سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب داتا کی نگری میں منعقد کی گئی۔ یہ بات ہمیشہ میری خوشگوار یادوں میں رہے گی کہ پہلی تقریب میرے اپنے شہر لاہور میں ہوئی۔ جتنا جوش وخروش تقریب میں شامل ہونے کا تھا، اس سے کئی گنا زیادہ جوش موسم نے دکھا تھا۔ آسمان سے برستی بارش نے جیسے قسم کھا رکھی ہو کہ ادب کے ان دیوانوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچنے دوں گی۔ بہت سے لوگ دوسرے شہروں سے آئے تھے۔ ان کا جذبہ بھی قابل تحسین تھا۔ یہ ان کی ادب سے محبت کی علامت تھی۔ بارش نے تو اس دن لاہور والوں سے بھی کوئی نرمی نہیں برتی تھی۔ بھیگتے بھگاتے ادب کے یہ دیوانے ہر رکاوٹ کو روندتے ہوئے تقریب میں آخر کار پہنچ ہی گئے۔ سب ایوارڈ پانے والوں کو میری طرف سے بہت بہت دلی مبارک باد۔ اب اصل شاباش اور مبارکباد کا حقدار جو شخص ہے اب اس کا ذکر ہو جائے۔ اپنے شہر سے نکل کر دوسرے شہر میں تقریب کا اہتمام کرنا، سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا، موسم کی سختی جھیلنا، کاشی بھیا۔ سچی کہانیاں کی پہلی ایوارڈ تقریب کر کے تو آپ نے کمال کر دیا۔ اس تقریب کے ذریعے آپ نے جس طرح اس رسالے کو نمایاں کیا قابل قدر ہے۔ بھیا! آپ نے وہ کام کر ڈالا جو اس رسالے کے لیے کسی نے نہیں کیا تھا۔ کاشی بھیا آپ نے اس ادارے کے ساتھ مخلص ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ہم سب کو عزت کی کرسیوں پر بٹھا کر یہ ہمارا پیارا بھائی پوری تقریب کے دوران مصروف رہا۔ ایک لمحے کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ کاشی بھیا کو دیکھ کر کسی محنتی دہقان کا خیال ذہن میں آرہا تھا جس نے اپنی زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد بنا لیا تھا کہ کام کام اور بس کام کرنا ہے۔ کبھی روحانی نمبر، کبھی عشق نمبر، طویل کہانی نمبر اور پلیٹ فارم نمبر ا کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور پہلی رائٹرز ایوارڈ تقریب کر کے تو ہمارے بھیا نے کمال کر دیا۔ سچ کہتے ہیں کہ اللہ جس کو اس قابل سمجھتا ہے اسے عزت کا تاج پہناتا ہے۔ ویلڈن کاشی بھیا ویلڈن۔ اللہ آپ کو بے پناہ عروج عطا فرمائے۔ مجھے جو ابھی طفل مکتب ہے ایوارڈ کے قابل سمجھا اللہ کا کرم ہے اور آپ کا بے حد شکریہ۔ میرے بھائی نے 2014ء کے لوگوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ پھر بھی لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ میرے بھائی نے اپنے اندر سے وہ حساس سا رائٹر ختم نہیں کیا ایڈیٹر بن کر بھی میرا بھائی ایک نرم دل رائٹر رہا ہے۔ آفرین۔ میرے بھائی پر جو اتنی مصروفیت میں دوسرا عشق نمبر نکال ڈالا۔ ٹائیٹل بے حد حسین تھا۔ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ واقعی صحیح کہا تھا۔ احوال کا آغاز کاشی بھیا کی باتوں سے ہوا جو آپ کی ہر دم محبت کا دم بھرتے تھے۔ انہوں نے بھی آپ کو تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔ صرف رائٹرز کی حوصلہ افزائی کا عزم تھا میرے بھائی میں پھر یہ اتنا شور شرابہ کیوں۔ کاشی بھیا کی دیانتداری کو بھی تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔ کاشی بھیا کی اعلیٰ ظرفی کہ پھر بھی محبت اور محبت کا درس دے رہے تھے۔ احمد سجاد بابر نے ناہید اختر پر باکمال تحریر لکھی۔ ''استانی جی کا عشق'' بہت عمدہ تحریر تھی۔ اقبال بانو کی تحریر ''حق'' بھی متاثر کن تھی۔ جینی سے فاطمہ تک، تھوڑی سی محبت، قسمت کی دیوی، گڑیا، تم میرے ہو، عاشقوں کے امتحان، بڑی باجی بہت اچھی تحریریں تھیں۔ نازیہ بتول رضا کی تحریر ''بخت نامہربان میرا تھا'' واقعی خاص تحریر تھی۔ ''برف کے شہر'' کی سیر بہت خوب تھی۔ ''ہائیڈ پارک'' کے علاوہ باقی سلسلے بھی زبردست تھے۔ مجموعی طور پر دوسرا عشق نمبر بھی لاجواب تھا۔ آخر میں سب کے لیے بہت دعائیں۔ سلیم فاروقی صاحب مرحوم کی مغفرت اور اہل خانہ کے لیے صبر جمیل کے لیے دعا گو ہوں۔ Sweet eyes نظم بہت خوب صورت تھی۔''

☆ اچھی لڑکی! تم نے تو بڑا پیارا سا خط لکھ ڈالا۔ خوش رہو، دوسروں کو محبت دینے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

☆ احوال میں یہ آمد ہے، غلام مرتضیٰ علوی کی چک نمبر 301 گوجرہ ج ب سے۔ ''فروری کے ابتدائی دن جب گوجرہ کے اس چھوٹے سے گاؤں میں ابر رحمت برس رہی تھی، ڈاکیا فروری کا سچی کہانیاں، ایک اور رحمت کی صورت میں سے آیا اور لطف دوبالا ہو گیا بارش کا۔ مگر 2017ء کا پہلا مہینہ ہم سب کے لیے بھاری رہا۔ پہلے تو محترم سلیم فاروقی کے جانے کی خبر پڑی اس ہی طرح 22 جنوری بروز اتوار شام سات بجے میری بہت پیاری خالہ جان محترمہ نذیراں بیگم اعوان بھی ہم کو چھوڑ

اپریل 2017ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: _____

مکمل پتا: _____

_____

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اپریل 2017ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: _____ تعداد صفحات: _____

نام: _____

مکمل پتا: _____

_____

فون/سیل نمبر: _____

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اپریل 2017ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: _____ مصنف: _____

دوم، عنوان: _____ مصنف: _____

سوم، عنوان: _____ مصنف: _____

نام: _____ شہر: _____

[illegible] ماہ [illegible] سہام کی تحریر دل کو چیر گئی۔ احوال پڑھا تمام ہی ساتھی اپنے اپنے خطوط سے جگمگا رہے تھے۔ [illegible] اب خدا آپ پر اپنا کرم کرے، چک 58 شمالی سرگودھا سے فیصل ندیم بھٹی، محترمہ نفیسہ فضل صاحبہ، بورے والا [illegible] لاہور سے حنا بشریٰ، قمبر شہداد کوٹ سے مور شاہد، فیصل آباد سے علی رضا اور ذیشان ریاض، کراچی سے سیمیں [illegible] بہاولپور سے بشیر بھٹی اور حافظ عابد بھٹی کے خطوط بہت پسند آئے۔ باقی ابھی پڑھے نہیں۔ میرا خط شائع کرنے کا بھی شکریہ۔ میری کوشش ہوتی ہے تازہ شمارے پر تبصرہ لازمی لکھوں، چاہے لمبا ہو یا چھوٹا۔ کیونکہ جو چیز اچھی لگے اس کی تعریف لازمی کرنی چاہیے۔ سچی کہانیاں تو ہے ہی قابلِ تعریف۔ حق، عاشقوں کے امتحان، جینی سے فاطمہ تک، عشق سراب، بس تھوڑی سی محبت چاہیے، قسمت، قوس قزح پسند آئیں۔ قمر مجاہی صاحب کے طرزِ تحریر کی تو کیا بات ہے۔ ''برف کے شہر'' اعلیٰ تھی۔ گڑیا نسیم سحر کی سحر پھیلاتی عمدہ تحریر تھی۔ ''ہائیڈ پارک'' بھی اچھا تھا۔ میری مختصر تحریر اس میں شائع کرنے کا شکریہ۔ ''مسئلہ یہ ہے'' کالم تو دکھی انسانیت کے لیے دھوپ میں چھاؤں کا کام کرتا ہے۔ اب مارچ تک کے لیے اجازت، دعا ہے سچی کہانیاں اور اس کے پڑھنے والوں پر خدا یوں ہی اپنی رحمت برساتا رہے اور ان پر اپنا کرم جاری رہے۔''

پیارے بھائی غلام مرتضیٰ! تبصرے کا شکریہ۔ کہانی پڑھ کر رائے سے ضرور آگاہ کردیا جائے گا۔

☆ میاں چنوں سے ہمارے بہت پیارے بھائی مہر پرویز احمد دولو عرض گزار ہیں۔ ''سچی کہانیاں بروقت مل گیا، اس میں انتظامیہ کے ساتھ جناب کاشی چوہان کی خصوصی کاوش کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ محفل کو سجا کر چار چاند لگا دیتے ہیں۔ خطوط کا ایک جہاں آباد ہوتا ہے اور ہر لکھنے والا جناب کاشی چوہان کا ممنون ہے اور کیوں ممنون نہ ہو کہ انہوں نے انتظام بہت اعلیٰ کر رکھا ہوتا ہے۔ آنے والوں کے لیے سو طرح کے انتظامات کرنے ہوتے ہیں اور یہ صاحب اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے سرانجام دے رہے ہیں۔ سرورق کی حسینہ کو سردی کی پروا نہیں۔ شہری ہو کر ہم دیہاتیوں سے بھی زیادہ سخت جان ہے۔ احوال میں عیسوی سال کے شروع اور گزرے حالات پر مکمل روشنی ڈالی گئی۔ ہم ہر سال سالگرہ کا کیک کاٹتے ہیں، کاش کبھی زندگی کا ایک قیمتی سال کم ہونے پر نادم ہوں۔ اسما، اعوان لاالف بوائے کی خوبیاں گنواتی نظر آئیں۔ شہید جنید جمشید کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا۔ بس عقیدت کا اظہار ان کی روح کے لیے دعا کر کے کیا۔ ام منابل کا لکھا نوحہ ایک خاتون کی حسرتوں کی المناک کہانی تھی۔ منشی عزیز مئے بہت خوب صورت تحریر لائے۔ عشق کی خوب صورت جیت ظفر صاحب نے یقیناً حافظ صادق پر بہت احسان کیا۔ ابو محمد ابوآزاد وطن کی محبت میں ڈوبی تحریر تھی۔ ریحانہ آفتاب کی ''بھوک'' سرسید تحریر تھی۔ ''ٹھوکر'' بھی بہت سبق آموز تحریر تھی۔ سیمیں غزالہ کے بعد جناب ممتاز احمد کی بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔ بے ضمیر بے شک جتنا پیسہ کما لیں معاشرے میں بال برابر عزت نہیں ہوتی۔ تحریر سے پتا چلتا ہے کہ جناب ممتاز احمد صرف پلیٹ فارم نہیں ہر موضوع پر پھولوں کی مہکار سے ماحول معطر کرسکتے ہیں۔''

پیارے بھائی! سلامت رہیے۔ آپ کے لفظ لفظ سے محبت کی مہک احوال کو معطر کررہی ہے۔ سلامت رہیے۔

☆ ہمارے پیارے سے سلیمان شبیر اکوال، تلہ گنگ سے ہمارے ساتھ ہیں، لکھتے ہیں۔ ''پچھلے تین مہینے کی غیر حاضری پر معذرت۔ اس کی وجہ شمارہ لیٹ ملنا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ماہ جنوری کا شمارہ دو جنوری کی یخ بستہ شام کو ملا۔ یہ شمارہ بھی آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تمام رائٹر حضرات نے بھی اپنے قلم کے ساتھ خوب انصاف کیا۔ احوال میں سب کے ساتھ ملاقات [illegible] آئی [illegible] بہام کا اداریہ اور دل دل پاکستان واقعی ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا۔ اللہ تعالیٰ جنید جمشید کے درجات بلند [illegible] (آمین) اس شمارے میں سب سے خاص ''غیرت کے نام پر'' تحسین انجم انصاری، ''کشتیاں سب جلا ڈالیں'' سیمیں [illegible] ''سوال'' ریحانہ آفتاب بہت ہی خاص کہانیاں تھیں۔ ممتاز احمد بھائی ''بھرم'' کی صورت ایک اور شاہکار تحریر لائے۔ [illegible] بھائی، اللہ پاک صحت کاملہ عطا فرمائے، (آمین)۔ اور کتاب کی اشاعت پر مبارک باد قبول ہو۔ عبدالعزیز جی آ کی [illegible] بہت بھلی معلوم ہوئی اور اپنے علاقے کے کلچر کی بھی یاد تازہ کردی۔ اس کے علاوہ بھی تمام رائٹرز نے اچھی

کہانیاں پڑھتے کو دیں۔ نیا سلسلہ ''خانقاہ'' بھی اچھا ہے۔ ''زہرِ عشق'' کا اینڈ بھی اچھا تھا۔ اگلے ناول کا انتظار ہے۔ ''ہائیڈ پارک'' اور ''تیر نیم کش'' میں بھی سب کے انتخاب اچھے تھے اور آخر میں سچی کہانیاں کی رائٹرز ایوارڈ تقریب کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ اس کے ساتھ اجازت۔''

☆ پیارے سلیمان! لو تمہارا تبصرہ کچھ لیٹ سہی مگر لگا دیا۔ اپنا خیال رکھنا اور اب باقاعدہ ہو جاؤ بھائی۔

☆ کراچی سے ریحانہ آفتاب مختصر ترین تبصرے کے ساتھ شامل احوال ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''بھوک'' دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بے حد شکریہ اتنا طویل انتظار کروانے کے بعد خوشی دینے پر۔ ذرا جلدی باری لگائیں تاکہ نئی تحریروں کو بھی بھیجنے کا موقع دستیاب ہو۔ نئی تحریریں بھیج رہی ہوں۔ ایوارڈ کے لیے منتخب کرنے پر شکریہ۔''

☆ اچھی ریحانہ! سب سے پہلے تو کراچی سے لاہور ایوارڈ وصول کرنے آپ آئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ سلامت رہیے۔ کہانیاں جلد اشاعت پذیر ہوں گی۔

☆ ایم یعقوب احمدانی ڈیرہ غازی خان سے لکھتے ہیں۔ ''سب سے پہلے سب دوستوں کو خوش خبری دینا چاہوں گا کہ میری شادی ہوگئی ہے (ہم نے اعلان سن لیا بیٹا!) اور اللہ کے کرم سے خوشی ملی ہے اور میں اکتوبر سے غیر حاضر ہوا ہوں۔ کچھ مصروفیات کی وجہ سے تو کچھ شادی کی وجہ سے معذرت کرتا ہوں۔ کاشی بھائی! میری ذاتی اسٹوری شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ اور جن دوستوں نے میری اسٹوری پر تبصرے کیے ان کا بھی بہت شکریہ۔ پیارے محترم ممتاز احمد، عبدالغفار عابد، یوسف لغاری، ارم، سدرہ انور علی اور پیاری سی فرح انیس صاحبہ آپ سب کو الفت بھرا اسلام قبول ہو۔ اچھا کاشی اب اجازت۔''

☆ اچھے یعقوب! بہت بہت مبارک باد ہم سب کی طرف سے۔ خدا تم کو ہر خوشی سے نوازے مگر بھیا احوال میں شامل ہو جاؤ اب باقاعدگی سے۔

☆ لندن ضلع وہاڑی سے ہمارے عزیز دوست منشی محمد عزیز مے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''سب سے پہلے تو میری طرف سے آپ کو اور باجی منزہ سہام مرزا کو سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب باحسن طریقے سے منعقد کرنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد۔ میں نے پی ٹی سی ایل نمبر پر باجی منزہ سہام سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ بہرحال ان کو خصوصی طور پر مبارک باد کہ انہوں نے اپنے مرحوم بابا کی ایک خواہش کو کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ پر یقیناً سہام مرزا مرحوم کی روح بھی بہت خوش ہوئی ہوگی۔ یوں سمجھیں کہ یہ تو پہلا قدم ہے۔ اب انشاء اللہ یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہے گا اور اس بار جو تھوڑی بہت بدنظمی ایوارڈز کے حوالے سے ہوئی اگلی تقریب میں یقیناً اس قسم کی کوئی صورت حال پیش نہیں آئے گی۔ میرے حصے میں تو بشیر احمد بھٹی آف بہاولپور کا ایوارڈ آیا اور میرے نام کا ایوارڈ کون لے اڑا یہ پتا نہیں چل سکا۔ بہرحال تمام ایوارڈ ونرز کو مبارک باد اور نہ لے سکنے والوں کو Try Again کی تاکید کہ ہمت مرداں مدد خدا، حوصلہ نہیں ہاریں اور مستقل مزاجی سے لکھتے رہیں۔ یقیناً اگلی تقریب کے ایوارڈ ونرز میں ان کا نام بھی شامل ہوگا۔''

☆ بہت اچھے بھائی منشی! ہم سے بے ساختہ ملاقات تو یقیناً آپ کبھی نہ بھولیں گے۔ لیکن امید واثق ہے کہ اب یہ تقریب سالانہ منعقد ہوگی۔

☆ کراچی سے یہ زمانوں بعد آمد ہے ہماری پیاری پیاری بہن عقیلہ حق کی، لکھتی ہیں۔ ''تمہاری محبتیں، خلوص اور عنایتیں میرے پاس الفاظ نہیں کہ بیان کرسکوں، اس لیے کہتی ہوں کہ تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ وعدہ کیا تھا کہ کہانی لے کر خود آؤں گی لیکن بہنوں کی مصروفیات آپ سب جانتے ہیں۔ لیکن سوچتے سوچتے کتنے ہی دن گزر گئے پھر سوچا اس سے پہلے کہ بھائی ناراض ہو جائے TCS کر دیتی ہوں امید ہے بہن کی مصروفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگنور کرو گے۔ سچی

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجزیہ کار
محمود شام کی زیر ادارت
ماہنامہ
اطراف
کراچی
انتہاؤں میں رابطہ
جولائی سنہ 2014 سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا
بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین
☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا
☆ دنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص
☆ پاکستان کے سیاستدانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں عالمی تحقیقاتی اداروں کی بے لاگ رپورٹیں، آسان اُردو میں
☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی اوز کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ
معیشت | سفارت کاری | کتابیں | کامیاب زندگی | فن تعمیر | تندرستی
پاکستان کے اضلاع | موسیقی | ہم اور ہمارے بچے | طنز و مزاح | اردو ادب سے انتخاب
لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت
☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن
جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہ نامہ 'اطراف' میں ہے
Ph: 0092 21 32274661
Mob:0300-8210636
فلیٹ نمبر 508، لینڈ مارک پلازا، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی
Email: mahmoodshaam@gmail.com Web Site: www.atrafmagazine.com

کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی کامیاب تقریب منعقد کرنے پر میری طرف سے آپ کے ادارے اور خاص کر کاشی تم کو بہت بہت مبارک باد کے ساتھ بہت ساری شاباش۔ خوش رہو اور اسی طرح کامیابیوں کا سفر طے کرتے رہو۔ میں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ مجھ جیسی معمولی رائٹر کو بھی آپ لوگوں نے ایوارڈ کے اعزاز سے نوازا۔ تعریف، توصیف ایک رائٹر کے لیے بلڈ کی سی ہے اور میرے خیال سے ادارہ ایک لکھاری کی دکھتی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے جب وہ اس کے ہاتھ میں ایوارڈ کی صورت میں اس کو قبولیت کی سند دیتا ہے۔ آپ کی محبتوں کی بے حد مشکور ہوں اور امید کرتی ہوں آپ کو چند اچھی تحریریں ارسال کر سکوں۔ ایک تحریر بھیج رہی ہوں امید کرتی ہوں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔''

☆ اچھی اور بہت اچھی بہن! آپ کے اس نامے نے منہ میٹھا کر دیا۔ بس ایسی میٹھی میٹھی خوشیاں ہمیں دیتی رہا کریں۔

☆ ایبٹ آباد سے ہماری بہت پیاری بہن ام مناہل کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ''سب سے پہلے تمام اسٹاف اور قارئین کو ایوارڈ تقریب کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو جہاں ایوارڈ تقریب کی خوشی ہوئی وہیں فاروقی انکل کے انتقال کی خبر افسردہ کر گئی۔ کاشی بھائی آپ کی باتیں پڑھ کر دل اداس ہو گیا، پلیز پلیز پلیز ہمیں اپنے آپ سے دور نہ کریں اگر آپ ہی ایسا کریں گے تو ہم کہاں جائیں گے۔ پہلا سچی کہانیاں ایوارڈ آپ کی بے پناہ محنت اور محبت کا نتیجہ ہے اس کامیابی کا سہرا سہام مرزا، منزہ سہام کے بعد آپ کے سر ہی جاتا ہے کیونکہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کو (اگر میں غلطی پر نہیں ہوں) تقریباً 35 سال ہو چکے ہیں اور اتنے سال میں پہلا ایوارڈ تقریب یقیناً دورِ حاضر کے اسٹاف ممبران اور ایڈیٹر صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ منزہ باجی کا ادارہ ہمیشہ کی طرح کڑوا سچ تھا۔ ان دنوں یہاں پر واقعی بہت سردی ہو رہی ہے۔ کمرے سے نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لحاف سے نکلنے کا دل نہیں چاہتا۔ دن شروع ہوتا نہیں اختتام پذیر پہلے ہو جاتا ہے۔ لکھنے کا سوچتے رہ جاؤ رات ہو جاتی ہے۔ پہلے خشک سالی نے تنگ کیا ہوا تھا اب بارشیں ٹوٹ کے برسیں تو سردی جم کے ہوئی۔ سید ملازم حسین شیرازی اور رانا حبیب الرحمٰن سے خاص کر کہنا چاہتی ہوں کہ بھائی صبر کریں اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکل آسان فرمائے، (آمین)۔ کہانیاں ابھی دو چار ہی پڑھی ہیں کیونکہ رسالہ 6 تاریخ کو بک اسٹال پر آیا ہے۔ کوئی بات بری لگی ہو تو ہم معافی چاہتے ہیں۔''

☆ پیاری بہن! سلامت رہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ سب میرے ہیں۔ بھلا میں آپ کو ایسا کچھ کہہ سکتا ہوں۔ رہیں دوسری باتیں تو ان کی وجوہات اور ہیں۔ کبھی فون پر بات ہوئی تو آپ کی تسلی ہو جائے گی۔

☆ لاہور سے ہماری بہت پیاری بہن ثمینہ طاہر بٹ کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ جنوری کا شمارہ ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا۔ سب لکھاریوں نے اپنی اپنی تحریر کا حق ادا کیا۔ ماشاءاللہ۔ سچی کہانیاں کی محفل میں سب بہن بھائیوں نے خوب رونق لگائی۔ ایک بار پھر سب سے مل کر بہت اچھا لگا۔ اللہ پاک میرے اس قلم قبیلے کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ سچی کہانیاں کی ایوارڈ تقریب اسی ماہ کے آخر میں ہو رہی ہے اور وہ بھی پاکستان کے دل ''لاہور'' میں۔ جی آیاں نوں، جناب۔ ہم لاہوری دیدہ دل فرشِ راہ کیئے آپ سب کے منتظر ہیں۔ انشاءاللہ، دوشیزہ ایوارڈ کی طرح یہ تقریب بھی بہت شاندار ہوگی۔ اور ہمیں اپنے پسندیدہ لکھاریوں سے ملنے کا موقع ملے گا اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملے گا۔ اللہ پاک اپنا فضل ہم سب پر بنائے رکھیں اور سب کو صحت اور سلامتی والی عمر عطا فرمائے۔ آمین ثمہ آمین۔ اب اجازت چاہتی ہوں اس امید کے ساتھ کہ نئے سال کے پہلے بہترین شمارے کے ساتھ ساتھ سال 2017 کے سب شمارے بھی اپنی مثال آپ ہوں گے انشاءاللہ۔ زندگی رہی اور اللہ کو منظور ہوا تو اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔ تب تک کے لیے اپنا بہت خیال رکھئے گا اور ان کا بھی جو آپ کا خیال رکھتے ہیں۔ فی امان اللہ۔

☆ اچھی بہن ثمینہ! آپ کے تبصرے نے خوشی دی انشاءاللہ، ہمارا اور آپ کا ساتھ قائم و دائم رہے گا۔ میری دعا ہے کہ میرے تمام لکھاری ساتھی آپ کی طرح ہی محنتی اور عجز و انکسار والے ہو جائیں۔ آمین۔ آپ کی آمد کا بہت انتظار تھا مگر.....

[illegible] ہماری بہت اچھی لکھاری ساتھی فوزیہ احسان رانا زمانوں بعد تشریف لائی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ بہت [illegible] بعد اس بزم میں شریک ہو رہی ہوں۔ کاشی۔ تم مجھے بھول تو نہیں گئے ناں۔؟ دیکھو، میں نے ابھی بھی تم سب کو یاد رکھا ہوا ہے۔ بس۔ تھوڑی مصروفیت بڑھنے کی وجہ سے رابطہ ٹوٹ سا گیا تھا، مگر اب کوشش کروں گی کہ گاہے بگاہے اس پیاری محفل میں شرکت کرتی رہوں۔ سچی کہانیاں کو میں نے ہمیشہ ہی بہت اعلیٰ درجے کا پایا۔ دسمبر اور جنوری کے شمارے نظر سے گذرے اور بے ساختہ دل نے مجبور کیا کہ میں ان کی تعریف کروں۔ کیونکہ اچھی چیز کی تعریف نہ کرنا اس کے ساتھ بڑی ناانصافی والی بات ہے۔ ماشاءاللہ۔ سب لکھاریوں نے بہت اچھا لکھا۔ کاشی چوہان اور راحت صاحب کے مستقل ناولز تو اپنی مثال آپ ہیں ہی۔ باقی سب لکھنے والے بھی بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سچ کہوں تو مجھے اس ادارے کی یہ بات سب سے اچھی لگتی ہے کہ یہ پرانے لکھاریوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی بھرپور موقع دیتے ہیں۔ پرل پبلی کیشنز، پچھلی کئی دہائیوں سے علم و ادب کی خدمت میں مصروف عمل ہے اور اس ادارے کے بینر تلے چھپنے والے ہر شمارے میں ماشاءاللہ سیکھنے کو بہت کچھ ملتا ہے۔ اسی لیے میں کبھی خود کو اس سے دور نہیں رکھ پائی۔ میری جانب سے سب لکھنے والوں کو اور خاص طور سے کاشی کا اتنی عمدہ کارگردگی پر ڈھیروں مبارکباد۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ انشاءاللہ پھر حاضری دوں گی۔ اللہ حافظ۔

☆ اچھی فوزیہ! آپ کی کہانی ''ہونگا کہیں کا'' مجھے ابھی تک یاد ہے۔ گوشہ نشینوں کو سچ بیانیوں میں بھی آنا چاہیے۔ سچی کہانیاں تو آپ سب کا اپنا ہے۔ پھر اس سے دوری کیوں؟

☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے پہلی بار یہ آمد ہے ہماری لکھاری دوست مصباح نوشین کی۔ لکھتی ہیں، سچی کہانیاں میں نے پہلی بار پڑھا، اور پہلی بار میں ہی میں اس کی فین ہو گئی۔ اپنی دوستوں سے سن رکھا تھا کہ سچی کہانیاں ایک بہترین ڈائجسٹ ہے، سوچتی تھی کہ شاید ایسے ہی کہتی ہیں، مگر جنوری کا شمارہ مجھے میری دوست نے پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ میں نے پڑھا تو مان گئی کہ وہ سب سچ ہی کہتی تھیں۔ ماشاءاللہ۔ ساری کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ مجھے خوشی اس بات کی ہو رہی ہے کہ اللہ پاک نے ہمارے ملک میں کتنا ٹیلنٹ چھپا رکھا ہے۔ اور پرل پبلی کیشنز، منزہ آپا اور کاشی چوہان جیسے بے لوث اور بے غرض انسان بھی ہمارے پاس ہیں کہ نئے لکھنے والوں کی بھی اسی طرح عزت کرتے ہیں جیسے کہ پرانے اور منجھے ہوئے لکھاریوں کی۔ ماشاءاللہ۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کے کام میں برکت ڈالے اور آپ کے شمارے دن دگنی رات چوگنی ترقی کریں۔ آمین ثمہ آمین۔ اب میں اس محفل سے رخصت چاہتی ہوں۔ وعدہ رہا، پھر آپ سب سے ملنے ضرور آؤں گی۔ انشاءاللہ۔

☆ پیاری مصباح! خوش آمدید۔ آپ کے تبصرے کے بعد تو یہ کہنے کو دل چاہ رہا ہے کہ ''پردیسی آئے وطناں نوں۔'' اب اگر ہمت کر ہی لی ہے تو پیاری بہن، کچھ تحریری طور پر بھی دل خوش کر دو۔ ایک بھائی کا مان رہ جائے گا۔

☆ لاہور سے پہلی بار یہ آمد ہو رہی ہے ہماری بہت پیاری لکھاری بہن قراۃ العین خرم ہاشمی کی۔ لکھتی ہیں، کاشی بھائی! میں سچی کہانیاں بہت عرصے سے پڑھ رہی ہوں۔ میرے میاں صاحب ہر ماہ میرے لیے بہت سے ڈائجسٹ [illegible] لاتے ہیں، مگر اپنے لیے صرف سچی کہانیاں ہی لاتے ہیں۔ میاں صاحب کے پڑھنے کے بعد میری باری آتی ہے۔ اور سچ [illegible] اچھے اور معیاری ڈائجسٹ کو پڑھنے کے لیے اگر تھوڑا سا انتظار بھی کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یوں تو میں [illegible] لکھ رہی ہوں، مگر اب دل چاہتا ہے کہ سچی کہانیاں کے لیے بھی کوئی ''سچ بیانی'' احاطہ تحریر میں لے ہی [illegible] اجازت ہوئی تو ایک کوشش ضرور کروں گی۔ (اجازت ہے) اب آتی ہوں جنوری کے شمارے کی طرف۔ ماشاءاللہ [illegible] لمبانی انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھی۔ سب نے بہت اچھا لکھا ماشاءاللہ۔ دل خوش ہو گیا۔ میری [illegible] لکھنے والوں کو بہت بہت مبارکباد۔ اگر آپ نے محفل میں جگہ دی تو میں سمجھوں گی کہ مجھے آپ کی طرف سے [illegible] لکھنے کی بھی اجازت مل گئی۔ اللہ حافظ۔

بہن قراۃ العین آپ کی آمد کا بہت شکریہ۔ لیجیے میں آپ کو خوش آمدید کہنا ہی بھول گیا۔ تبصرے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اور دیکھ لیں آپ کا خط شاملِ اشاعت ہے۔ اور اب میں شدت سے آپ کی تحریر کا بھی منتظر ہوں۔ خوش رہیے اور عید کرتا ہوں کہ اگلے ماہ بھی آپکے خط کی زیارت ہوگی۔

لاہور ہی سے ہماری محفل میں پہلی بار تشریف لائے ہیں احد بٹ۔ لکھتے ہیں، کاشی بھائی میں سچی کہانیاں پچھلے بارہ سالوں سے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے سالانہ ممبر شپ بھی لے رکھی ہے۔ لیکن اس محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ اور اس کی وجہ ہمارے کا دن بدن بڑھتا ہوا معیار ہے۔ بہت سے نئے لکھنے والے آپ کے اس قافلے کا حصہ بنے ہیں اور ان میں میری بڑی بھابی ثمینہ طاہر بٹ صاحبہ بھی ہیں۔ اور میں اس بار اس محفل میں شریک بھی اس لیے ہی ہوا ہوں کہ بھابی کو بتا سکوں کہ بھابی جی u r the best۔ مجھے جنوری کے شمارے میں شامل ثمینہ بھابی کی کہانی ''ٹھوکر'' بہت پسند آئی۔ کاشی بھائی آپ کا ''زہر عشق'' تو بے مثال ناول ہے۔ میں شدت سے منتظر ہوں کہ یہ کب کتابی شکل میں آئے اور کب میں اسے اپنی الماری کی زینت بناؤں۔ ایم اے راحت کا ناول بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔۔ باقی سب لکھنے والوں نے بھی اپنے اپنے قلم کا حق ادا کیا۔ جزاک اللہ۔ اب مجھے اجازت دیں۔ اگر آپ نے میرا خط شامل کر لیا تو آئندہ بھی ہمت کر کے محفل میں شریک ہوتا رہا گا۔ انشاءاللہ۔

احد بھائی بہت بہت خوش آمدید۔ یہ محفل ہم آپ لوگوں کے لیے ہی سجاتے ہیں۔ اور آپ سب کی آمد ہی اس محفل کی اصل رونق ہے۔ آپ ہماری بہن کے بھائی ہیں۔ سمجھیے ہمارے بھی اپنے ہی بھائی ہیں۔ خوش رہیں۔ سلامت رہیں۔ اور اس محفل کو رونق بخشتے رہیں۔

اس خط کے ساتھ ہی ہماری اس ماہ تک کی محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔ انشاءاللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔

اجازت سے قبل اپنے تازہ ترین نظم آپ کی بصارتوں کی نذر۔

کراچی

سمندر کے کنارے یہ بسا ہے
شہر میرا یہ پانی کے ہے نیچے
مجھے مچھلی کے جیسے یہ دکھے ہے
یہ اک جادو کی نگری کے ہے جیسا
طلسمی اک یہ کشتی نوح کے جیسا
ہزاروں خون کی بُلیاں بھی دے کر
نئے دن پر یہ اگتا ہے ہرا سا
جزیرہ ہے یہ یا یہ آب جو ہے
ہر اک پاور کو بس اس کا نشہ ہے
ہر اک پاور کو یہ پیارا بڑا ہے
سمندر اوک میں بھر کر ذرا سا
شہر یہ روز پی جاتا ہے سورج
سمندر روز اس کو سجدہ کرتا
فلک پر لال چادر تانتا ہے
سڑک پہ تارے اس کی رات دیکھو
انرجی اس شہر میں گھومتی ہے
یہاں پر خواب اور آنکھیں نہیں ہیں
جو جی پائے یہاں وہ ہے سکندر
یہ نگری سامری کی سلطنت سی
یہ پل پل نت نئے منظر بدلتی
یہ رنگوں کو نئے مفہوم دیتی
یہ نگری تو کبھی سوتی نہیں ہے
کوئی بستی بھی ایسی تو نہیں ہے
بنا کر یہ جزیرہ تو خدا بھی
مجھے کیوں ایسا لگتا ہے کہ اک پل
ہوا ہوگا پریشاں بھی ذرا سا

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

لائف بوائے..... بالوں کے ہر مسئلے کا اصل حل

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

''ہیلو گرلز!'' مس فرناز نے آتے ہی تمام لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ ''وائے آر یو سیڈ گرلز!'' اپنا بیگ ٹیبل پر رکھ کر ایک طائرانہ نظر سب لڑکیوں پر ڈالی۔ کسی نے بھی چہرے پر مسکراہٹ کے پھول نہ کھلائے تو فرناز نے معاملے کی سنجیدگی محسوس کی۔

''ارے بابا کیا بات ہوگئی جو آج سب کے چہرے اس طرح مرجھائے ہوئے ہیں۔ پلیز بتاؤ بھئی! میں اس طرح تم سب کو نہیں دیکھ سکتی۔'' فرناز کرسی سے اُٹھ کر لڑکیوں کے ساتھ ڈیسک پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''باجی وہ..... سلمٰی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''ارے بتاؤ نا.....''

''وہ نائلہ کی امی نے اسے.....'' وہ پھر جھجکی۔

''نائلہ! ٹینڈ اپ..... تم بتاؤ کیا بات ہے؟''

''باجی! امی نے میرے بال کٹوا دیے۔'' نائلہ نے ململ کا دوپٹہ اُتارا تو نہ چاہتے ہوئے بھی فرناز کا قہقہہ بلند ہوا اور پھر تھوڑی سی دیر کے بعد سب لڑکیاں بھی ہنس دی تھیں۔ کچھ دیر پہلے جہاں سوگ کا سا سماں تھا وہاں سب قہقہے لگا رہے تھے۔

''اچھا اب سب سیریس ہو جائیں۔'' فرناز کے کہنے پر سب سیریس ہوگئیں۔

''نائلہ! جانو یہ بتاؤ کہ تمہاری امی نے یہ سب کیوں کیا۔'' فرناز نے نائلہ سے وجہ پوچھنا چاہی۔

''باجی! امی کہتی ہیں کہ بال تو تیرے بڑھتے نہیں ہیں اور جو ہیں ان میں روز روز کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ جڑ سے ہی نکال دیا انہوں نے باجی اور.....'' پھر سے نائلہ کی آنکھوں میں نمی بڑھنے لگی تھی۔

''پلیز..... چیئر اَپ نائلہ! بچے میں ابھی تو کچھ نہیں کر سکتی مگر انشاء اللہ جلد تمہارے اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لوں گی۔ آج تو ہم سب کلاتھ بلاکنگ سیکھیں گے۔'' فرناز لڑکیوں کو بلاک پر مختلف نمونے بنا کر کٹنگ سکھانے لگی۔

☆.....☆.....☆

یہ گورنمنٹ کا ایک ووکیشنل سینٹر تھا۔ متوسط طبقے کی لڑکیاں یہاں ہنر سیکھنے آتی تھیں۔ نائلہ اپنے بالوں کی وجہ سے ہمیشہ ہی پریشان رہتی تھی۔ فرناز نے کبھی اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا۔ مگر آج جب نائلہ کا

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem

یہ حال دیکھا تو وہ اندر سے لرز کر رہ گئی ایک بچی کا حسن اُس کے بالوں میں ہی تو پوشیدہ ہوتا ہے۔ بھلا نائلہ کا اس سب میں کیا قصور تھا۔

فرناز شاہ گھر آ کر بھی بھی مستقل نائلہ ہی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

''ممی میں شام کو دادو کے گھر یہ والی فراک پہن کر جاؤں۔'' فرناز کی بیٹی ارشماز نے اپنے گولڈن بال لہراتے ہوئے کہا تو نائلہ کا سر اُس کے سامنے آ گیا۔

اُس کے دماغ نے اس پر کڑا وار کیا۔

''پہلے کیوں نہیں سوچا تھا کہ مسئلے کا حل تو مٹھی میں لیے گھوم رہی ہو۔'' اُسے دماغ کے دلیل پر پیار آ گیا۔

''سوری!'' اُس نے اپنے دماغ کو بہلایا۔

''تو پھر جاؤ اور بچی کا مسئلہ حل کر دو۔'' دماغ نے اُکسایا اور وہ مسکرا دی۔ اُسے بہت پہلے کی ایک یاد نے ستایا۔ جب وہ خود بالوں کے اِن مسائل میں گھری تھی۔ اچانک ہی ذہن کے منظر بدلے اور وہ روشن دن طلوع ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

مسلسل ہچکولے کھاتی بس جب ذرا ہموار سڑک پر آئی تو خشوع و خضوع سے آنکھیں بند کیے قرآنی آیات کا ورد کرتی فرناز نے بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اگلا ہی پل اسے شرمندگی کے اتھاہ سمندر میں ڈبو گیا۔ برابر والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی جو پچھلے چالیس منٹ سے اس کی ہم سفر تھی' اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''اونہہ! اتنی دیر سے تو اسٹیچو بنی بیٹھی تھی۔ مجال ہے جو ایک منٹ کے لیے بھی لفٹ کروائی ہو۔ اب ذرا سی میری کمزوری ہاتھ لگ گئی تو محترمہ دل کھول کر مسکرا رہی ہیں۔'' اُس نے جل کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ دل تو اس کا یوں بھی بہت کُڑھا ہوا تھا۔ رمیز بھائی کی عدم دستیابی' چھ ماہ پہلے کزن سے رشتہ جوڑنے کے بعد وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے لیے گوہر نایاب ہوتا جا رہا تھا۔ آج چوتھا دن تھا اسے یہ یاد دہانی کرواتے ہوئے کہ اریبہ کے گھر جانا ہے لیکن وہ آج بھی پچھلے تین دنوں کی طرح دستیاب نہیں تھا۔ دوسری طرف اریبہ تھی جو کسی طرح صحت یاب ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہر دفعہ فون کرنے پر یہی پتا چلتا۔ ''ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ بخار ہے' کھانسی بڑھ گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔'' اریبہ سے اس کی دو مہینے اور چند دن پر محیط دوستی کی مدت تو یقیناً مختصر تھی لیکن گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ اس کی ایک ہفتے کی مسلسل غیر حاضری نے فرناز کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

اریبہ اُس کے لیے اس لیے بھی اہم تھی کیونکہ اس کے تار جیسے بالوں پر اریبہ کی جانب سے دیا گیا ایک شیمپو کمال دکھا گیا تھا۔ اریبہ نے شیمپو کا نام صیغۂ راز رکھا تھا۔ جس دن اس راز سے پردہ اٹھنا تھا اُس دن سے اریبہ بیگم غائب تھیں۔

راستے میں کئی بار اس نے دل ہی دل میں جہاں اپنی کزن کو اپنا بھائی لے اُڑنے پر کوسا تھا' وہیں اریبہ کے حوصلے کی بھی داد دی تھی جو روزانہ پچاس منٹ کا راستہ' اس بے ہودہ سواری میں طے کر کے انسٹی ٹیوٹ پہنچتی تھی اور اس پر ہشاش بشاش بھی یوں رہتی تھی جیسے اس کے گھر کی دیوار انسٹی ٹیوٹ کی دیوار سے ملی ہو۔

''او باجی! نور منزل کا اسٹاپ آ گیا' اترنا نہیں ہے کیا تم کو.....'' کنڈیکٹر کی تیز آواز اسے خیالات کی دنیا سے کھینچ لائی۔ گود میں دھرے اپنے بیگ کو کاندھے پر لٹکاتی وہ سیٹ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ہم سفر لڑکی بھی شاید اسی اسٹاپ پر اتری تھی کیونکہ اس کی کالی چادر کا پلو ابھی ابھی اس کی نظروں کے سامنے سے لہراتا بس کے کھلے دروازے سے غائب ہوا تھا۔

''شاوا' جلدی کرو باجی جلدی اُترو۔'' کنڈیکٹر کے جھنجلانے پر اس نے بوکھلا کر بس سے تقریباً چھلانگ ہی لگا دی تھی لیکن وہاں کی زمین اور خود اس کے پیروں میں موجود ہائی ہیل کی نازک سی سینڈل دونوں ہی اس کرتب کے لیے سخت ناموزوں

نہیں۔ وہ تو بھلا ہوا کہ چند قدم پر موجود اس کی بدتمیز قوم نے لپک کر اسے تھام لیا' ورنہ یقیناً وہ سڑک پر ہی چاروں شانے چت گری ہوتی۔

''لیا ہو گیا ہے انعم! جلدی کرو' لگتا ہے بارش شروع ہونے والی ہے۔'' کمبھیر خوبصورت آواز پر اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو خود سے چند قدم کے فاصلے پر لڑکی سے ملتے جلتے نقوش والا ایک لڑکا بھی نظر آیا۔ وہ دونوں یقیناً بہن بھائی تھے۔ جتنی لڑکی کے اندر نزاکت دکھائی دیتی تھی اتنی ہی لڑکے کے اندر وجاہت موجود تھی۔

''آ رہی ہوں بھائی!'' لڑکی اپنے بھائی کی پکار کا جواب دیتے ہوئے اس کی طرف بڑھی یکدم اُسے ہوش آیا۔ ''ایکسکیوزمی' کیا آپ اس ایڈریس کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟'' اپنے بیگ کی زپ کھول کر جلدی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا باہر کھینچا۔

یہ علاقہ اس کے لیے بالکل نیا تھا' چنانچہ کسی نہ کسی سے تو ایڈریس پوچھنا ہی تھا پھر بہتر تھا کہ اس بداخلاق لڑکی سے ہی پوچھ لیا ہوتا جس کے بارے میں اس کی رائے ابھی ابھی ہی کچھ بہتر ہوئی تھی۔

''ارے یہ تو میرے بڑے ابا کے گھر کا ایڈریس ہے' بالکل ہمارے برابر میں ہی رہتے ہیں۔ ایسا کریں آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں۔'' پہلی بار لڑکی نے ڈھنگ سے اس سے کوئی بات کی تھی۔

کسی بہتر گائیڈ کے مل جانے پر جہاں اس نے دل میں خوشی کی لہر دوڑتی محسوس کی' وہیں بے بسی سے اپنے دائیں پیر کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی نازک سی سینڈل اسے بیچ راستے میں داغ مفارقت دے چکی تھی۔ پیر پر دو تین جگہ خراشیں بھی آئی تھیں جن سے معمولی سا خون رس رہا تھا۔

لڑکی جسے انعم کہہ کر پکارا گیا تھا' اب خود بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں اس کی بے وفا سینڈل اور مجروح پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بھائی! میرے خیال میں یہاں سے رکشہ لے کر اندر چلتے ہیں۔''

''بھائی! جو دیکھنے میں بہن صاحبہ سے بھی کئی گنا سنجیدہ نظر آتے تھے' خاموشی سے ایک طرف کھڑے رکشے کی طرف بڑھ گئے۔

رکشہ پانچ منٹ بعد ہی ایک سبز رنگ کے دروازے کے سامنے جا رُکا۔

''انعم صاحبہ'' کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی رکشہ سے نیچے اتر آئی۔

''یہ رہا اریبہ باجی کا گھر' آپ اندر چلی جائیں۔ دائیں طرف پہلا کمرہ اُن ہی کا ہے۔'' اُسے رہنمائی کا شرف بخشنے کے بعد وہ چھپاک سے برابر والے گھر میں داخل ہو گئی۔

جائزہ لینے کو تو ابھی یہاں بہت زیادہ ورائٹی تھی لیکن اب کی بار اس کی نظروں نے جس شے کو فوکس کیا وہ ''بھائی محترم'' کی آنکھیں تھیں جو بہت واضح طور پر اسے اندر جانے کا حکم دے رہی تھیں۔ ان آنکھوں کے حکم سے خائف ہو کر وہ جلدی سے اپنی ٹوٹی سینڈل کو گھسیٹتی بنا دستک دیے کھلے سبز دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

گلی کے مقابلے میں گھر کا ماحول بڑا پُرسکون تھا۔ صاف ستھرے صحن میں ایک طرف بنی کیاری میں موتیا' سدا بہار اور لیموں کے پودے جھوم رہے تھے۔ دائیں طرف کی دیوار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دروازے تھے جو یقیناً کسی کمرے میں ہی کھلتے تھے۔ دوسرے دروازے سے تھوڑا آگے ایک گول زینہ بنا ہوا تھا جس کی گولائی کے ساتھ ساتھ منی پلانٹ کی خوبصورت بیل گھوم رہی تھی۔ بائیں جانب لائن سے بنے چار دروازے یقیناً کچن' اسٹور' غسل خانے اور ٹوائلٹ کے تھے۔ اس کے اندازے کی تصدیق باہر سے بھی ہو سکتی تھی کیونکہ ایک دروازے پر موٹا سا تالا پڑا تھا۔ دوسرے سے دھواں اور خوشبوئیں ایک ساتھ برآمد ہو رہی تھیں۔ تیسرے اور چوتھے دروازے کی درمیانی دیوار کے ساتھ واش بیسن موجود تھا جس کے اوپر ایک چمکتا' صاف شفاف آئینہ لگا تھا۔

''ارے فرناز! تم کب آئیں۔'' کچن کے دروازے سے نکلتی اریبہ نے صحن کے بیچوں بیچ کھڑی فرناز کو دیکھ کر پہلے حیرت سے ایک چیخ ماری اور

دوسرے ہی لمحے مسرت سے چمکتے چہرے کے ساتھ وہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔

وہ اس کی بے ساختہ خوشی کو انجوائے کرتی' اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جو پہلی نظر میں ہی بہت زیادہ کمزور اور مضمحل نظر آرہی تھی۔

''چلو' اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ اسے ساتھ لیے ایک کمرے کی طرف بڑھنے لگی پھر یکدم ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

''تم آئی کس کے ساتھ ہو باہر کسی کو کھڑا تو نہیں کر رکھا؟''

اس کے سوال پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ نیچے جھک کر اپنی سینڈل کے اسٹریپ کھولنے لگی۔ اب مزید اس تکلیف کو سہنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

''کیا بس سے آئی ہو؟'' اس کی حالت زار نے اریبہ پر جیسے کوئی انکشاف کیا تھا اور اب وہ آنکھیں پھاڑے نئے سرے سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہمیشہ بے شکن لباس پہننے والی کے کپڑوں پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ دوپٹہ کی جگہ استعمال کیا جانے والا اسکارف بمشکل گلے میں گرہ باندھ کر گرنے سے روکا گیا تھا۔ اسٹیپ کٹنگ میں سیٹ کیے گئے بال جو ہمیشہ تاروں والا ہُو بنے رہتے تھے۔ اس وقت اس کی پریشان حالی کا احوال چیخ چیخ کر سنا رہے تھے۔

''تم..... ایشاع یتیم ہو؟'' حیرانی کے بعد اس پر ہنسی کا دورہ پڑا تھا اور وہ منہ بناتی فرناز کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے لے گئی تھی۔

اپنا حال دیکھ کر تو وہ بھی چند لمحوں کے لیے بھونچکا رہ گئی۔ ابتر حلیے والی یہ لڑکی فرناز ہی تھی' اُسے خود بھی یقین نہیں آیا لیکن اب آئینے کو تو جھٹلانے سے رہی' سو اپنی خفت مٹانے کے لیے اسی پر پل پڑی۔

''سارا کیا دھرا تمہارا ہے نہ تم اتنے دن اپنی شکل لے کر غائب ہوتیں' نہ مجھے اس ایڈونچر سے گزرنا پڑتا۔ یہاں گھر میں آرام سے مٹرگشت کرتی پھر رہی ہو اور انسٹی ٹیوٹ آنے کے لیے بیماری کے بہانے بنائے جا رہے ہیں۔''

''ارے بابا اتنا غصہ' لگتا ہے بہت ہی پریشان ہو کر آئی ہو۔'' اریبہ ہنسی۔

''پریشان تو ہونا ہی تھا' عادت جو نہیں ہے مجھے بسوں میں بیٹھنے کی۔ اوپر سے بارش نے سڑکوں کی حالت تباہ کر ڈالی ہے۔ قائد آباد کے پل کے بعد تو مانو ایسا لگ رہا تھا' ناردن ایریاز کے راستوں پر سفر کر رہے ہوں۔ جھٹکے جو لگ رہے تھے سو لگ رہے تھے بعض جگہ تو یوں لگتا تھا جیسے بس الٹ ہی جائے گی۔ یقین کرو میں نے تو جتنی دعائیں اور سورتیں یاد تھیں' سب پڑھ ڈالیں۔'' تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھی وہ ہاتھوں کی مدد سے اپنے پیروں کی انگلیاں دبا رہی تھی۔

''گاڑی کیا ہوئی تمہاری جو بس میں آئی ہو۔''

اس کی حالت زار پر ہنسی ضبط کرتی وہ بظاہر بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''گاڑی کو کیا ہونا ہے' کھڑی ہے گھر میں لیکن ماما کا تمہیں بتایا تھا نا میں نے..... لمبے روٹ پر اکیلے گاڑی لے جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ رمیز بھیا سے کہہ کہہ کر تھک گئی لیکن انہیں بھی آج کل اپنی نئی نویلی منگیتر سے فرصت نہیں ہے۔ مجبوراً بس سے آنا پڑا۔'' اپنی خوبصورت سی ناک کو ایک ادا سے چڑھاتی وہ تفصیل سنا رہی تھی۔

''تو بس سے آنے کی اجازت مل گئی تمہیں؟''

اب کے اریبہ کے لہجے میں حیرانی در آئی تھی۔

وہ ہنسنے لگی۔ ''بدھو! اجازت لے کر آیا ہی کون ہے۔ میں تو اس وقت انسٹی ٹیوٹ میں بیٹھی کلاس لے رہی ہوں۔ شام میں سات بجے تک لوٹ جاؤں گی۔ موسم اچھا تھا اس لیے گاڑی گھر چھوڑنے کا بہانہ مل گیا۔ اگر گاڑی میں آتی تو بالکل بھی تمہارے گھر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ بالکل ان نون راستہ ہے میرے لیے۔ اب بھی پورا راستہ کنڈیکٹر سے کہتی آئی ہوں کہ نور منزل کے اسٹاپ پر اُتار دینا۔''

یوں جھوٹ گھڑ کے اس کا اپنے گھر آنا اریبہ کو اچھا تو بالکل نہ لگا لیکن اس کے خلوص کو دیکھ کر چپ

ہو رہی۔

''اور ہاں اریبہ' تمہاری ایک سڑیل سی کزن بھی ہے نہ تمہارے ساتھ آئی ہے۔ سچ! سخت بور کیا اس نے مجھے' پورے راستے گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی رہی' اتنی دفعہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھا لیکن مجال ہے جو اس نے ذرا سی بات کی ہو۔ اتنا ہے کہ اس کی وجہ سے تمہارا گھر ڈھونڈنے کے لیے پریشان نہیں ہونا پڑا مجھے۔ یہیں تمہارے پڑوس میں ہی تو رہتی ہے۔ کیا نام تھا اس کا۔'' کنپٹی کو انگلی کی مدد سے دباتی وہ نام یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اریبہ بول اٹھی۔

''انعم..... انعم نام ہے اس کا' لیکن وہ تو بہت با اخلاق لڑکی ہے' تم نے اسے سڑیل کیسے سمجھ لیا۔''

''اونہہ! جو لڑکی پورے پچاس منٹ کے راستے میں ایک بات تک نہ کرے' اسے سڑیل نہیں کہوں تو اور کیا کہوں۔''

اس کے منہ بنانے پر اریبہ ہنس دی پھر وضاحت کرنے لگی۔

''اصل میں فہد بہت ناراض ہوتا ہے بس میں خواتین کے ساتھ بات چیت کرنے اور گلی میں کھڑے ہونے پر' اس لیے انعم اس کی موجودگی میں بہت زیادہ احتیاط کرتی ہے۔ ابھی دیکھنا تھوڑی دیر میں خود ہی آجائے گی تم سے ملنے' پھر تمہاری ساری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔''

''چلو دیکھیں گے۔'' لاپروائی سے کندھے اچکاتی وہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو گئی۔

''ارے تم میری مزاج پرسی کرنے آئی ہو۔ خود بیڈ پر قبضہ کر لیا ہے اور میں بے چاری مریض کرسی پر بیٹھی ہوں۔'' اریبہ نے اسے چھیڑتے دیکھ کر ٹوکا۔

''فی الحال تو میری حالت تم سے زیادہ خراب ہو رہی ہے اور یہ سوچ کر تو بالکل ہی بے حال ہو رہی ہوں کہ ان ہی مراحل سے گزر کر واپس بھی جانا ہے۔'' اب کے اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

اس سے پہلے کہ اریبہ اسے تسلی دیتی دروازے پر ہلکی سی ناک ہوئی۔

''آ جاؤ انعم!'' اس نے آواز لگائی دوسرے ہی لمحے وہ لوازمات سے بھری ٹرے اٹھائے شرمندہ شرمندہ سی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

فرناز نے دلچسپی سے اس کی جانب دیکھا۔ بڑی سی کالی چادر کی جگہ کاٹن کے میچنگ دوپٹے نے لے لی تھی۔ گلابی رنگ کا عکس اس کے چہرے پر پڑنے سے خوبصورتی اور دلکشی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' ٹرے ایک چھوٹی سی میز پر رکھنے کے ساتھ بڑے ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! بھئی تم تو بہت ہی کیوٹ ہو۔'' فرناز نے بے اختیار ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ اپنی تعریف سن کر ایک پل کے لیے تو وہ محجوب سی ہوئی پھر سنبھل کر وضاحت کرنے لگی۔

''وہ اصل میں بھائی کو پسند نہیں ہے اس لیے میں نے راستے میں آپ سے بات نہیں کی ورنہ جب آپ نے ایڈریس پوچھا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ آپ اریبہ اپیا کی دوست فرناز ہیں۔ سچ اریبہ اپیا سے آپ کی باتیں سن سن کر اتنا اشتیاق ہو گیا تھا' آپ سے ملنے کا کہ اگر بھائی کا ڈر نہیں ہوتا تو رکشے میں تو ضرور آپ سے بات کرتی۔''

''اور اریبہ اپیا! آپ سے تو میں سخت ناراض ہوں' آج ہی تو آپ کا بخار اُترا ہے اور آپ نے کچن میں انٹری دے دی۔ انتظار نہیں کر سکتی تھیں تھوڑی دیر میرا' کون سا ابھی رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا جو آپ نے اتنی جلدی دکھائی۔'' وہ یقیناً کچن میں اس کی کارگزاری دیکھ کر آرہی تھی اس لیے خفا خفا سی اس سے اُلجھ رہی تھی۔

''بھئی! اب مہمان کے سامنے تو ناراض مت ہو' ویسے بھی میں نے کوئی زیادہ کام نہیں کیا ہے' صرف سالن پکایا ہے اور آٹا گوندھا ہے۔ روٹیاں تم ہی کو پکانا ہوں گی۔ چلو' تم اب جلدی سے یہ لوازمات سرو کرو ورنہ سب کچھ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' اریبہ نے پیار سے اسے بہلایا۔

''ویسے تم لوگ آ کہاں سے رہے تھے۔'' گرم گرم سموسے کو ہاتھ سے توڑ کر منہ میں رکھتی فرناز نے انعم کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''انعم کی خالہ بہت بیمار ہیں' انجائنا کا اٹیک ہوا ہے انہیں دو دن پہلے..... وہیں نیپا پر ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ یہ لوگ ان ہی کو دیکھنے گئے تھے۔ میری امی وہیں ہاسپٹل میں ان کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں۔ اِدھر میں بیمار ہوں تو بے چاری انعم پر بوجھ پڑ گیا ہے۔ یہاں کا بھی کرتی ہے' اپنے گھر کا بھی بلکہ ہاسپٹل میں امی اور اپنے خالو کے لیے کھانا بھجوانا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ جواب انعم کے بجائے اریبہ نے تفصیل سے دیا تھا۔

فرناز اتنی ساری پریشانیوں کا سن کر افسوس سے سر ہلانے لگی۔

مگر اب اُسے اصل بات کی طرف آنا تھا۔ سو فوراً بول اٹھی۔

''اب جلدی سے بتادو کیا کروں اِن بالوں کا۔''

فرناز نے اپنے بے جان بالوں کو چھو کر پوچھا۔

''کرنا کیا ہے۔ تم اتنی دور آ گئیں میری محبت میں تو کیا میں تم کو ایسے ہی جانے دوں گی۔ ویٹ ڈیئر! میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر اریبہ زرا کی زرا باہر گئی اور ایک سادے کاغذ سے ریپر کیا ہوا شیمپو اٹھا لائی۔

''لو اب اپنا میجک خود ہی دیکھ لو۔'' اریبہ نے اُسے بوتل تھماتے ہوئے کہا۔ فرناز نے بوتل جھپٹی اور بے تابی سے ریپر اتارنے لگی۔

''یہ..... یہ تو لائف بوائے شیمپو ہے۔'' وہ فرطِ حیرت سے پلکیں جھپکنا بھول گئی۔

''جی ہاں! میڈم یہی ہے وہ شیمپو جس نے تمہارے بالوں پر جادو کر دیا تھا۔''

''میں یقین نہیں کر سکتی اریبہ کہ اتنا کم قیمت میں اتنا اعلیٰ شیمپو ہمارے پاس ہے اور ہم کتنے ناقدرے ہیں جو اصل اور نقل کی تمیز بھول بیٹھے ہیں۔ سچ ہے ہم واقعی بہت ناقدرے ہیں۔ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتے ہیں۔''

''بس کرو فری! اب اسے استعمال کرو اور دیکھو اس کا کرشمہ۔''

باتوں باتوں میں شام ہوئی اور پھر نہ نہ کرتے بھی اریبہ نے اُسے حلق تک ٹھنسا دیا اور پھر وہ گھر آ گئی۔

☆.....☆.....☆

وقت سرکا اُس کے بال جو بالکل بے رونق اور بے جان تھے نیو لائف بوائے شیمپو کے استعمال سے لازوال ہو گئے۔ اُس کے ہاتھ تو پارس آ گیا تھا۔ وہ ہر کسی کو اس پارس کا پتا دیتی اور پھر فرناز کی شادی ہو گئی۔ اُس کی گوناگوں خوبیوں کے باوجود بھی اُس کے بال ہی حسنِ بے مثال کہلائے۔ آج بڑے دنوں بعد اُسے یاد آیا کہ نائلہ کے بالوں کے مسائل کا حل بھی صرف لائف بوائے شیمپو ہی تو تھا۔ وہ مسکرائی اور اُس نے یادوں کے البم کو سنہری بوسہ دے کر آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆.....☆

''ہیلو گرلز!'' فرناز کلاس میں آتے ہی چہکی۔'' آج میں نائلہ کے لیے ایک جادو لے کر آئی ہوں۔ نائلہ پلیز کم آن!'' اُس نے نائلہ کو بلایا اور نیا لائف بوائے شیمپو اُسے تھما دیا۔

''یہ لو تمہارے تمام بالوں کے مسائل کا حل..... ملک پروٹین اور بادام کی طاقت لیے نیا لائف بوائے شیمپو۔ اتنی ساری خوبیوں والا اور دام میں یہ زرا سا۔'' اُس نے چٹکی بنا کر نائلہ کو تھام لیا۔

اب تمہیں کوئی بھی بالوں کو کٹوانے کا نہ کہے گا اور نہ ہی ان بالوں کو کٹنے دے گا۔

☆.....☆.....☆

(چند ماہ بعد)

''اور پھر نائلہ نے کیا استعمال نیا لائف بوائے شیمپو اور بن گئے اُس کے بال چیمپئن' اب وہ ہے ہر لڑکی کی آئیڈیل سہیلی' خوبصورت لمبے گھنے بالوں والی۔'' فرناز کلاس میں نائلہ کے لہراتے بالوں پر حظ اٹھا رہی تھی۔ ساری کلاس تالیاں بجا کر نائلہ اور اُس کے نئے لائف بوائے شیمپو کو داد دے رہی تھیں۔

سچ ہے..... بالوں کی خوبصورتی اور ہر مسئلے کا حل ہے ہماری اپنی جیب میں..... اور جیب میں فٹ ہے ہمارا نیا لائف بوائے شیمپو..... بادام کی طاقت اور دودھ کی پروٹین سے بنا' نیا لائف بوائے شیمپو.....

☆☆.....☆☆

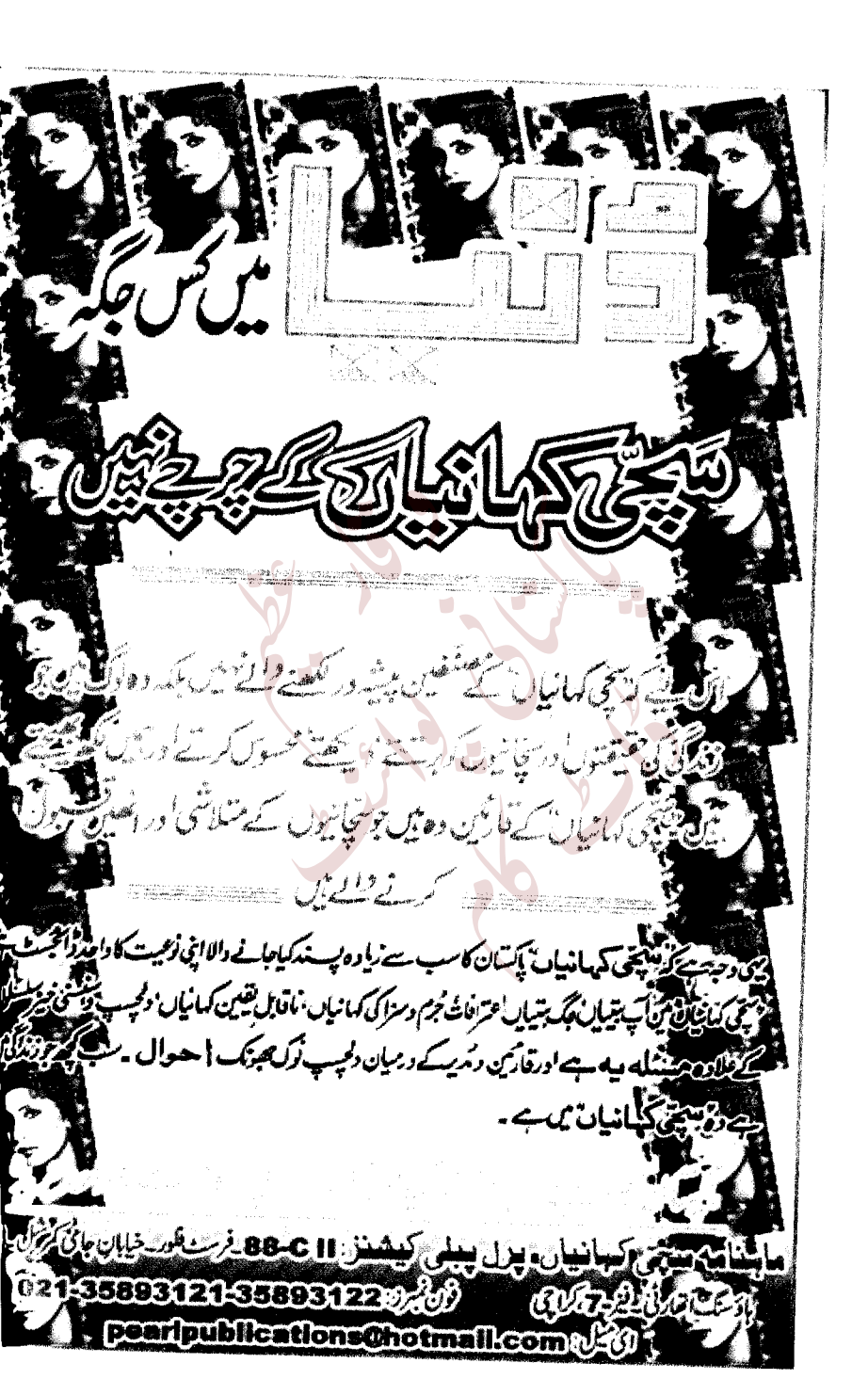
میں کس جگہ
سچی کہانیاں کے جریدے نہیں
اس لیے کہ سچی کہانیاں کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو
زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے دیکھتے محسوس کرتے اور ہیں
سچی کہانیاں کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول
کرنے والے ہیں
یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے
سچی کہانیاں میں آپ بیتیاں جگ بیتیاں اعترافات جرم و سزا کی کہانیاں ناقابل یقین کہانیاں دلچسپ و دلنشیں خبر سلسلہ
کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی کا
ہے وہ سچی کہانیاں میں ہے۔
ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز 88-C II فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل
021-35893121-35893122 فون نمبرز:
پاکستان اسٹاک ایکسچینج فیز 7 کراچی
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

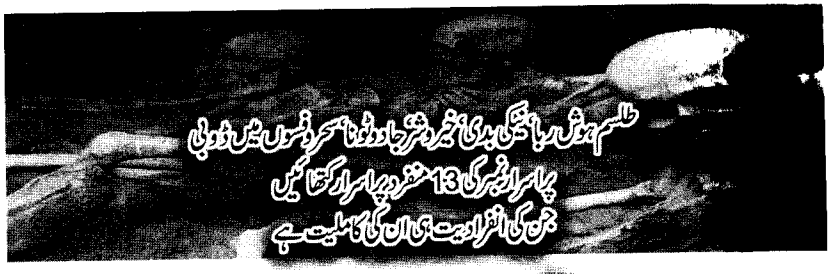

گھاسی رام کا بھوت

محمد سلیم اختر

ایک ظالم چوہدری کے ظلم کا شاخسانہ اک بیٹے کی خوف بیتی

ماں باپ نے اس کا نام تو جہانگیر خاں رکھا تھا مگر وہ جنگی خان کہلانے لگا تھا۔ وہ تیس سال کا تنومند جوان تھا۔ وہ بہت بڑا اور خوشحال زمیندار تھا، اس کی زمینوں کا کوئی حساب کتاب ہی نہ تھا، اس کی ملکیت میں بارہ گاؤں تھے۔ اس کی ایسی کامیابی اور عروج کا راز اس کا بہادر ہونا تھا۔ بہادری اور شجاعت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ فوج میں بطور سپاہی بھرتی ہوا تھا۔ جنگ عظیم دوم میں وہ کئی سال فرانس میں رہا تھا اور اپنے کارناموں کی وجہ

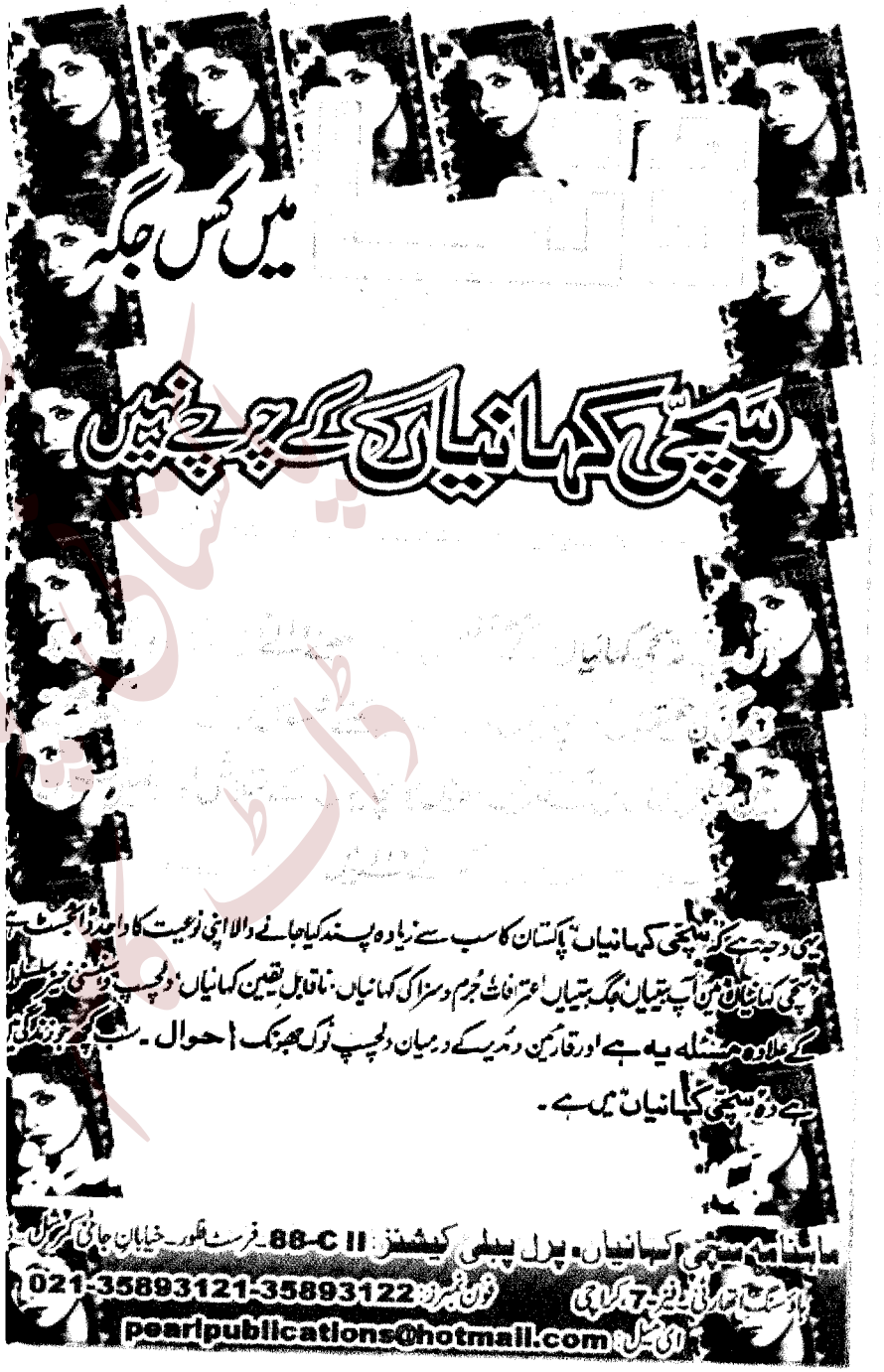

سے صوبیدار بن گیا تھا..... جنگ ختم ہوئی تو وہ ہندوستان واپس آیا اور اس نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی تو گورنمنٹ نے اس کی بہادری اور مردانگی کے صلے میں اسے کئی مربع زمین عطا کی جس سے اس کی جاگیر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

جنگی خان تاتاری نسل سے تھا۔ اس کے لمبے قد، کسرتی بدن اور سرخ وسفید چہرے سے خونخواری ٹپکتی تھی مگر بہادری اور جنگجو ہونے کے باوجود وہ ایک سنگِ دل اور بے رحم انسان تھا۔ کمزور اور بے بس لوگوں پر تو وہ بے پناہ ظلم ڈھاتا تھا۔ فوجی زندگی نے اس میں ایک قسم کی وحشیانہ عادت پیدا کردی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس نے خدا سے بھی ڈرنا چھوڑ دیا تھا..... یہ نہیں کہ اس کا چال چلن خراب تھا، وہ بےمذہبی تھا۔ دینی احکام کی پابندی کرتا تھا۔ وہ اپنے پروردگار کو اس طرح خوش اور راضی کرتا تھا جیسے وہ اپنے فرائض ادا کر کے اپنے کمانڈر کو خوش کیا کرتا تھا۔ اس کی زبان اکثر اللہ کے پاک نام کا ورد کرتی تھی لیکن خدا کا خوف اس کے دل میں قطعی نہ تھا۔ وہ محض اس وجہ سے نماز پڑھتا، روزے رکھتا اور زکوٰۃ دیتا کہ اور لوگ بھی تو نماز پڑھتے، روزے رکھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ وہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا اور اپنی اس برتری کا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ بدزبان بھی بڑھ کر تھا اور اس کا اخلاق نہایت ہی گھٹیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اس کی توقیر کے ساتھ ساتھ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن جنگی خان کو ان کی محبت یا نفرت کی بالکل پروا نہ تھی، وہ تنہائی پسند تھا، اس تنہائی نے اسے اور بھی تندخو بنا دیا تھا..... دنیا والوں کو معلوم تھا کہ اس نے اتنی جائیداد کس طرح بنائی ہے، اس نے کئی غریبوں اور کمزوروں کا حق مارا تھا اور زبردستی زمین پر قبضہ کرلیا تھا، لیکن کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جنگی خان کے خلاف زبان کھولنا موت کو دعوت دینا ہے۔

❖ ❖ ❖

جنگی خان کو ان دو انسانوں سے محبت تھی، یا انسانی دوستی تھی۔ ایک اس کی بیوی تھی ذکیہ خانم اور دوسرا اس کا سالا امیر علی۔ امیر علی ایک خاموش اور مذہبی سا انسان تھا جس کو جنگی خان نہایت ہی حقیر سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس اس کی بیوی ذکیہ خانم بڑے رعب دبدبے والی اور پائے کی عورت تھی کہ جنگی خاں بھی اس سے نظریں چراتا تھا۔ ذکیہ خانم ایک خدا ترس، ہمدرد اور لوگوں کے کام آنے والی خاتون تھی۔ نماز روزے کی پابندی کرتی تھی۔ اس کی ہمدردی اور شیریں زبانی نے گاؤں والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اس کو کسی قسم کی تعلیم و تربیت بھی نہیں ملی تھی لیکن نیکی اس کی فطرت اور محبت اس کی خصلت تھی۔ اس کی سخاوت اور فیاضی کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی سائل اس کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ وہ بیواؤں کی غم گسار اور یتیموں کی سرپرست تھی۔ قدرت نے اسے محبت کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ نفرت کرنا تو اس کی خصلت میں تھا ہی نہیں مگر اسے اپنے شوہر کے اطوار سے نفرت ضرور تھی۔ اس نے ایک عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے کردار اور اطوار سے جنگی خان کو راہ راست پر لا کر دم لے گی۔ سنگ دلی اور بے رحمی یہ دو باتیں اگر جنگی خان میں نہ ہوتیں تو وہ علاقے کا سب سے پسندیدہ قابل احترام شخص ہوتا۔

ان کی شادی ہوئے پانچ سال گزر گئے تھے لیکن جنگی خان کی فطرت نہ بدلی تھی۔ قدرت نے بیوی کے روپ میں ایک شمع ہدایت اس کے گھر میں روشنی کردی تھی لیکن وہ اس کے نور سے فیض یاب نہ ہوا۔ اس کی قسمت میں کچھ اور ہی تو لکھا ہوا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پا رہا تھا۔

❖ ❖ ❖

اپریل کا مہینہ تھا۔ جنگی خان گھوڑے پر سوار ہوکر کھیتوں کا معائنہ کرنے نکلا۔ اس نے اپنے ملازموں کو ایک کھیت میں ہل چلانے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ کھیت عرصہ سے بنجر پڑا تھا۔ ان دنوں جنگی خان کا مزاج کچھ بگڑا ہوا تھا کیونکہ اس کی بیوی کی فیاضی نے اسے کچھ مقروض کردیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوپائی کہ وہ ذکیہ خانم سے باز پرس کرے۔ اس کا یہ غصہ اور بخار اب کسی اور پر تو نکلنا ہی تھا۔ اس کو کسی نے بتایا تھا کہ ملازموں نے سارا دن ضائع کردیا ہے۔ انہوں نے کوئی کام نہیں کیا

اور کھیت ویسے کا ویسا پڑا ہے۔ مزدور جان بوجھ کر کام نہیں کر رہے تھے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے کیونکہ جنگی خان نے ان کو کبھی ان کو کام کا پورا معاوضہ نہیں دیا تھا اس لیے وہ کبھی پورا کام نہیں کرتے تھے۔ اس نے تین ملازم صبح کھیت کی طرف بھیجے تھے مگر ابھی تک کھیت کے ایک چوتھائی حصے پر بھی ہل نہیں چلایا گیا تھا۔ دو تو ایک ٹیلے پر بیٹھے آرام کر رہے تھے اور تیسرا کوئی لوک گیت گا رہا تھا۔ جنگی اس کے گیت سے گونج رہا تھا۔ جنگی خان ان پر بجلی بن کر گرا۔

''نمک حرامو! جب تک سارے کھیت میں ہل نہیں چلے گا میں تمہیں یہاں سے نہ جانے دوں گا، خواہ ساری رات گزر جائے۔''

مزدور فوراً کام پر لگ گئے۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کا مالک قول کا پابند ہے۔ ایک نے بیلوں کو ایڑی لگائی اور دو نے کانٹوں کی باڑ لگانی شروع کردی کیونکہ ساتھ والے کھیت میں پیاز بوئی گئی تھی۔ باڑ اس کے گرد لگانی تھی۔ انہوں نے تیزی سے کام کرنا شروع کردیا۔ جنگی خان ان کو گالیاں دیتا، برا بھلا کہتا، گھوڑے کو ایک بڑے درخت کے ساتھ باندھ کر اس ٹیلے پر جا بیٹھا۔ سورج غروب ہوگیا اور اندھیرے نے اپنا تسلط جمالیا۔ تھوڑی دیر بعد چاند طلوع ہوا اور روشنی پھیل گئی۔ لیکن جنگی خان ان سب چیزوں سے بے پروا تھا۔ اسے اپنے کام سے کام تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

اچانک بیلوں والا ملازم رک گیا۔

''بدمعاش! کیا ابھی سے تھک گیا ہے؟ چل پڑ۔ اگر ختم ہونے سے پہلے رکا تو اتنا ماروں گا کہ ساری زندگی یاد کرے گا۔'' جنگی خان غصے سے دھاڑا تھا۔

''حضور! میں تھکا تو نہیں ہوں۔ یہاں کوئی چیز ہے زمین میں ہل اٹک گیا ہے۔ شاید کسی کی قبر ہے، ہڈیوں کا ڈھانچہ بھی ہے۔'' مزدور کانپتی آواز میں بولا۔

''چل اپنا کام کر۔ دنیا میں قبرستانوں کی کمی ہے کیا جو لوگ کھیتوں میں آکر دفن ہوں گے۔ اس گدھے کو کہیں اور قبر کی جگہ ڈھونڈے۔'' جنگی خان غراتے ہوئے کہا۔

مزدور کا لرزہ بڑھتا گیا۔ جنگی خان کی دھمکی نے بھی کام نہ کیا۔ دوسرے دونوں مزدور بھی اپنے ساتھی کے پاس آگئے اور قبر کی تعظیم کے بارے میں کچھ کہنے لگے۔ لیکن جو شخص انسانی زندگی کی قدر نہ کرے وہ مردوں کی کیا عزت کرے گا۔

جنگی خان غصہ سے دیوانہ ہوگیا۔ وہ ٹیلے سے نیچے اترا اور مزدور کے پاس جا کر اسے ایک کوڑا رسید کیا اور ڈھانچے کو گھسیٹ کر ٹیلے تک لے آیا۔ اس کی بہادری نے مقناطیسی اثر کیا۔ مزدوروں کی ہمت بڑھ گئی اور وہ پھر سے کام میں لگ گئے اور جنگی خان ٹیلے پر آکر بیٹھ گیا۔

❖ ❖ ❖

وہ ایک چھوٹا سا ڈھانچہ تھا جسے زمین میں دفن ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ اس کے تمام جوڑ سلامت تھے۔ صرف ایک دو پسلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے یہ شخص سینے پر زخم لگنے کی وجہ سے مرا ہے۔ لیکن جنگی خان کو اس کی کوئی پروا ہی نہ تھی۔ بہرحال وہ اس کو دیکھتا رہا کہ آخر یہ ہے کون؟ اور اسے میرے کھیت میں کس نے دفن کیا ہوگا؟

جنگی خان کو اپنے حافظے پر فخر تھا مگر کسی کے ڈھانچے کو پہچاننا بہت مشکل ہے۔ جنگی خان اٹھا اور ایک جھٹکا دے کر کھوپڑی کو دھڑ سے الگ کردیا۔ وہ کھوپڑی کو ہاتھ میں لے کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ آنکھ کے خالی گڑھوں نے رحم کی درخواست کی۔ لیکن جنگی خان کی تیز آنکھیں اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں۔ اس نے کھوپڑی کو کئی بار چاندنی میں اچھالا اور آخر اس نے تھک کر کھوپڑی اور ڈھانچے کو ٹھوکر مار کر قریب کی جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اتنی دیر میں کام بھی ختم ہوگیا تھا۔ جنگی خان گھوڑی پر سوار ہوکر واپس گھر آگیا۔

❖ ❖ ❖

کچھ ہی دنوں بعد کی بات ہے، اس روز خوب بارش ہوئی تھی۔ شام کو آسمان کھلا اور ٹھنڈی فرحت بخش ہوا چلنے لگی۔ جنگی خان دروازے کے سامنے کرسی بچھا کر بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا سالا امیر علی آگیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے مطلب پر آگیا اور کہنے لگا۔ ''ایک بیوی عورت رضیہ بیگم جو قصبے کے باہر رہتی ہے، اسے ہیضہ

ہوگیا ہے، کیا ذکیہ خانم کو اجازت ہے کہ وہ اس کی تیمارداری کے لیے جائے؟''

''نہیں، ہرگز نہیں۔'' جنگی خان نے سختی سے کہا۔ ''یہ مرض متعدی ہے، علاوہ اس کے میں نہیں گوارا کرتا کہ میری بیوی ایک نیچ قوم کے گھر جائے۔''

''مگر وہ جائے گی ضرور۔'' امیر علی نے کہا۔

''اچھا تو پھر جانے دو۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جو جی میں آئے کرو۔'' جنگی خان بولا۔

امیر علی اٹھا اور تھوڑی دیر بعد اپنی بہن کو پالکی میں سوار کرا کے لے گیا۔ پالکی کے ہمراہ بوڑھی خادمہ اور چھ سپاہی تھے۔ جنگی خان کا حکم تھا کہ اس کی بیوی بغیر باڈی گارڈز کے کہیں نہ جائے۔

جنگی خان اٹھ کر کمرے میں آ گیا اور اپنے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ یوں ہی رات آدھی سے زیادہ بیت گئی۔ اس کی عادت تھی کہ جس کام کو بھی ہاتھ لگاتا اسے ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ نصف شب کو اسے فرصت ملی۔ وہ اٹھ کر برآمدے میں آیا اور خادمہ کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ اس کی بیوی ذکیہ خانم ابھی تک نہیں آئی تھی۔ بوڑھی خادمہ نے دسترخوان بچھایا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ کانپ رہی تھی۔

''کیوں؟ خیریت ہے۔ کیا ہوا؟'' جنگی خان نے پوچھا۔

''کچھ نہیں حضور! بیمار بڑھیا کا دم لبوں پر ہے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے بھیج دیا ہے تاکہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ میں جب اس کھیت کے پاس سے گزر رہی تھی جس میں آپ نے پیاز بیچا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص پیاز کے بہت سے پودے اکھاڑ کر ایک ٹیلے پر بیٹھا ہوا ہے۔ پیاز کو ڈنٹھل سے جھٹکا دے کر الگ کرتا جاتا ہے اور پھر اسے اچھال کر لپک لیتا ہے۔ میں نے پوچھا تو کون ہے؟ تو اس نے گنگناتی ہوئی آواز میں کچھ کہا اور میری طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ پستہ قد، سیاہ فام، سفید داڑھی والا آدمی ہے اور اس کے سینے پر لال خون کا سا نشان ہے۔ میں وہاں سے بھاگی اور گرتی پڑتی بمشکل یہاں تک پہنچی ہوں۔ حضور ہی ہمیں ایسے چوروں، بدمعاشوں سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔''

بڑھیا اپنی داستان سناتے ہوئے کئی جگہ رکی اور لڑکھڑائی لیکن جنگی خان نے اس کے آخری جملے کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ اسی دن اس کو اطلاع ملی تھی کہ بدمعاشوں کا ایک گروہ غلہ چوری کرتا ہے۔ اس سے بہتر موقع مجرم کو پکڑنے کا نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے اپنا فوجی پستول جیب میں ڈال لیا اور نیزہ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا میں گھوڑا لانے کا حکم دوں؟'' خادمہ نے دریافت کیا۔

''نہیں... جنگی خان پیادہ پاؤں سورماؤں سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ممکن ہے گھوڑے کی ٹاپوں سے خبردار ہو کر چور فرار ہو جائے۔ اس لیے میں پیدل ہی جاؤں گا۔''

اجنبی ابھی تک اپنے عجیب مشغلہ میں مصروف تھا۔ وہ پیاز کو اچھالتا تھا اور پھر لپک لیتا تھا۔ جنگی خان دبے پاؤں اس کے قریب جا پہنچا۔ چاندنی اس کی پشت پر پڑ رہی تھی۔ وہ جنگی خان کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جنگی خان اس کو غور سے دیکھ رہا تھا تاکہ اگر وہ بچ کر نکل جائے تو آئندہ شناخت کرنے میں دقت نہ ہو۔

❖ ❖ ❖

جیسا کہ خادمہ نے بیان کیا تھا کہ وہ ایک پستہ قد لمبی داڑھی والا بڈھا تھا۔ وہ ایک ملگجی دھوتی اور نیم آستین کرتا پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سوکھے ہوئے اور اس کی پسلیاں نیم آستین کرتے میں سے بھی صاف گنی جا سکتی تھیں۔

''تم کون ہو؟'' جنگی خان نے رعب دار آواز میں پوچھا۔ اجنبی آہستہ سے آواز کی جانب مڑا تھا۔

''تم اس آواز کو پہچانتے ہو؟'' کسی آواز نے جنگی خان کے کان میں کہا۔ اس چہرے کو جس پر رنج اور تکلیف کے نقوش نمایاں تھے۔ اس کی پیشانی اور گالوں پر خون کے دھبے تھے۔ اس کی سفید داڑھی پر منہ سے نکلا ہوا خون بہہ رہا تھا۔ سینے کے بائیں طرف ٹھیک دل کی جگہ خنجر کا خوفناک زخم تھا جس نے دو پسلیاں جدا کر دی تھیں اور جس میں دل کی حرکت سے خون کا چشمہ ابل رہا تھا، اس کے ہاتھوں میں ابھی تک پیاز تھی اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ جانے کی وجہ

سے صرف سفیدی دکھائی دیتی تھی۔ وہ خاموش اور ساکن تھا لیکن اس کی مسکراہٹ خوفناک تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس بھیانک منظر کی تاب نہ لا سکتا۔ جنگی خان کے دل نے گواہی دی کہ یہ اس کا کوئی جانی دشمن ہے۔ اس نے اپنا نیزہ پوری طاقت سے اس کے دل کی طرف پھینکا۔ اس کے سامنے ہی وہ ٹیلہ تھا جس پر وہ ہل چلانے کے وقت بیٹھا تھا۔ اس کے دوسری طرف پیاز کا ڈھیر لگا تھا جو اس اجنبی نے اکھاڑ پھینکی تھی۔ اس کے اس پار اس کا نیزہ تھا جو اس نے پوری طاقت سے پھینکا تھا۔ جو نصف سے زیادہ زمین میں دھنس گیا تھا۔ لیکن اجنبی کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا؟ شاید وہ محض اس کی آنکھوں کا قصور تھا۔ لیکن جنگی خان نے دیکھا تھا کہ اس کا نیزہ اجنبی کے سینے سے پار گزر گیا تھا۔ اجنبی کا غیر مادی جسم ہوا کی طرح جدا ہوا اور دھوئیں کی طرح غائب ہو گیا۔ جنگی خان ٹیلے پر چڑھا اور نیزے کو کھینچ کر دیکھنے لگا کہ اس کی تیز نوک تو خراب نہیں ہو گئی۔ وہ ابھی تک اس واقعہ سے خرفزدہ نہیں ہوا تھا مگر وہ پریشان تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے اور وہ ڈراؤنی شکل والا اجنبی کون تھا اور کہاں غائب ہو گیا؟ اس وقت چاند پر بادل کا ایک سیاہ ٹکڑا آ گیا اور چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ جنگی خان اپنے حافظے پر زور دے رہا تھا کہ یہ اجنبی کون تھا؟ اس نے اس کو ضرور کہیں دیکھا تھا۔ آخر کار اس کو یاد آ ہی گیا... ''گھاسی رام بنیا''

اس نام کے یاد آتے ہی اس پر ایک عجیب سی حیرت طاری ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ جنگی خان کو ڈر محسوس ہوا تھا اور وہ خوف سے کانپنے لگا تھا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

❖ ❖ ❖

گھاسی رام اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک نرم دل صلح جو اور نیک دل انسان تھا۔ اس لیے گاؤں کے لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ گاؤں میں اس کا کوئی بھی عزیز رشتہ دار نہ تھا۔ اس کے پاس بہت زیادہ زمین تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اتنی ساری زمین نہیں سنبھال سکتا تو اس نے سوائے دو کھیتوں کے جو بہت ہی زرخیز تھے، سب کچھ گاؤں کے غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں اس کا پسینہ گرتا لوگ خون گرانے کو تیار تھے۔

❖ ❖ ❖

بارہ سال قبل ایک دن گھاسی رام اچانک غائب ہو گیا۔ لوگ اس کی غرض سے بنارس روانہ ہوا تھا مگر پھر لوٹ کر نہ آیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ تارک الدنیا ہو گیا ہے لیکن کسی کو یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ اسے مار ڈالا گیا ہے۔ اگر کوئی اس خوفناک راز سے واقف تھا تو وہ جنگی خان تھا۔ ان دنوں جنگی خان ایک معمولی آدمی تھا لیکن اس کے پاس کبھی اتنا روپیہ جمع نہ ہوا کہ وہ گھاسی رام کے کھیت خرید سکتا۔ وہ ہمیشہ گھاسی رام کے کھیتوں کو حسد کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کو خریدنے کے لیے کوشاں رہتا۔ آخر کار اس نے اس عقدہ کو حل کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

گرمی کا موسم تھا جب گھاسی رام بنارس کے لیے روانہ ہوا۔ گھاسی رام بوڑھا شخص تھا اور وہ دھوپ کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ارادہ کیا کہ وہ رات کو سفر کرے گا اور دن کو کسی آبادی میں آرام کرے گا۔ وہ بمشکل چند میل چلا ہو گا کہ جنگی خان اس تک جا پہنچا۔ راستہ ایک سنسان باغ میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ جنگی خان نے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر اس پر خنجر کا وار کیا اور بوڑھے گھاسی رام کا خاتمہ کر ڈالا۔ پھر اس کی لاش کمبل میں لپیٹ کر گھوڑی کی زین سے باندھی اور تھوڑی دور جا کر ایک گڑھے میں دبا دی۔ جب گھاسی رام عرصہ تک واپس نہ آیا تو جنگی خان نے اُس کے دونوں کھیتوں پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کو یہ کہا کہ گھاسی رام جب بھی واپس آئے گا تو وہ اس کی امانت اس کے حوالے کر دے گا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ گھاسی رام تو اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

❖ ❖ ❖

جنگی خان عجیب خلجان میں تھا۔ کہتے ہیں کہ مقتولوں کی روح قاتلوں کو کبھی چین نہیں لینے دیتی لیکن جنگی خان کو تو اس جرم کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ اس واقعہ کو بھول ہی گیا تھا۔ لیکن آج کے اس منظر نے اسے تھرا دیا تھا۔ اس نے جسمانی تکلیف کی کبھی پروا نہ کی تھی لیکن وہ اس روحانی اذیت کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے تصور میں اپنی گناہوں بھری زندگی کا

اعادہ کیا۔ ان مقتولوں کے چہرے اسے گھور رہے تھے۔ بے رحم کوڑوں کی لاٹھیاں مزدوروں کی پیٹھ پر دکھائی دے رہی تھیں۔ فاقہ زدہ کاشتکار دربدر بھیک مانگتے دکھائی دیئے۔ اسے احساس ہوا کہ نماز روزہ بھی اس کو اس روحانی تکلیف سے نہیں بچا سکتے۔ ذکیہ خانم کا نورانی چہرہ اس کو سلامت روی کی طرف بلا رہا تھا لیکن اس کے کانوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

گھاسی رام بارہ سال تک خاموشی کے ساتھ قبر میں سوتا رہا تھا مگر جنگی خان نے ہی اس کو ابدی آرام گاہ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور اب اس کی بے چین روح ماری ماری پھرنے لگی۔

''اب یہ مجھے مرتے دم تک ستائے گا۔'' جنگی خان نے سوچا۔ لیکن وہ اب بھی اپنے کیے پر نادم نہ تھا۔ وہ ساری رات تو وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ آخر گھر واپس بھی تو جانا تھا۔ اس نے نیزہ اٹھایا اور واپسی کا قصد کیا۔ اسی وقت اس کو کھڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ گویا کوئی خشک پتوں پر چل رہا تھا۔ وہ آواز کی طرف متوجہ ہوا اور اس نظارے کو دیکھ کر سن ہو گیا۔ بادل کا ٹکڑا آگے بڑھ گیا تھا۔ چاندنی اب جنگی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ پچاس قدم آگے ایک بڑ کا درخت تھا جس سے اس نے ایک مرتبہ اپنا گھوڑا باندھا تھا۔ جنگی کے دیکھتے ہی دیکھتے سامنے تاریکی میں سے ایک بدہیئت شکل نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ چاندنی میں آئی۔ وہ چیز انسان سے ملتی جلتی تھی لیکن اس کی جسامت انسان سے دوگنی تھی۔ اس کے جسم پر ریچھ کے سے لمبے لمبے بال تھے جس سے وہ اور بھی ڈراؤنی لگ رہی تھی۔ اس کا سایہ نہ تھا۔

جنگی کا دل بیٹھ گیا۔ اس بھوت نما کے ہاتھوں میں ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

جنگی کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ منہ پھیر لے مگر وہ حرکت نہ کر سکا۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن اس کا حلق خشک ہو گیا۔ بھوت آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا یہاں تک کہ وہ ٹیلے کی دوسری طرف آن کھڑا ہوا، تب اس نے کھوپڑی اچھالی اور پھر لپک کر پکڑ لی۔

جنگی خان اب اس سے زیادہ کی تاب نہ لا سکا اور بیہوش ہو کر پیاز کے ڈھیر پر گر پڑا۔ مگر وہ زیادہ دیر بیہوش نہ رہا کیونکہ وہ جب ہوش میں آیا تو اس نے ہر چیز کو بدستور پایا، صرف بھوت وہاں موجود نہ تھا۔

جنگی نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے جھک کر دیکھا کہ بھوت کے پاؤں کے نشانات ہیں یا نہیں مگر وہاں تو کوئی نشان نہ تھا۔ جنگی خان اٹھا اور بے تحاشا گھر کی طرف بھاگا تو ہر ٹیلے پر اسے گھاسی رام کا بھوت بیٹھا نظر آیا۔ ہر سائے میں سرخ آنکھیں چمکتی نظر آئیں۔ خدا خدا کر کے وہ گاؤں میں داخل ہوا تو اس کو کچھ سکون ملا۔

راستے میں امیر علی بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جنگی کو دیکھا تو ہنسنے لگا۔

''تم اس وقت کہاں چلے گئے تھے، ہم نے تو ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہم چاندنی کا لطف اٹھائیں اور سیر کرنے چلیں۔''

''بہت تھکا ہوا ہوں میں اس وقت۔ میری مانو تو اس وقت باہر نہ جاؤ۔ گردونواح میں ایک عجیب سا جانور پھر رہا ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور اس کے جسم پر ریچھ کے سے بال ہیں۔'' جنگی خان نے اپنی کمزوری کا اعتراف نہ کرتے ہوئے امیر علی سے کہا۔

''دو پاؤں پر چلنے والا ریچھ!'' امیر علی نے کہا۔ ''کیا وہ ایسا تو نہیں تھا؟''

امیر علی کے بجائے وہی خوفناک بھوت وہاں کھڑا تھا جو پیاز کے کھیت میں اس کو سرخ انگارہ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ ''یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟''

جنگی خان کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ وہ اس کو حل کر سکے۔ اس کے سابقہ تجربے نے اس کو بتایا تھا کہ اس بھوت کی مقناطیسی نگاہ میں کیا اثر ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے اس سے آنکھ ملائی تو اس کا کام تمام ہو جائے گا۔ بھوت کا جسم غیر مادی تھا، نہ اس کا سایہ تھا، نہ اس کے قدموں کے نشان۔ شاید وہ کوئی جسمانی نقصان بھی نہیں دے سکتا تھا لیکن اس کی دہکتی ہوئی سرخ آنکھیں روح کو بے چین کر دیتی تھیں۔

جنگی نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور وہ سر

کھلیان رکھ کر دوڑا۔ سوئے ہوئے لوگ جاگ اٹھے۔ کسی نے چور چور..... پکڑنا..... یہ گیا کا شور مچا دیا، بعض نے انگڑائی لی اور پھر کروٹ بدل کر سو گئے۔ لیکن جنگی کو کسی کی پروا نہ تھی۔ اس کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ اوروں کی فکر کیا کرتا۔ مشکل سے وہ گھر پہنچا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بوڑھی خادمہ نے دروازہ کھولا اور اس کو دیکھ کر بولی۔

''بیگم صاحبہ واپس آ گئی ہیں اور انہوں نے حضور کی تلاش میں آدمی بھیجے ہیں۔''

''خیر ہے، تو فوراً قاضی صاحب کو بلا لا۔'' جنگی نے کہا۔

بڑھیا تھوڑی دور جا کر رکی اور بولی۔ ''حضور اس چور کا کیا بنا؟ کیا وہ آپ کے ہاتھ سے نکل گیا؟''

''ہاں..... وہ میرے جانے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔ اب اس کا بندوبست صبح کو کروں گا۔''

''لیکن حضور! وہ چور تو نہیں تھا اور نہ ہی وہ بھاگا۔'' اس کے ساتھ ہی بڑھیا کی جھکی ہوئی کمر سیدھی ہونے لگی اور اس کی جسامت بڑھنے لگی۔ ''وہ تو کچھ اور ہی چیز تھی۔ کیا آپ نے وہاں کوئی ایسی شے نہیں دیکھی تھی؟''

بوڑھی خادمہ کی جگہ وہی بھوت اب تیسری مرتبہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر ویسے ہی بال تھے اور اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔

جنگی کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اس نے کواڑ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ کیا یہ بھوت گھر میں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ وہ ذکیہ کے کمرے کی طرف دوڑا کہ وہ فرشتہ صفت اس کو پناہ میں لے لے گی۔ وہ ہمیشہ مشکل میں اس کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ ذکیہ کا کمرہ نہایت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ جنگی خان نے اس کو آرام دہ بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت نقش تھے۔ ایرانی قالین کا فرش تھا۔ چاندی کی مسہری تھی جس پر ذکیہ خانم بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جنگی کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

''تم کہاں چلے گئے تھے میری جان! میں پریشانی میں پڑی ہوئی تھی۔ تم نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔''

جنگی اس کے پاس مسہری پر بیٹھ گیا تو اسے کچھ سکون ملا۔ ذکیہ نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد ہے اور وہ کانپ رہا ہے۔ اس کی آواز بھی بھرائی ہوئی ہے۔

''کیوں خیر تو ہے ناں، کیا دشمنوں کا مزاج کچھ ناساز ہے۔'' جنگی نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے بھی تمہارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا۔ اگر اجازت ہو تو دسترخوان بچھاؤں۔'' ذکیہ بولی۔

''ذرا ٹھہرو۔ مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔ میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔''

پھر اس نے سارا واقعہ ذکیہ کو سنا دیا لیکن گھاسی رام کے قتل اور ڈھانچے سے اس کی مشابہت چھپا گیا۔

''کیا اللہ تعالیٰ قاتل کے جرم کو معاف بھی کر دیتا ہے۔'' جنگی خان نے پوچھا۔

''بے شک۔ لیکن مجرم کو چاہیے کہ اس کا کفارہ ادا کرے۔ اپنے گناہوں کا۔ توبہ کر لینے پر اللہ معاف کر دیتا ہے لیکن وہ گناہ جو ہم اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کرتے ہیں، وہ بغیر جسمانی کفارہ کے معاف نہیں ہوتے۔ اگر ہم نے کسی کو تکلیف دی ہے تو اس کی سزا بغیر جسمانی کفارے کے معاف نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم کسی کو مار ڈالیں تو ہم کو بھی مرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ رحیم ضرور ہے مگر اس کا فیصلہ اٹل ہے۔''

''میں نے کبھی قتل نہیں کیا۔'' جنگی خان نے سراسر جھوٹ بولا۔

''میں کھانا لے آؤں۔ ڈرنا مت۔ صبح تک تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر ذکیہ چار قدم چلی ہو گی کہ اس نے پلٹ کر دیکھا اور بولی۔ ''تم نے واقعی عجیب چیز دیکھی ہو گی۔ کیا وہ بھوت جو سائے کی تاریکی میں پیدا ہوا..... وہ ایسا تو نہیں تھا۔'' ذکیہ کے نازک جسم کی جگہ وہاں بھوت کھڑا تھا۔

جنگی کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ وہ بھوت کو دیکھ رہا تھا اور بھوت اسے گھور رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ غیر مادی جسم غائب ہو گیا لیکن سرخ آنکھیں اس کو برابر دیکھ رہی تھیں۔ جنگی خان پھر ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔

❖ ❖ ❖

صبح ہوتے ہی ذکیہ بیگم واپس آ گئی۔ بوڑھی بیوہ کی حالت اب ٹھیک تھی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو

اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر مسہری پر نزار کی حالت میں پڑا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ چھت پر ٹکٹکی جمائے ہوئے ہے۔ وہ بہک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''گھاسی رام! بھوت! میں تم دونوں سے نہیں ڈرتا۔ تو سایہ میں سے باہر نکل پھر میں تجھ کو سمجھوں گا، میرا پستول لاؤ میں ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔ نہیں۔ میں نے ہرگز قتل نہیں کیا۔ میری بات مانو.... گھاسی رام!.... گھاسی رام! کیا تُو مجھے معاف نہیں کرے گا؟ تُو مجھے اس قدر گھورتا کیوں ہے؟ تُو تو اپنی عمر ختم کر چکا تھا.... اب تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

ذکیہ نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ وہ کسی حکیم کو بلا لائے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ اب جنگی خان کا بہکنا تو بند تھا لیکن بخار بہت تیز تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں جل رہے تھے اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ اس کی آنکھیں اب بند تھیں، وہ بے کسی کے عالم میں پڑا تھا۔ ذکیہ کو احساس ہو گیا کہ یہ جنگی خان کا آخری وقت ہے۔ اس کا دل گھبرا گیا اور وہ جنگی خان سے لپٹ کر رونے لگی۔ جنگی خان کو کچھ ہوش آیا تو اس نے ذکیہ کو بتایا کہ اس نے ایک خواب دیکھا ہے کہ تم نے بھی بھوت کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ذکیہ سمجھ گئی کہ وہ رات کو کسی چیز سے ڈر گیا ہے۔ اس کے بعد جنگی نے اسے تمام ماجرا سنا دیا اور اپنے جرم کا اقبال کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اپنے گناہوں کا کفارہ کس طرح ادا کروں؟ ذکیہ کے کہنے پر اس نے ایک وصیت نامہ لکھا جس کی رو سے اس نے اپنی کل جائیداد اور مال و دولت کو غریبوں کے لیے وقف کر دیا۔

''تم کہتی تھیں کہ موت کی سزا موت ہے۔ کیا میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں؟'' جنگی کہہ رہا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے اور اب اس کی ضرورت نہیں۔ قانونِ الٰہی نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اب اس کی آخری سانسیں تھیں۔ ذکیہ نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور رونے لگی.....

''یہ بڑی خوش خبری ہے.... دنیا میں رہنا اب میرے لیے دوزخ سے بدتر ہے۔ میں آرام اور سکون چاہتا ہوں۔ الٰہی تیرا شکر ہے۔ دیکھو دیکھو، سورج نکل رہا ہے تمہاری پیش گوئی پوری ہو رہی ہے۔''

جنگی خان پر سکرات کی حالت طاری تھی۔ ذکیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اتنے میں امیر علی کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ذکیہ ایک چھوٹی سی گٹھڑی اپنے ہاتھ میں لیے کھڑی ہے۔ اس نے امیر علی سے کہا۔ 'تم اس کے کفن دفن کو دیکھو۔ اب میں یہاں اکیلی نہیں رہ سکتی'' یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف بھاگی۔

جنگی خان کو سب لوگ آخری منزل پر پہنچا کر جب واپس آئے تو ذکیہ غائب تھی۔ بہت تلاش کیا گیا مگر بے سود۔ وہ کہیں نہ ملی۔ امیر علی نے جنگی کی وصیت کے مطابق اس کی جائیداد، حویلی اور دولت غریبوں میں تقسیم کر دی اور پھر وہ خود بھی وہاں سے چلا آیا۔

☆.....☆

یوں ہی دو سال گزر گئے۔ ایک روز وہ دہلی میں محلہ پہاڑ گنج کی ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک ٹوٹے ہوئے مکان کے آگے لوگ جمع تھے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہاں پر ایک غریب عورت رہتی تھی۔ گزشتہ رات وہ مر گئی۔ اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہ تھا۔ بول چال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی امیر گھرانے کی ہے۔ جنازہ تیار تھا۔ امیر علی بھی شریک ہو گیا۔ جب لوگ میت کو لے جانے لگے تو اس نے دیکھا کہ ایک پرانے ریشمی رومال میں کچھ بندھا رکھا ہے۔ رومال دیکھ کر امیر علی سناٹے میں آ گیا۔ اس نے رومال اٹھا کر کھولا تو سب سے اوپر ایک چاندی کی انگوٹھی تھی جس پر نقش کندہ تھا۔ یہ اس کی ماں کی انگوٹھی تھی جو اس نے مرتے وقت ذکیہ کو دی تھی جسے وہ ہر وقت پہنے رکھتی تھی۔ امیر علی چیخ مار کر میت سے لپٹ گیا۔ یہ میت ذکیہ کی تھی۔

نہ جانے وہ کیوں جنگی خان کی حویلی چھوڑ کر دہلی آ گئی تھی اور ایک گمنام زندگی گزار دی تھی۔ یہ کوئی نہیں جان سکا، جنگی کو اسی کھیت میں دفن کیا گیا تھا جہاں سے گھاسی رام کا ڈھانچہ برآمد ہوا تھا۔ وہ کھیت اسی طرح بنجر پڑا ہے۔ کوئی ڈر کے مارے ادھر نہیں جاتا۔

.....☆.....

سیلوی اور راہی

جاوید راہی

ایک ایسا حقیقت پرور سچ، جو یقین کی سرحدوں پر دم توڑ دیتا ہے

اس شخص کا قصہ حیرت جو آج بھی اک روح کے زیر اثر کراچی میں رہائش پذیر ہے

میرا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جہاں دو وقت کی روٹی کے لیے سارے گھر کے لوگوں کی مشقت کرنا لازمی قرار دیا جانا انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میں نے گرتے پڑتے ایف ایس سی مکمل کی اور مزید تعلیم کے لیے لاہور کا رُخ کرلیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے گھر سے لائے تھوڑے بہت روپے پھونک پھونک کر خرچ کرنے کا عہد کرلیا۔ کئی ایک پرائیویٹ ٹیوشن سینٹر، پرائیویٹ کالجز اور ایسے ہی اداروں کا جائزہ لیا آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ بج کام دھندا اور نائٹ کلاسز میں گریجویشن کی تیاری۔ جس بلڈنگ میں مزدوری کررہا تھا وہاں پر مستری کے ساتھ ایک مزدور تھا جس کے ساتھ میری ڈیوٹی لگی۔ وہ پانچ وقت کا نمازی تھا جب وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا تو میں اپنی کوئی بک نکال کر ریڈ کرنے بیٹھ جاتا۔ پلازا کا مالک بھی نمازی اور پرہیزگار تھا اس لیے نماز پڑھنے والوں کو کوئی پابندی اور ٹینشن نہیں تھی۔ ایک روز خان صاحب نے مجھے پڑھتے دیکھ کر مجھے مخاطب کیا کہ تم کیا پڑھتے رہتے ہو۔ میرے بتانے پر وہ بہت خوش ہوا اور مجھے مزدوری کی مد میں پلازا کی نگرانی پر مامور کردیا اور پلازا میں ہی رہنے کی اجازت دے دی۔ پہلے میں آفیشن کے باہر تیس روپے رات بھر کے لیے چارپائی بستر کرایہ پر لے کر سوتا تھا۔ اب پلازا کی چھت پر سیمنٹ کے خالی تھیلے جو وہاں وافر مقدار میں موجود تھے نیچے بچھا کر اوپر لنڈے سے لایا پرانا گدا جو دو سو روپے میں خریدا تھا ڈال کر رات کو سوجاتا کھانے کا بندوبست سڑک پار کھڑے کئی ٹھیلوں پر کچھ نا کچھ مل جاتا پراٹھے اور چائے تو تمام رات ہی چلتے رہتے تھے۔ ایک پراٹھا اور چائے کا کپ لے کر پیٹ کا دوزخ بھرتا اور پھر چھت پر آکر بلب کی روشنی میں دیر تک پڑھتا رہتا پلازا کی دوسری طرف ایک بہت بڑا خالی پلاٹ پڑا تھا جس کے چاروں طرف اونچی دیوار اور سامنے کی طرف بڑا سا گیٹ تھا۔ پلاٹ کے اندر انتہائی کونے میں چھوٹا سا کھنڈرات نما کمرہ آس پاس خود رو جھاڑیاں اور کئی ایک بڑے بڑے درخت تھے۔ چھت پر سے اس خالی پلاٹ کا سارا نقشہ صاف دکھائی پڑتا تھا۔ کمرے میں اگر کوئی رہتا بھی تھا تو اس کے وجود کا کوئی علم نہ ہونے کے برابر ہی تھا بس مدھم سی روشنی نظر آتی جو رات کو ہی دکھائی پڑتی سارا دن نیچے کام پر ہی ہونے کی وجہ سے دن بھر اس طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کبھی۔ دوپہر کو کھانے کی چھٹی یا ریسٹ سمجھ لیں اس دوران میں اسٹڈی کرلیا کرتا تھا۔ صبح نیچے آتے رات کو ساتھ لائی کتاب لانا معمول ہوگیا تھا۔ سیڑھیاں عبور کر کے اوپر چھت پر آیا اور گدے میں لپٹی کتاب اُٹھا

کر سیدھا ہوا تو غیر ارادی طور پر میری نظر پیچھے والے پلاٹ پر گئی تو میری نظروں کے سامنے اس کھنڈرات نما چھوٹی عمارت میں زندگی کے آثار دکھائی دیئے۔ کوئی خاتون تھی جو میری طرف پیٹھ کیے شاید گود میں بچہ لیے بیٹھی تھی۔ میں سرسری نظر ڈال کر نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔ رات کو میں نے اوپر آکر خالی پلاٹ کی طرف دیکھا تو کمرے میں صرف مدھم سی روشنی کا احساس ہوا مگر اندر زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں بلب روشن کرکے پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ پتا نہیں کب نیند آگئی اور میں سوگیا۔ کھلے آسمان کے نیچے تاروں کی چھاؤں میں سونے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے ماحول کی سحر انگیزی میں رات کا منظر چاروں جانب خاموشی کا عالم اور سامنے پلازے کی چھت پر پڑا میں تنہا گھر سے دور آکر لاہور چلا آیا پڑھائی جاری رکھنے اور والی، یہ اب میرا خواب اور شوق تھا۔

آنکھوں میں سو رہا تھا یا غنودگی میں تھا کوئی انسانی وجود ادھر حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا ساتھ میں آگے پیچھے چھوٹے بچے بھی تھے پھر وہ چھت پر سے دوسری طرف چلتے دوسری طرف چلے گئے جیسے پلازا کے ساتھ کوئی دوسری چھت بھی ہو۔ میری یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ میرے ذہن میں وہ سارا منظر بدستور جگمگا رہا تھا۔ میں نے نیچے خالی پلاٹ کی طرف دیکھا وہاں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر یونہی گم صم بیٹھا رہا پھر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر دوبارہ گدے پر دراز ہوکر سونے کی کوشش کرنے لگا پتا نہیں کب نیند نے دبوچ لیا۔

صبح جھنجھوڑ کر جگانے والا پلازا کا منشی تھا۔ سورج سر پر اُٹھ آیا تھا اور میں ابھی سو رہا تھا۔ جلدی جلدی میں نے بستر اکٹھا کیا، اپنی کتاب سنبھالی اور نیچے کی طرف بھاگا۔ عجلت کے باعث نیچے خالی پلاٹ کی طرف بھی نہ دیکھ پایا حالانکہ اُٹھتے ہی میری نظر ادھر جاتی تھی۔ دوپہر تک میں اپنے کاموں میں اُلجھا رہا جب کھانے وقفہ ہوا تو غیر ارادی طور پر سیڑھیاں عبور کرتا ہوا اوپر چھت پر آگیا اپنا بستر سیدھا کیا اور بیٹھ کر کتاب کھول لی مگر میرا دھیان نیچے پلاٹ کی طرف تھا۔ درختوں کی طرف سے کوئی پلک جھپکتے نکلا اور بوسیدہ سے کمرے کے اندر گم ہوگیا جیسے اسے احساس ہوگیا ہو کہ میں چھت پر سے ادھر ہی متوجہ ہوں۔

مجھے بھی یقین ہوگیا کہ اس ٹوٹے پھوٹے گھر

میں کوئی فیملی رہتی ہے۔ اس گھر میں رہنے والی لڑکی یا خاتون کو میں نے ایک دو بار جائزہ لینے والی نظروں سے دیکھا تھا اس کے جسم کی ساخت سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ جسمانی طور پر دلکش نقوش رکھنے والی تھی۔ میں جتنی دیر تک وہاں بیٹھا رہا کوئی بھی خاص بات سامنے نہ آئی اور میں دوبارہ چھت سے نیچے اُتر گیا۔

☆.....☆

دو دن گزار کر میں گھر سے واپس ڈیوٹی پر آیا تو سب سے پہلے میرے قدم اوپر چھت کی طرف اُٹھ گئے اچھی طرح سے نیچے پلاٹ کا جائزہ لیا کوئی بھی حرکت اور نہ ہی ذی روح کا نام ونشان دکھائی دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس بوسیدہ سے گھر میں رہنے والی فیملی کے بارے میں کیوں دلچسپی لے رہا ہوں حالانکہ مجھے ایسے معاملات میں توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر میں کیوں اس بارے پریشان تھا۔

اس سلسلے میں دو تین بار میرے ذہن میں آیا کہ کسی سے پوچھوں کہ ادھر کون رہائش پذیر ہے پر میری ہمت نہ ہوئی کچھ پوچھنے کی کیونکہ میرے بارے میں یہاں سب لوگوں کے بہت اچھے خیالات تھے اور میں کوئی ایسا ایشو نہیں اُٹھانا چاہتا تھا کہ مالکان پلازا میرا چھت پر جانا بند نہ کردیں۔ یہ سوچ کر میں نے ذہن میں آئے خیالات کو جھٹک دیا اور یونہی تانک جھانک پر اکتفا کرلیا۔

کمروں کا پلستر روک کر مالکان پلازا نے ٹریس شیڈ بنانے کا فیصلہ کرتے اضافی راج اور مزدور فارغ کردیئے اور یوں میرے پاس برائے نام ہی کام رہ گیا۔ شیڈ ڈالنے کے لیے شٹرنگ اور سریا باندھنے کا ہی کام ہو رہا تھا میں جب جی چاہتا باہر نکل جاتا اور مٹرگشت کرکے پلازا لوٹ آتا۔ آج بھی میں کھانا کھانے نکلا تو میرے قدم پلازا کے پچھلے والے حصہ کی طرف اُٹھ گئے کافی اونچائی سے نیچے کا منظر دکھائی تو پڑتا تھا مگر قدرے دھندلا۔ جب میں اس خالی پلاٹ کی اونچی دیواروں اور بند گیٹ کے سامنے آن کھڑا ہوا تو گیٹ کے رنگ آلود تالے کو دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ یہاں مکین سائیڈ والے چھوٹے گیٹ کو ہی آنے جانے کے لیے استعمال کرتے ہوں گے، ابھی میں کوئی اندازہ ہی لگا رہا تھا کہ اچانک سائیڈ والا چھوٹا گیٹ کھلنے کا احساس ہوا تو میں فوراً گیٹ سے ہٹ کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ کھلنے والے حصہ کے دوسری طرف ایک خوبصورت دمکتا ہوا چہرہ مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور مڑ کر گیٹ کے چھوٹے دروازے کے آگے آ کھڑا ہوا۔ ''جی۔'' میں نے نگاہیں نیچی کرتے پوچھا۔

''اندر آجائیں گھر میں کوئی نہیں۔''

''جی آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟'' میں نے حیرت زدہ ہوتے پوچھا۔

''نہیں میرا میاں اور میرا بچہ بھی ہے۔'' اس نے مسکراتی آنکھوں سے میری حیرت کو بھانپتے جھٹ سے جواب دیا۔

''تو آپ کا میاں نظر نہیں آتا۔'' میں نے بے خیالی سے پوچھا۔

''وہ دیر سے گھر آتے ہیں صبح منہ اندھیرے ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں سارا دن ہم دونوں ماں بیٹا گھر میں اکیلے ہوتے ہیں۔ میں کئی دنوں سے آپ کو دیکھ رہی ہوں کہ آپ ادھر دیکھتے رہتے ہیں۔'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے میری چوری کا راز فاش کرتے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

جواباً میں جھینپ کر رہ گیا اور نظریں پھیر لیں۔

''اندر آجائیں باہر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں۔'' اس نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

چند پل میں نے سوچا اور سائیڈ گیٹ عبور کر کے اندر آ گیا چاروں طرف ویرانی کا راج تھا پورے پلاٹ میں اونچی اونچی گھاس اور بڑی بڑی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں ابھی میں ادھر ہی متوجہ تھا کہ چھوٹا سا لڑکا اندر سے باہر آکر اپنی ماں کے ساتھ لگتا میری طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''میرا بیٹا رامی ہے۔'' اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اس کا نام بتایا۔ میں نے برجستہ اس لڑکی سے اس کا نام پوچھ لیا۔ اس نے دھیمے لہجہ میں بتایا۔ ''سلومی!''

''خوبصورت نام ہے۔'' میں نے تعریف کی۔ ''آپ ادھر آجائیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' سلومی نے بے ترتیب اینٹوں پر قدم آگے بڑھاتے روی کا بازو

تھام لیا۔ مجھے ٹوٹے پھوٹے کمرے کے اندر آنے کی دعوت دی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سلومی کے پیچھے چلتا ہوا بوسیدہ سے کمرے کے اندر آ گیا۔ دروازے کی جگہ لوہے کی چوکھٹ پر پرانا سا پردہ لگا کر دروازے کا کام لیا گیا تھا اندر ایک چارپائی اور تھوڑے سے پرانی طرز کے پلے اور سلور کے برتن بے ترتیب پڑے تھے ایسے ہی کھڑکیوں پر پرانے پردے لٹک رہے تھے۔ دیوار میں دو لوہے کے سریے ٹھونک کر اس کے اوپر لکڑی کی پٹی پر دو چارڈبے رکھے ہوئے تھے شاید چینی پتی وغیرہ تھی اس میں کونے میں اینٹیں جوڑ کر چولہا بنایا ہوا تھا اور پاس ہی کونے میں سوکھی جھاڑیوں اور گھاس پھوس کا گٹھا پڑا ہوا تھا۔ جو شاید پلاٹ سے اکٹھا کر کے استعمال میں لائی تھی وہ۔ رامی کو میں نے پیار سے اُٹھا کر اپنی گود میں لے لیا اور اس کا سر سہلانے لگا۔ سلومی کو میں نے چائے سے منع کردیا تھا۔ اس نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا اور میرے قریب ہی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''آپ کا نام!'' اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے مجھ سے دریافت کیا۔

''ناصر علی۔'' میں نے اپنا نام بتاتے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اس طرح مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر سمٹ گئی اور رامی کو مجھ سے لے کر اپنی گود میں لٹا کر بے باکی سے اپنی قمیض اوپر کر کے اسے فیڈ کرانے لگی۔ سلومی کی اس حرکت پر میں یکدم گڑبڑا گیا اور اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''کیا ہوا۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے پوچھا اور قمیض کو تھوڑا نیچے کرتے رامی کا منہ چھپا دیا۔

''آپ کب سے اس پلازا میں کام کر رہے ہو؟''

''زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ دراصل میں لاہور میں پڑھنے آیا ہوں۔ میرا خاندان انتہائی غریب ہے سب مل کر کما لیتے ہیں تو گزارہ ہوتا ہے۔ سوچا کہ اپنی تعلیم مکمل کر لوں تو اچھی نوکری کرلوں تاکہ اپنے گھر والوں کو سنبھال سکوں۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران سلومی نے بتایا کہ جن کے پلاٹ میں ہم رہ رہے ہیں یہ ان کا خاندان کی فیکٹری میں ملازم ہے۔ صبح منہ اندھیرے کام پر جاتا ہے اور شام بلکہ رات گئے واپس آتا ہے آپ کا جب دل چاہے آجایا کریں اسی بہانے میرا اور رامی کا دل بہل جایا کرے گا۔''

سلومی کے لہجہ میں اپنائیت اور بیچارگی کا درد بھرا ہوا تھا۔ میں نے وعدہ کرلیا کہ جب فارغ ہوا کرونگا ادھر آجایا کروں گا۔'' میں نے بھی اپنے اندر سلومی کے لیے ہمدردی کا عنصر جاگتے محسوس کرلیا تھا۔ رامی دودھ پیتے سو چکا تھا وہ اسے چارپائی پر لٹاتے اپنی قمیض درست کرتی میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں چمکتی خود سپردگی کو میں نے محسوس کرتے وہاں سے اُٹھ کر جانے میں ہی بھلائی تصور کی۔ ''اچھا جی میں چلتا ہوں منشی غصہ ہو گا بہت دیر ہوگئی ہے۔'' میں نے بات بناتے اور اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی میرے ہمراہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں پردہ ہٹا کر باہر نکل آئے۔ دروازے سے تھوڑا پیچھے ہی تھے کہ سلومی نے میرا بازو تھامتے التجا بھرے لہجہ میں کہا۔

''ناصر جی آپ آیا کریں گے نا؟''

میں نے جذبات سے بے قابو ہو کر سلومی کو اپنے دونوں بازوں میں لیتے اپنے سینے سے لگاتے اُسے بھرپور یقین دلایا۔ کافی دیر تک ہم دروازے کے قریب کھڑے ایک دوسرے کو محسوس کرتے رہے اور پھر میں اجازت لے کر باہر آ گیا۔ دور تک پڑے خالی پلاٹوں کے سوا وہاں کوئی بھی دوسرا نہیں میرے سوا۔

☆.....☆

میرا اب سلومی کو ملنے کے لیے دل بیقرار رہنے لگا تھا۔ رات کو میں چھت پر اور وہ باہر چارپائی پر آ کر بیٹھ جاتی اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ یہ سلسلہ روز بروز آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ رامی مجھ سے خاصا مانوس ہو چکا تھا کبھی کبھی مجھے اس ویرانے کی خاموشی سے ڈر لگنے لگتا تھا مگر پھر یہ سوچ کر میں دل بڑا کر لیتا کہ یہ عورت ہو کر چھوٹے سے بچے کے ہمراہ دن رات اکیلی رہ رہی ہے اور میں مرد ہو کر ڈر جاتا ہوں۔

میں نے سلومی کو منع کردیا تھا کہ تم کچھ نا پکایا کرو۔ میں تمہارے لیے دوپہر کا کھانا وغیرہ باہر سے لے آیا کروں گا مگر اس نے منع کردیا کہ میں عادی ہو چکی ہوں۔ وہ رات جو کھانا لاتے ہیں وہ اتنا ہوتا ہے کہ صبح کا ناشتا بھی پیٹ بھر کر لیتی ہوں وہ تو ناشتا فیکٹری جا کر کرتے ہیں میں مطمئن ہوگیا۔

اب میں بلا روک ٹوک جب دل چاہتا جا دھمکتا وہ

بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتی ایک دو بار میں نے کوشش کی کہ دونوں ماں بیٹے کو باہر لے جاؤں گھمانے کے لیے مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر انہیں پتا چل گیا تو بہت برا ہوگا اور پھر مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ جب ہم آزادی سے یہاں پر مل لیتے ہیں تو باہر جا کر کیا کریں گے۔

چھٹی کر کے جب میں سلومی کو ملنے گیا تو اس نے بتایا کہ میرا بندہ مالکوں کے کام شہر سے باہر گیا ہے، آج رات وہ گھر نہیں آئے گا۔ اگر تمہیں کوئی دقت نہ ہو تو تم ادھر ہی رُک جاؤ؟''

''نہیں کوئی دقت نہیں ہوتی میں چوکیدار کو بتا کر رات کو آجاؤں گا۔'' میں نے اس سے وعدہ کر لیا اور واپس پلازا آ گیا۔

شام کو چھٹی کر کے میں نہا کر تیار ہوا اور چوکیدار کو بہانا بتا کر وہاں سے نکل آیا۔ اِدھر اُدھر پھرتے اندھیرا پھیل گیا اور میں پلازا کے پیچھے والی سڑک پر چلتا ہوا سلومی کے گیٹ پر آ گیا۔ وہ میری منتظر تھی چھوٹا دروازہ کھولتے اس نے میرا ہاتھ تھام کر اندر کر لیا اور کنڈی لگاتے میرے ساتھ کمرے میں آ گئی چارپائی کے ساتھ اس نے اینٹیں جوڑ کر چھوٹا سا چبوترا بنا لیا تھا جس پر رامی بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ چارپائی پر بڑے سلیقہ سے بستر بچھا ہوا تھا۔

میرے بیٹھتے وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔

''سلومی۔''

جی اس نے خود کو میرے قریب کرتے جواب دیا۔

''یہ پکی بات ہے نا کہ تمہارے میاں کے آنے کی کوئی اُمید نہیں؟''

''نہیں اس بارے پریشان نہ ہوں وہ اکثر کئی کئی راتیں نہیں آتا۔ مالکان اسے ادھر اُدھر بھجواتے رہتے ہیں۔'' سلومی نے مجھ پر قربان ہو جانے والے انداز میں مجھے تسلی دی اور میرے قریب دراز ہو گئی۔

رات گئے تک وہ مجھ پر اپنی محبت کی بارش برساتی رہی۔ تمام رات اس کا بیٹا رامی پل بھر کے لیے بھی ادھر سے اُدھر نہ ہوا اور بے خبر پڑا سوتا رہا۔ پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح میں نے روٹین کی عادت کو فراموش کر دیا اور یونہی سلومی سے لگ کر پڑا سوتا رہا میرا پورا جسم نقاہت میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر دن کے اجالے کی روشنی پردوں میں سے چھن کر اندر کمرے میں نیم تاریکی کا سماں پیش کر رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے سلومی کو خود سے الگ کیا اور چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ رامی اس پوزیشن میں پڑا ہوا تھا بالکل ساکت میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا تو سخت جھٹکا لگا وہ کسی لاش کی طرح سرد پڑا ہوا تھا میں نے گھبراہٹ میں سلومی کو جھنجھوڑا وہ بھی اسی طرح ساکت محسوس ہوئی میں اس صورتِ حال سے گھبرا کر اُٹھ بھاگنے کو تھا کہ یکدم سلومی کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''اُٹھ گئے۔'' اس نے توبہ شکن انگڑائی لیتے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے لمبی سانس بھری اور جواباً مسکراتے ہوئے بولا۔

''مجھے تو ساری رات ہوش ہی نہیں رہا۔''

''ہم ایسے ہی ہوش اُڑا دیتے ہیں۔'' اس نے شوخی سے کہا اور اُٹھ کر رامی کی طرف متوجہ ہو گئی جواب کروٹ بدلے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر سلومی نے اسے اُٹھا کر گود میں لے لیا اور بے تکلفی سے اپنی چھاتی ننگی کرتے اس کے ہونٹوں میں ڈال دی۔ ''اچھا سلومی میں اب کام پر چلتا ہوں دوپہر کو آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مسکراتی نگاہوں سے میری جانب دیکھتے رامی کو دوسری طرف کیا۔ میں مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میرے جسم سے جیسے جان نکلی پڑی ہو اس طرح کی کیفیت تھی میری۔ بڑی مشکل سے میں پلازا پہنچا تھا۔ منشی چائے پی رہا تھا مجھے دیکھتے اس نے دوسرے کپ میں چائے ڈال کر مجھے دی میں نے شکریہ کہتے کپ اُٹھا لیا۔ چائے پینے سے میری طبیعت کی سستی میں کچھ کمی ہوئی اور میں اُٹھ کر اوپر ٹیرس کی طرف چل پڑا۔

سارا وقت میں بے دل سا ہو کر بیٹھا رہا۔ میرا سارا جسم تھکاوٹ سے چور ہو رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ سلومی کے ساتھ گزرا وقت مجھے بڑا خواب ناک محسوس ہو رہا تھا دوپہر کو تو مجھے ٹائم نہ ملا شام کو چھٹی کر کے میں سلومی کو ملنے پہنچ گیا۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے میں نے رامی کو اُٹھا کر گود میں لیا اور دوسرے بازو سے سلومی کو اپنے ساتھ لگا کر خیر خیریت دریافت کی اور اس کے میاں کے بارے میں پوچھا جواب میں اس نے برا سا منہ بناتے کہا۔

''اس نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے دو تین دن

لگ سکتے ہیں شاید کل آئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے **شوخ نگاہوں** سے میری طرف دیکھا اور مجھے لیتے اندر کمرے میں آ گئی اس چبوترے نما تھڑے پر کافی کچھ پڑا تھا **فروٹ، دودھ، دو پتلیں کوک** کی۔

'' آپ بازار گئی تھیں۔'' میں نے سامان دیکھ کر دریافت کیا۔

''جی ہاں کل رات آپ کی خدمت نہ کر سکی مجھے خوشی کے مارے کچھ یاد ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے تو پیٹ بھر کے کھا لیا ہے اب یہ سب کچھ آپ کا حصہ ہے۔ میں بھی آپ کا ساتھ دوں گی مگر جب مجھے بھوک لگی۔'' اس نے کافرانہ ادا سے کہا۔

''تو آج بھی مجھے آپ کا مہمان بننا ہوگا۔'' میں نے اس کا ارادہ بھانپتے شرارت بھرے لہجہ میں کہا۔

''آپ کا دل نہیں چاہتا میرے پاس ٹھہرنے کو۔'' سلومی نے روٹھنے والے انداز میں میری آنکھوں میں دیکھتے برجستہ پوچھا۔

''ارے نہیں میں تو یونہی کہا ہے۔'' میں نے اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔ پھر ہم دونوں ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

''سلومی ایک بات کہوں؟''

''ہاں دو کرو۔'' وہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔

''اگر آپ کا میاں اچانک آ گیا اور اس نے مجھے دیکھ لیا تو کیا بنے گا۔'' میرے لہجہ کا ڈر محسوس کرتے وہ مسکرائی اور بولی۔

''میں اسے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تم مجھے فارغ کر دو۔ میں ناصر صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' اس کے لہجہ میں ٹھہراؤ کو محسوس کرتے میں نے اپنے اندر ایک طرح کے حوصلہ کو جگہ دی۔ رات بھر ہم دونوں دنیا سے بے نیاز اپنے آپ میں گم رہے رامی کو سلومی نے اسی طرح اس چبوترے پر لٹا دیا تھا اور وہ تمام رات پڑا سکون سے سوتا رہا اور ہم دونوں اس کی فکر سے آزاد پڑے ہوئے تھے۔ صبح اُٹھ کر میں پلازا آ گیا اور اپنے کام میں مصروف ہو کر سلومی کے خیالوں میں کھویا رہا۔

☆.....☆

یہ سلسلہ مسلسل دو ماہ سے جاری تھا۔ اب میرے اندر سلومی سانسوں کی طرح چلتی تھی۔ میں نے اسے دو بار کہا کہ ہم یہاں سے بھاگ چلتے ہیں کسی دوسرے شہر۔ اس نے انکار تو نہ کیا مگر یہ کہہ کر مجھے مطمئن کر دیا کہ جیسے کام چل رہا ہے اسے چلنے دیں جب کوئی مسئلہ بنا تو یہ بھی کر لیں گے۔''

شیڈ کی چھتیں مکمل ہو چکی تھیں اور مالکان نے کام بند کر دیا اور مجھے بھی وہاں سے فارغ کر دیا گیا۔ یہ بات میں نے سلومی کو بتائی تو اس نے یہ کہہ کر میری ہمت بندھائی کہ اتنا بڑا شہر ہے کسی اور جگہ کام کر لو تلاش۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی بات کی تائید کی اور مزدور اڈے پر آ بیٹھا یہاں کوئی نا کوئی کام مل جاتا تھا۔ شام کو میں کام سے واپس آ کر جب سلومی کے گھر ملنے آیا تو وہاں کچھ لوگ کام کر رہے تھے۔ وہ کھنڈرات نما کمروں کو مسمار کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ سلومی اور رامی ادھر ہی ہوں گے مگر وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دیئے۔ ابھی میں اسی اُدھڑ بن میں گھرا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''ہاں جی کیا مسئلہ ہے۔'' سوال کرنے والا بارعب سا بندہ تھا۔

''جی وہ یہاں جو اس مکان میں رہتے تھے وہ کدھر گئے۔''

''ارے بھائی یہاں جو رہتے تھے وہ تو اوپر چلے گئے ہاں ماں اور بچے کو قتل کرنے والا جیل میں ہے اسے مل لو جا کر۔ چار سال ہو گئے اس واقعہ کو پتا نہیں اُسے سزائے موت ہو گئی یا عمر قید۔ اگر کام چاہیے تو تم بھی کل سے آ جانا مزدوری کے لیے۔'' وہ کہتا ہوا دوبارہ وہاں کام کرنے والوں کی طرف گھوم گیا۔

میں اس کے منہ سے یہ جملہ سن کر سکتہ میں آ گیا تھا کہ ماں اور بچے کو اس کے خاوند نے قتل کر دیا تھا اور خود وہ جیل میں تھا۔ میں نے لرزتے قدم جو آگے بڑھنے سے گریزاں تھے گھسیٹتے آگے بڑھا دیئے۔ تو کیا میں اس کھنڈرات نما کمرے میں اتنے ماہ کسی روح کے حصار میں تھا۔

اس واقعے کے بعد سے جیسے مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی تھی اور پھر مجھ سے اس شہر میں رہا نہ گیا۔

آج میں کراچی میں ایمپریس مارکیٹ کے قریب رہتا ہوں اور ہاں مزے کی بات بتاؤ۔ سلومی اور رامی اکثر مجھ سے یہیں آ کر مل جاتے ہیں۔

☆☆☆

ہم زاد

افتخار چوہدری

اس شخص قصہ خونچکاں، جس نے ہم زاد قابو کرنے کے لیے سب کچھ کرلیا تھا مگر جب ہم زاد ملا تو...

تین دن ہو چکے تھے وقفے وقفے سے بارش ہو رہی تھی، گزرتے وقت کے ساتھ بادل مزید گہرے ہوتے جا رہے تھے، جس سے لگ رہا تھا کہ اگلے کئی روز تک موسم کی صورتحال ایسی ہی رہے گی، ابھی چند گھنٹوں کا وقفہ آنے کے بعد ایک بار پھر گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار طوفانی بارش شروع ہو چکی تھی۔ مسلسل بارش اور دریا کے چھلکنے سے اطراف میں نچلے درجے کا سیلاب آیا ہوا تھا، ایسے میں جاوید اپنے فارم ہاؤس کی دوسری منزل کے برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا، وہاں سے دور تک برستی ہوئی بارش اور کناروں سے چھلکتا ہوا دریا صاف نظر آ رہا تھا، وہ اس منظر کو محویت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔

جاوید نکلتے قد اور چھریرے جسم کا طاقتور نوجوان تھا صاف رنگت کے ساتھ تلوار مارکہ مونچھوں نے اس کی شخصیت کو جاذب نظر بنا دیا تھا۔

وہ اس فارم ہاؤس کے گرد موجود زرعی زمینوں پر اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ کاشت کاری کرتا تھا، فارم ہاؤس کے سامنے دریا اور پچھلی طرف گھنا جنگل تھا، جو میلوں رقبے پر پھیلا ہوا تھا، اس میں بے ضرر جانوروں سے لے کر خونی درندے تک موجود تھے، جنگل اور دریا کے درمیان ایک لمبی پٹی کی صورت میں ان کی کئی مربعے زرعی اراضی تھی۔

اس کا والد چوہدری الیاس آج ہی بارش رکنے کے درمیانی وقفے میں بیٹوں اور جانوروں سمیت گھر منتقل ہو گیا تھا، جو چند میل دور ایک پہاڑی پر موجود گاؤں میں تھا۔ چوہدری الیاس کے جہاندیدہ ذہن نے آسمان سے برسنے اور دریا سے عذاب کی صورت نکلنے والے پانی کے سیلابی ریلوں کی شکل اختیار کرنے کا وقت سے پہلے ادراک کر لیا تھا، اس لیے وہ گاؤں منتقل ہو گیا۔ فارم ہاؤس میں موجود ٹریکٹر، تھریشر، اور ہارویسٹر، کے علاوہ کئی قسم کی جدید مشنری موجود تھی ان مشینوں کی حفاظت کے پیش نظر جاوید کو یہیں رہنے دیا گیا تھا بلکہ فارم پر رہنے کی ضد خود جاوید نے کی تھی کیونکہ وہ کافی عرصے سے کسی ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھا کہ جب وہ تنہا ہو تو اپنے دوست سائیں کریم کا بتایا ہوا چلہ مکمل کر کے اپنے ہمزاد کو قابو کر سکے۔ اب قدرت نے اسے خراب موسم کی صورت میں ایسا موقع فراہم کر دیا تھا کہ کئی روز تک اس طرف کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا،

ان کے گھر کے قریب سیّد چراغ شاہ کا مزار تھا

[illegible] سائیں کریم جاوید کے بچپن کا لنگوٹیا [illegible] راتوں کو مزار پر حاضری دینے کے [illegible] دوست سے بھی مل آیا کرتا تھا۔

سائیں کریم سے درجنوں سچے جھوٹے ماورائی [illegible] کہانیاں سن کر اس کی ایڈونچر پسند طبیعت اور تجسس نے اسے اپنا ہمزاد قابو کرنے کی ترغیب دی تھی، جس کے نتیجے میں وہ چلہ کرنے کے لیے کسی موقعے کی تلاش میں تھا اور آج وہ موقعہ اس کے پاس موجود تھا۔

چلے کے دوران استعمال ہونے والی تمام ضروری چیزیں وہ کافی عرصہ پہلے ہی اکٹھی کر چکا تھا، جب کے طریقے کار کو جزویات سمیت سائیں کریم سے ازبر کر چکا تھا۔ اس وقت بھی وہ چلے کے تمام مراحل کو ذہن میں دہرا رہا تھا، تاکہ کسی بھی غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔

تمام تفصیلات دہرانے کے بعد وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑا ہوا، اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ بہت وسیع تھا کافی سامان ہونے کے باوجود خالی لگ رہا تھا۔ اس نے ایک طرف دیوار میں موجود الماری کھولی اور چلے کے لیے جمع کیا ہوا سامان باہر نکال لیا،

سب سے پہلے اس نے سامان میں موجود ایک چھڑی لی، اور آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھنے لگا، پڑھائی مکمل کرنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور چھڑی پر پھونکیں مارنے کے بعد اس کا ایک سرا فرش پر رکھ کر دائرے کی صورت میں گھومنے لگا، چھڑی کے سرے پر چاک نما کوئی چیز بندھی تھی جس کی وجہ سے فرش پر ایک گہرے سفید رنگ کا دائرہ نمایاں ہو گیا۔ سات چکر مکمل کرنے کے بعد اس نے چھڑی ایک طرف رکھ دی، اور دوسرے سامان کی طرف متوجہ ہو گیا جو دو عدد ڈبے اور ایک کپڑے سے بنا ہوا پتلا تھا، اس نے ایک ڈبے کو کھولا تو وہ سندور سے بھرا ہوا تھا۔ مٹھی بھر سندور لے کر اس نے سفید دائرے کی لکیر پر ڈھیری لگا دی اور پھر اسی طرح مکمل دائرے پر مزید چھ ڈھیریاں لگانے کے بعد دوسرا ڈبہ

کھول لیا جو سوئیوں سے بھرا ہوا تھا، اس نے ایک بار پھر پڑھائی شروع کر دی، اس بار اس کی آواز بلند تھی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بنگالی زبان میں کوئی منتر پڑھ رہا ہو، اسی دوران وہ سوئیاں اٹھا کر پتلے کے جسم میں لگانے لگا۔ سوئی کو پتلے میں لگانے سے پہلے وہ اس پر پھونک مار رہا تھا، کچھ ہی دیر میں سارا پتلا سوئیوں سے بھر گیا، تو اس نے پتلے کو ایک سندور کی ڈھیری پر رکھ دیا اور پھر ایک سوئی ہاتھ میں لے کر ہاتھ کو سر سے بلند کر لیا۔

وہ مسلسل ہذیانی انداز میں منتر پڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپنے لگی تھی، پھر اس نے اچانک ہی اپنی گردن پر چٹکی بھر کر کھال کو آگے کی طرف کھینچا اور دوسرے ہاتھ میں موجود سوئی کو کھال کے آر پار پرو دیا۔ اس عمل سے اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار ابھرے مگر کچھ ہی دیر میں وہ نارمل ہو گیا۔ گردن میں جس جگہ سوئی پروئی تھی وہاں سے چند قطرے خون کے نکل کر اس کے گریبان میں جذب ہو گئے۔

وہ منتر پڑھتے ہوئے دائرے میں داخل ہونے لگا، اس سے پہلے کہ وہ پاؤں کو دائرے کے اندر رکھتا، اسی لمحے کسی نے فارم ہاؤس کے بیرونی گیٹ کو پاگلوں کی طرح اندھا دھند کھٹکھٹانا شروع کر دیا، تو اس کا پاؤں وہیں ہوا میں معلق ہو گیا، اس کے ہونٹ جو کچھ دیر پہلے تیزی سے حرکت کر رہے تھے ایک دم ساکت ہو گئے۔

اس وقت کون آ گیا اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کی جبکہ چہرے پر بیزاری اور جھنجھلاہٹ کے آثار ابھر آئے تھے۔

دفع کرو جو کوئی بھی ہو گا خود ہی واپس چلا جائے گا تم اپنا چلّہ مکمل کرو۔ اس کے ذہن میں خیال ابھرا، مگر پھر اس کا خیال اپنے بھائیوں کی طرف چلا گیا اگر ان میں سے کوئی ہوا تو وہ کسی صورت واپس نہیں جائیں گے، بلکہ گیٹ نہ کھلنے پر تو وہ دیوار پھلانگ کر اندر آ جائیں گے، اس صورت میں تو چلّے کا ستیاناس ہو جائے گا۔

یہ سوچ کر اس نے دائرے کے اوپر ہوا میں معلق اپنا پاؤں واپس کھینچ لیا، اور کھونٹی پر سے مفلر اتار کر گردن کے گرد لپیٹتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا، اس دوران گیٹ مسلسل کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔

بارش پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو چکی تھی جبکہ بادلوں نے دن میں ہی رات کا سماں باندھ دیا تھا۔

دوسری منزل کے برآمدے سے صحن اور گیٹ نظر تو آ رہا تھا، مگر گیٹ کے دوسری طرف کون تھا وہاں سے نظر نہیں آ رہا تھا، اس نے ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی چھتری اٹھا لی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اسی لمحے اسے سائیں کریم کی بتائی ہوئی احتیاطی تدابیر یاد آنے لگی کہ جب چلّہ کرنے لگو گے تو ہمزاد تمہیں مختلف طریقوں سے روکنے کی کوشش کرے گا خاص طور پر خوبصورت عورت کی شکل میں تمہیں بہکانے یا خونخوار شیر کی شکل میں تم پر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن تم ان سے خوفزدہ مت ہونا اور نہ ہی ان کی طرف توجہ کرنا وہ صرف تمہارا چلّہ خراب کرنے کی کوشش کرے گا، جب تم گردن میں سوئی پرو لو اور دائرے میں داخل ہو جاؤ تو پھر کسی بھی صورت چلّہ پورا کیے بغیر باہر مت نکلنا ورنہ تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی، سائیں کریم کی باتیں یاد آتے ہی اس کے قدم وہیں رک گئے۔

کہیں یہ ہمزاد کی کوئی چال تو نہیں؟ اس کے دل میں خیال ابھرا، مگر اگلے ہی لمحے ذہن نے اس خیال کی تردید کر دی۔ ابھی تو میں دائرے میں داخل ہی نہیں ہوا تھا۔ اس دلیل بھرے جواب سے اس نے خود کو مطمئن کر لیا اور سیڑھیاں اتر کر صحن میں آ گیا صحن میں پانی کا لیول اس کی پنڈلیوں تک پہنچ چکا تھا، فارم ہاؤس کی کرسی کافی اونچی رکھی گئی تھی، اس میں پانی داخل ہونے کا مطلب تھا کہ اردگرد کے علاقے میں سیلاب آ چکا تھا۔

ابھی اس نے گیٹ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اسے فارم کی اوپر والی منزل سے کسی عورت کے بین کرنے کی آواز سنائی دی، تو خوف

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ’کیا یہ میرا وہم ہے؟‘ اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا، اسی لمحے ایک بار پھر گیٹ زور سے کھڑکا، اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے گیٹ کھولا تو حیرت اور خوف سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

☆.....☆

ماڈرن یونیورسٹی کی بس سرسبز درختوں سے ڈھکی سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔ سڑک کے اطراف میں موجود درخت اس قدر گھنے تھے کہ ان کی شاخیں اوپر سے آپس میں ملی ہوئی تھی، سورج کی روشنی سڑک پر نہیں پہنچ پا رہی تھی جس کی وجہ سے سڑک پر سرنگ کا گمان ہو رہا تھا۔

بس پر معلوماتی اور تفریحی ٹور کا بینر لگا ہوا تھا، یہ ٹور فائنل ایئر کلاس کے فری ہونے پر ترتیب دیا گیا تھا، جو اب لیکچرار خالد صاحب کی نگرانی میں شمالی علاقہ جات کی طرف جا رہا تھا۔ بس کے پیچھے ایک لوڈر گاڑی آ رہی تھی جس میں خیمے اور کھانے پینے کا سامان لوڈ کیا گیا تھا۔

اس وقت بس میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بس کے بوفرز پر فل والیم کے ساتھ ایک آئٹم سونگ چل رہا تھا، شہزاد اور ملائکہ اس گانے پر بس کی دو رویہ سیٹوں کے درمیان تنگ سی جگہ میں پرفارم کر رہے تھے، جبکہ پوری کلاس تالیاں بجا کر ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ اظہر سعید بار بار مخالف رو میں بیٹھی ہوئی عالیہ کو دیکھ رہا تھا، جبکہ وہ جانتے ہوئے بھی انجان بنی ہوئی تھی۔ اظہر اسے پرپوز کر چکا تھا، عالیہ نے انکار کے باوجود وہ اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، اب کچھ دنوں تک ان کی راہیں جدا ہونے والی تھیں۔ وہ ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ ایک بار پھر اسے قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔

گانا ختم ہوتے ہی بس تالیوں اور سیٹیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔

’’سر جی، ہم جنگل سے گزر رہے ہیں۔‘‘ تہمینہ نے حیرت سے تقریباً چیختے ہوئے خالد صاحب کو مخاطب کیا جو ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھے۔ سب لوگ چونک کر کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگے۔ وہ لوگ آئٹم سونگ انجوائے کرنے میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ لوگ جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔

’’سر جی، کیوں نہ کچھ دیر جنگل میں رُکا جائے؟‘‘ اسفند نے تہمینہ کے دل کی ترجمانی کی۔

’’نہیں جنگل بہت گھنا اور خطرناک لگ رہا ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ خالد صاحب نے فیصلہ کن انداز میں دوٹوک جواب دیا۔

’’سر جی! کیا یہ جنگل آنٹی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔‘‘ عالیہ نے معنی خیز انداز میں کہا تو خالد صاحب نے جھینپ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا، جبکہ بس قہقہوں سے گونج اٹھی۔

’’خالد صاحب زندہ باد۔‘‘ فیصل نے اٹھ کر نعرہ لگایا، بس پھر کیا تھا، پوری بس خالد صاحب زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔

’’ان شیطانوں کو سمجھانا میرے بس سے باہر ہے۔‘‘ خالد صاحب نے بے بسی سے کہا تو ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے بس کو مین روڈ سے اتار کر جنگل میں داخل ہونے والے ایک کچے راستے پر اتار لیا۔ کچھ دیر سفر کرنے کے بعد ایک جگہ جنگل قدرے چھدرا نظر آیا تو ڈرائیور نے بس کو اسی کھلی جگہ پر روک لیا۔

کچھ ہی دیر میں اسٹوڈنٹ نے خیمے وغیرہ نصب کرنے شروع کر دیے جبکہ باورچی کھانا پکانے کی تیاری کرنے لگے۔

’’سر جی، کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں چاہئیں۔‘‘ باورچی نے خالد صاحب سے کہا جو ایک کھونٹے سے خیمے کی رسی باندھ رہے تھے، وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

’’ارے بھئی کھانا پکانے کے لیے لوڈر گاڑی میں سلنڈر رکھے تو تھے، پھر لکڑیوں کی کیا ضرورت پڑ گئی۔‘‘ خالد صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

’’سر جی یہاں لکڑیاں وافر ہیں تو کیوں نہ ان سے کام چلا لیا جائے سلنڈر اگلے سفر میں کام آئیں گے۔‘‘ باورچی نے سلنڈر استعمال نا کرنے کی وجہ بتائی۔

''او کے میں کچھ کرتا ہوں۔'' خالد صاحب نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔

''جو لوگ فارغ ہیں وہ اردگرد سے لکڑیاں اکھٹی کر کے لائیں تا کہ کھانا پکایا جا سکے۔'' خالد صاحب نے بلند آواز سے استوڈنٹس سے مخاطب ہو کر کہا۔

جو جوڑے تنہائی کے متلاشی تھے، ان کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے والی بات ہو گئی، سب ادھر اُدھر پھیل گئے۔

''کیا خیال ہے ہم بھی کچھ لکڑیاں اکھٹی کر لائیں۔''

اظہر نے عالیہ کے عقب سے نمودار ہوتے ہوئے کہا۔ وہ ایسے ہی کسی موقعے کی تلاش میں تھا، عالیہ نے معنی خیز انداز میں قریب کھڑی اپنی دوست اقرا کی طرف دیکھا، اور زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے اظہر کے ساتھ قدم بڑھا دیے۔

''آج ہوا کتنی پیاری چل رہی ہے۔'' اظہر نے بات شروع کی۔

''ہاں اور لگ رہا ہے بارش بھی ہو گی۔'' عالیہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے چہرے کے سامنے آتے ہوئے شولڈر کٹ بالوں کو ایک خفیف جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ ادا اظہر کو زخمی کر گئی، وہ ڈینم کی بلو جینز اور لون کی سفید شرٹ میں قیامت ڈھا رہی تھی۔

''اس ٹور کے بعد ہم شاید ہی کبھی دوبارہ مل پائیں۔'' اظہر نے مایوس سے لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا کہیں فارن جا کر جاب کرو گے۔'' عالیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''انجان مت بنو۔'' اظہر نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اس کا نقرئی قہقہہ فضا میں ترنم بکھیر گیا۔

''مسٹر مجنوں حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا میں کئی بار تفصیل سے بتا چکی ہوں کہ میرے گھر والے کسی بھی قیمت پر اپنے اقدار کو پس پشت ڈال کر تمھیں میرا رشتہ نہیں دیں گے، اور اگر ہم کوئی جذباتی فیصلہ کر بھی لیں تو مجھے یقین ہے کہ آنے والا وقت ہمیں غلط ثابت کر دے گا، اس لیے بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے ہم ابھی حقیقت کا ادراک کر لیں۔ ہاں جب کبھی تمہارا دل کرے تو تم سیل فون پر مجھ سے بات کر سکتے ہو یا کبھی ملنا چاہو تو گھر بھی آ سکتے ہو، ہمارے ملنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔''

اس کی باتیں سن کر اظہر کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے، وہ چہل قدمی کرتے ہوئے ایک ڈھلانی مقام تک پہنچ چکے تھے، ڈھلانی جگہ پر سے حد نظر تک جنگل اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نظر آ رہا تھا، ہوا کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے پتوں کی سرسراہٹ نے مسرور کن سماں باندھا ہوا تھا، مگر اظہر کے اندر کا موسم جیسے ایک دم خزاں کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

اس نے ڈھلانی جگہ پر پاؤں رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ عالیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''ہمیں کیمپ سے زیادہ دور نہیں جانا چاہیے اور ویسے بھی اس ڈھلان سے نیچے جنگل کافی گھنا لگ رہا ہے۔'' عالیہ نے عذر تراشتے ہوئے کہا۔

''میں ہوں نا.....!'' اظہر نے ایک ادا سے ایموشنل بلیک میل کیا تو عالیہ نے نا چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ تھام لیا۔

دونوں احتیاط سے اترتے ہوئے نیچے پہنچ گئے یہاں جنگل واقعی بہت زیادہ گھنا تھا۔

''وہ دیکھو کتنے پیارے سیب لگے ہوئے ہیں آؤ اتارتے ہیں۔'' عالیہ نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اظہر بھی اس طرف متوجہ ہو گیا۔ درخت پر سیب اتنی کثرت سے لگے ہوئے تھے کہ شاخیں نیچے تک جھکی ہوئی تھیں،

عالیہ نے ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ سیب توڑنا چاہا ابھی اس کا ہاتھ سیب تک پہنچا ہی تھا کہ کہیں نزدیک ہی سے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ دھاڑ سنتے ہی دونوں کے چہرے خوف سے زرد ہو گئے۔

جیسے ان کے جسموں سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

''گھبراؤ نہیں۔'' اظہر نے عالیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ وہ ہولے ہولے کانپ

رہی تھی۔ ''میرے پیچھے آؤ ہمیں کسی بھی طرح واپس اوپر پہنچنا ہے۔''

''نہیں رک جاؤ ڈھلانی سطح پر درخت کم ہیں اور پھر جب ہم چڑھائی چڑھ رہے ہوں گے تو وہ ہمیں آسانی سے دیکھ لے گا۔'' عالیہ نے اسے روک کر مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہمیں ہمت کر کے اوپر پہنچنا ہی ہو گا ورنہ ہو سکتا ہے ہم یہاں پھنس جائیں۔''

اظہر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا، تو عالیہ کوئی بحث کیے بغیر اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ احتیاط سے چلتے ہوئے ابھی ڈھلانی سطح کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اظہر نے واپس مڑتے ہوئے عالیہ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے نیچے جھکا دیا۔

''پلیز خوف سے چیخ نا مار دینا ورنہ ہمیں موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

اس نے عالیہ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے آہستگی سے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا، اور سامنے سے جھاڑی کو تھوڑا سا ایک طرف کر دیا۔ چند میٹر کے فاصلے پر ایک بہت بڑا ببر شیر کھڑا کسی عفریت کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کے سیدھے کھڑے کان کسی بھی خفیف آواز سننے کے لیے تیار تھے جبکہ دم بھی ایک خاص انداز میں حرکت کر رہی تھی، جیسے اس نے لاشعوری طور پر اپنے قریب موجود شکار کو بھانپ لیا ہو۔ اس پر نظر پڑتے ہی عالیہ سسک اٹھی، اس نے جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا مبادا کہیں منہ سے غیر ارادی طور پر کوئی آواز نہ نکل جائے۔

''ہمیں کہیں چھپ کر اس درندے کے یہاں سے ہٹ جانے کا انتظار کرنا ہو گا۔''

اظہر نے ایک بار پھر سرگوشی کی، اور پھر پیچھے کی جانب کھسکنے لگا۔

''یہ ہم کہاں پھنس گئے۔'' کچھ فاصلہ طے کرتے ہی عالیہ پھٹ پڑی، وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

''پریشان مت ہو وہ جیسے ہی اس جگہ سے ہٹے گا ہم واپس کیمپ پہنچ جائیں گے۔''

اپنے کی حد تک تو وہ اسے دلاسہ دے رہا تھا، مگر وہ خود خوف کی وجہ سے پسینے میں نہا چکا تھا۔

وہ دیکھو شاید کوئی غار ہے، کچھ دیر کے لیے ہم وہاں چھپ سکتے ہیں۔'' عالیہ نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اظہر کی نظریں بھی اسی طرف اٹھ گئیں۔

''ہاں لگ تو غار ہی رہا ہے مگر وہ تو زمین سے خاصا اونچا لگ رہا ہے۔ چلو آؤ دیکھتے ہیں۔'' اظہر نے غار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے ایک بار پھر جنگل شیر کی دھاڑ سے گونج اٹھا تو درختوں پر بیٹھے پرندے تک اڑ گئے۔ اس بار آواز کافی نزدیک سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ اب تک دونوں احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے مگر دھاڑ سنتے ہی انہوں نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھتے ہوئے دوڑ لگا دی۔ غار کے سامنے پہنچ کر پتا چلا کہ وہ تو زمین سے کم از کم پندرہ فٹ اونچائی پر ہے۔

''وہاں تک پہنچنا تو ناممکن ہے۔'' اظہر نے مایوسی سے کہا۔

''اگر ہم اس لکڑی کو اٹھا کر اس کا ایک سرا غار کے دھانے پر رکھ دیں تو پھر اس کے ذریعے اوپر چڑھا جا سکتا ہے۔'' عالیہ نے سانس درست کرتے ہوئے ایک طرف پڑے فٹ بھر موٹے درخت کے تنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اردگرد اور بھی درخت کٹے پڑے تھے، جن کی شاخیں اور جڑیں بھی کٹی ہوئی تھیں، اب وہ صرف تنوں کی صورت میں پڑے تھے، شاید جنگل سے لکڑی چوری کرنے والوں نے انہیں کاٹا تھا اور اب ان کے سوکھنے کے انتظار میں تھے۔

''کہہ تو ٹھیک رہی ہو، آؤ کوشش کرتے ہیں۔''

اظہر نے اس سوکھے ہوئے تنے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ تنا ان کی توقع سے کہیں ہلکا ثابت ہوا، ذرا سی کوشش میں ہی انہوں نے تنے کے ایک سرے کو اٹھا کر غار کے دھانے پر رکھ لیا۔

اس وقت تک ہوا بہت تیز ہو چکی تھی، اور بادلوں نے دن میں ہی شام جیسا اندھیرا برپا کر دیا تھا۔

''چلو جلدی کرو۔'' اظہر نے عالیہ کو تنے پر چڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، تو وہ کانپتی ہوئی

ٹانگوں کے ساتھ تنے پر بیٹھ گئی اور آگے کی طرف کھسکنے لگی، تھوڑی ہی دیر میں وہ غار کے دھانے تک پہنچ گئی، تو اظہر بھی اس کی تقلید میں اوپر چڑھنے لگا۔ ابھی وہ درمیان میں ہی پہنچا تھا کہ اسے عالیہ کے چیخ کر کچھ کہنے کی آواز سنائی دی۔

اظہر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اس طرف دیکھا جس طرف عالیہ اشارہ کر رہی تھی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

شیر کسی عفریت کی طرح دوڑتا ہوا اسی کی طرف آ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس نے بدحواسی میں اوپر چڑھنے کی رفتار بڑھا دی ابھی وہ غار کے دہانے سے کچھ دور تھا، جب دانت نکوستا ہوا شیر قریب پہنچ گیا۔

اور پھر اس نے ایک مخصوص فاصلے سے ایک لمبی جست لگائی تو اظہر کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ جاگتی آنکھوں سے موت کے فرشتے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہا ہو، اس نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں، اور درخت کے تنے سے لپٹ گیا، اسی لمحے ہوا میں اڑتا ہوا شیر اس کے قریب سے گزرا اور اس کا جاندار پنجہ اظہر کے کندھے پر سے گوشت ادھیڑتا چلا گیا، اظہر کے منہ سے ایک کرب میں ڈوبی چیخ برآمد ہوئی، اس حملے سے تناہری طرح ڈول گیا اگر عالیہ ہمت کر کے تنے کو قابو نہ کر لیتی تو یقیناً اب تک اظہر نیچے گر چکا ہوتا۔ اظہر کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے کندھے کو آری سے چیر دیا گیا ہو۔

تکلیف کی شدت سے اس کے ذہن پر اندھیرا چھانے لگا، وہ صرف جینے کی تمنا میں تنے سے چمٹا ہوا تھا۔ ''اظہر پلیز ہمت کرو۔'' اس کی سماعت سے عالیہ کی آواز ٹکرائی تو جیسے اس کے ڈوبتے ذہن کو سہارا مل گیا اس نے اپنے سر کو زور سے چند جھٹکے دیے تو اس کے ذہن پر غالب آنے والا اندھیرا چھٹ گیا۔ اس نے نیچے دیکھا تو شیر ایک بار پھر جھپٹنے کی تیاری کر رہا تھا، اظہر نے اپنے جسم میں موجود تمام توانائی کو اکٹھا کیا اور ایک بار پھر اوپر کی طرف کھسکنے لگا۔

شیر نے دھاڑتے ہوئے دوسرا حملہ کیا تو اس بار وہ فٹ بھر نیچے سے ہی گزر گیا۔

اظہر دھانے کے قریب پہنچا تو عالیہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھامتے ہوئے غار کے اندر کھینچ لیا۔ اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی، اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، جیسے وہ کسی لمبے فاصلے سے دوڑتا ہوا وہاں پہنچا ہو۔

''صرف خراشیں ہیں زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔'' عالیہ نے زخم کا جائزہ لینے کے بعد اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر اس کی شرٹ اتروا کر اسے پٹیوں کی صورت میں پھاڑنے کے بعد کندھے پر مضبوطی سے باندھ دیں، جس سے فوری طور پر بہنے والا خون رک گیا۔

اسی لمحے بجلی زور سے کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، بجلی کڑکنے سے عالیہ کی نظریں غیر ارادی طور پر باہر کی طرف اٹھیں تو اسے غار کے دھانے پر رکھا تناہلتا ہوا محسوس ہوا، اس نے اٹھ کر نیچے جھانکا تو خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔

''کیا ہوا۔'' اظہر نے اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا دیکھ کر پوچھا، اور خود بھی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا، تبھی اس کی نظر تنے پر بیٹھے ہوئے شیر پر پڑی جو خونخوار نظروں سے ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ جس رفتار سے اوپر کی جانب آ رہا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ وہ چند ہی لمحوں میں ان تک پہنچ جائے گا۔

یہ منظر دیکھ کر اظہر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

دونوں نے مل کر غار کے دھانے پر رکھے ہوئے تنے کو دھکیل کر نیچے گرا دیا۔ شیر کسی زخمی درندے کی طرح گھوم پھر کر غراتا ہوا وہیں چکر لگا رہا تھا، اسے اپنے شکار کے ہاتھ سے نکل جانے کا غصہ تھا، تیز ہوتی بارش بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔

''یہ موذی تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔'' اظہر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ تنے کو زور لگا کر دھکیلنے سے اس کے کندھے سے ایک بار پھر خون رسنے لگا تھا۔

''شکر ہے بال بال بچ گئے، ورنہ تو وہ اب تک اوپر آ کر ہماری ہڈیاں بھی چبا چکا ہوتا۔ عالیہ نے پینٹ کی پاکٹ سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا،

''اب یہ کیا مصیبت ہے یہاں سگنل ہی نہیں آ رہے ہیں کیا ہوگا۔'' اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ تو اظہر نے بھی جلدی سے اپنا سیل فون نکال کر دیکھا تو ایک ملی جلی یاس لے کر رہ گیا۔ بارش طوفانی انداز اختیار کر چکی تھی وہ جہاں بیٹھے تھے وہ جگہ بھی بارش کی زد میں آ چکی تھی، وہ مزید پیچھے ہٹ گئے۔ وہ جسے غار سمجھ رہے تھے محض ایک بڑی کھوہ نما جگہ تھی۔

اگلے تین دن وقفے سے بارش ہوتی رہی جب بارش رکتی اور وہ نیچے اترنے کی جستجو کرتے تو شیر کسی بدروح کی طرح سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ عالیہ کا گلابی چہرہ خوف، بھوک اور پیاس کی وجہ سے زرد ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی بارش رکی ہوئی تھی اور شیر حسب معمول غار کے سامنے ٹہل رہا تھا، اور وقفے وقفے سے غار کی طرف بھی دیکھ رہا تھا، عالیہ غار کے دھانے پر کھڑی اس عفریت کو ٹہلتے دیکھ رہی تھی۔

''اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے، جب بارش شروع ہو، اور یہ درندہ کہیں غائب ہو تو ہم نیچے اتر جائیں، پھر جو اللہ کو منظور ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اس نے ایک عزم کے ساتھ اظہر سے کہا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کہاں گم ہیں جناب!'' عالیہ نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے اسے متوجہ کیا تو وہ چونک گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔'' اس نے سوال دہرایا۔

''میں سوچ رہا ہوں یہ موقع تو قدرت کی طرف سے ہمارے لیے تحفہ ہے جبکہ ہم سمجھنے سے ہی قاصر ہیں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

''کک کیا مطلب ہے تمہارا۔'' وہ ایسے تڑپ کر پیچھے ہٹی جیسے اس کے سامنے دیرینہ دوست کی بجائے کوئی زہریلا سانپ پھن پھیلائے بیٹھا ہو۔

''دیکھو عالیہ یہاں سے نکلنے کے بعد چاہے ہم نکلنے والوں میں سے کسی کو اٹھا کر لوگوں کو اپنی پاک دامنی کا یقین دلانا پڑے یا خود ہی بیگانے سب ہمیں مشکوک نظروں سے ہی دیکھیں گے۔ بدنامی ہمارا مقدر بن چکی ہے تو کیوں نہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر ہم زندگی بھر کے لیے ایک ہو جائیں۔'' اس کی آنکھوں میں حوس کی چمک اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی ایسے فیصلے پر پہنچ چکا ہے جہاں سے پلٹنا اس کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ اسی لمحے بجلی زور سے کڑکی تو اس کی گرج دلوں کو دہلا گئی۔ بارش ایک بار پھر منہ زور طوفان کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

عالیہ غیر محسوس انداز میں پیچھے کی طرف ہٹتے ہوئے غار کے دھانے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

''آجاؤ میری بانہوں میں۔'' اظہر نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے خوابیدہ لہجے میں کہا۔

''اس وقت نیچے کھڑے اس درندے اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ تم اس درندے کے ہمزاد لگ رہے ہو۔ اگر تم نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں نیچے کود کر جان دے دوں گی۔'' عالیہ نے بے بسی سے روتے ہوئے اسے دھمکی دی۔

''تو کود جاؤ منع کس نے کیا ہے۔ تین دن سے تمہارا ایک عاشق نیچے کھڑا انتظار کر رہا ہے کسی کے تو کام آ جاؤ۔'' اس نے بے غیرتی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم میرے پاپا کو اچھی طرح جانتے ہو وہ اس ملک کے نامور شخص ہیں۔ جب انہیں یہ سب معلوم ہوگا تو تم جانتے ہو تم پر اور تمہارے گھر والوں پر کیا قیامت ڈھائیں گے۔'' عالیہ نے اظہر کو دھمکانے اور خود کو تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ اس کی بات سن کر اظہر نے زور سے قہقہہ لگایا جس سے کھوہ نما غار گونج اٹھا۔

''بھولی پری اگر تم زندہ رہنا چاہو گی تو میری بتائی ہوئی باتیں ہی تمہارے منہ سے نکلیں گی، ورنہ تمہیں شیر نے کس طرح کھایا، یہ میری زبانی دنیا والوں کو معلوم ہوگا۔'' اظہر نے اپنا شیطانی منصوبہ بتا کر سہمی ہوئی عالیہ پر حملہ کر دیا۔ وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح اپنے بچاؤ میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی، اسی کشمکش میں اچانک ہی اس کا پاؤں غار کے دھانے سے پھسل گیا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گرنے لگی، تو اس نے بچنے کے لیے غیر ارادی طور پر اظہر کا ہاتھ

مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مگر اظہر اس کا وزن نہ سہار سکا اور وہ خود اپنا توازن کھو بیٹھا، جس کے نتیجے میں دونوں قلابازیاں کھاتے ہوئے غار کے دوسری طرف کھائی کی طرف آ گرے۔

اظہر کا سر ایک بڑے پتھر پر لگا جس کی وجہ سے اسے دوسرا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا، مگر ڈھلان پر گرنے کی وجہ سے وہ نیچے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

عالیہ بھی بے اختیاری کے عالم میں قلابازیاں کھاتی ہوئی ڈھلان پر پھسل رہی تھی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کے ہاتھ میں کوئی جھاڑی وغیرہ آ جائے مگر وہ اتنی تیزی سے نیچے کی طرف پھسل رہی تھی کہ جھاڑیاں اور گھاس پھونس اس کے ہاتھوں میں آ آ کر نکل رہے تھے۔

وہ اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہوتی ہوئی نشیب میں موجود تیز رفتار نالے میں جا گری اظہر کا مردہ جسم بھی عین اس کے پیچھے نالے میں آ گرا تھا اس نے ایک نظر اظہر کی طرف دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اظہر کا سر پتھر سے ٹکرا کر کسی تربوز کی طرح پھٹ چکا تھا، وہ ایک بار پانی میں ڈوبنے کے بعد دوبارہ نہیں ابھرا۔

عالیہ نے خود کو پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دیا، وہ تیرا کی جانتی تھی، کچھ فاصلے پر پہنچ کر اس نے واپس ڈھلان کی طرف دیکھا جہاں سے وہ نالے میں گری تھی، تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔

شیر ڈھلان سے نپے تلے قدموں سے نیچے اتر رہا تھا، جبکہ اس کی نظریں عالیہ پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔

پھر جیسے ہی نالہ ایک موڑ گھوما تو شیر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا چند منٹ جنگل میں بہنے کے بعد نالہ جنگل سے باہر نکل آیا۔

عالیہ نے گردن گھما کر اطراف کا جائزہ لیا تو اسے ایک طرف کھیت نظر آئے جو سیلابی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، کھیتوں میں ایک دو منزلہ عمارت نظر آ رہی تھی، شاید وہ کوئی فارم ہاؤس تھا، جبکہ نالہ کچھ فاصلے پر ایک دریا میں ضم ہو رہا تھا۔ فارم ہاؤس دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اسے اپنے بچ نکلنے کی امید نظر آنے لگی۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ نالے سے باہر نکل آئی، اس کی ٹانگ زخمی ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ آ گئی تھی، وہ جیسے تیسے خود کو گھسیٹتی ہوئی فارم ہاؤس کے گیٹ تک پہنچ گئی اور پھر اس نے پاگلوں کی طرح گیٹ کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

اس کو ڈر تھا کہ شیر اس کے پیچھے یہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائے گا۔ شیر کا خیال آتے ہی اس نے ایک بار پھر اندھا دھند گیٹ کو پیٹنا شروع کر دیا۔

☆.....☆

جاوید اپنے سامنے کھڑی ہوئی حور نما لڑکی کو دیکھ کر خوف زدہ ہونے کی حد تک پریشان ہو چکا تھا۔

اس کے ذہن میں سائمن کریم کی باتیں گونجنے لگی کہ تمہارا ہمزاد خوبصورت لڑکی کی شکل میں تمہیں بہکائے گا، یا پھر شیر کی شکل میں تمہیں خوفزدہ کر کے چلہ رکوانے کی کوشش کرے گا۔''

'تو کیا میرا ہمزاد مجھے بہکانے میں کامیاب ہو گیا۔'' اس کے اندر سے سوال اٹھا۔

''اوہ..اوہ ابھی کچھ نہیں بگڑا مجھے ابھی واپس جا کر دائرے میں داخل ہونا ہوگا، ایک بار میں دائرے میں داخل ہو گیا تو پھر یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

اس نے خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے سوچا۔

''بھائی جان میری مدد کریں۔ جنگل میں میرے پیچھے شیر لگ گیا تھا، میں جان بچاتے ہوئے اس طرف آ نکلی ہوں۔ میرے والد اس ملک کے نامور شخص ہیں۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ آپ نے میری مدد کی ہے تو وہ آپ کو بہت سا انعام دیں گے۔ پلیز میری ہیلپ کریں۔'' عالیہ نے نیلے ہونٹوں سے مدد کی درخواست کی۔

''ش...ش..شیر۔'' جاوید کے منہ سے الفاظ ٹکڑوں کی صورت میں نکلے۔

''وہ جنگل میں میرے..پیچھے..'' اس سے پہلے کہ عالیہ بات مکمل کرتی جاوید الٹے پاؤں واپس بھاگا..اس کے ذہن میں یہ بات سوار ہو گئی کہ سائمن کریم

کی تمام باتیں دونوں باتیں سچ ثابت ہو گئی ہیں کہ اس کا ہمزاد لڑکی یا شیر کی شکل میں چلہ مکمل کرنے سے روکے گا۔ اب لڑکی کی شکل میں اس کا ہمزاد اس کے سامنے کھڑا تھا، اس کے حملہ کرنے سے پہلے مجھے دائیں دائرے میں داخل ہونا ہے ورنہ یہ مجھے جان سے مار دے گی، وہ ایک جمپ میں کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا واپس کمرے میں پہنچ گیا اور اندر سے انڈی لگالی اور پھر دائرے میں داخل ہو کر اونچی آواز میں منتر پڑھنے لگا۔ عالیہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ نوجوان اسے دیکھ کر حواس باختہ کیوں ہو گیا تھا، وہ تو اچھا ہوا کہ اس نے گیٹ بند نہیں کیا۔ اس نے ہمت کی اور اندر داخل ہو گئی ایک طرف سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بھی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئی، یہاں ایک کمرے سے اسی نوجوان کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی نامانوس زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔

عالیہ نے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔

''بھائی مجھے لگتا ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے میں بارش رکتے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آپ اتنے خوفزدہ کیوں ہو گئے ہیں؟'' اندر سے کوئی جواب آنے کی بجائے جاوید کی آواز مزید بلند ہو گئی۔ عالیہ عجیب سی کشمکش و پیچ میں پھنس گئی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کیسے سمجھائے کہ وہ کن حالات میں یہاں پہنچی ہے، اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ اٹھایا اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی، شیر کی جاندار دھاڑ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

وہ اندر دروازے کے پیچھے جاوید کے منتر پڑھنے کی آواز بھی پانی انداز اختیار کر گئی۔

عالیہ نے ڈرتے ہوئے ہمت کر کے نیچے جھانکا تو وہ یہاں بھی اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے ابھی باہر آ جائے گا۔ صحن کے درمیان میں کھڑا شیر اپنی آنکھوں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عالیہ کے ہوش اس وقت آیا جب شیر دوڑتا ہو اسیڑھیوں کی طرف گیا۔ اس نے جلدی سے اطراف کا جائزہ لیا تو اسے برآمدے کے آخر میں ایک چھوٹے سے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔

وہ بھاگتی ہوئی اس میں داخل ہو گئی اور دروازے کو اندر سے لاک کر لیا۔

اس کی ٹانگ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

اس نے ایک نظر میں کمرے کا جائزہ لے لیا وہ کچن تھا جس میں کھانے پینے کی چیزیں کافی مقدار میں بھری پڑی تھی اس نے پچھلے تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن اس وقت وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔ وہ بغیر توقف کیے کھڑکی کی طرف بڑھ گئی اور باہر کا جائزہ لینے لگی، اسی لمحے شیر برآمدے میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا وہ کچن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ برآمدے کے درمیان میں موجود کمرے سے آتی آواز سن کر وہیں رک گیا۔ اور پھر دھاڑتے ہوئے اپنے جاندار پنجوں سے دروازے پر حملہ کر دیا کچھ ہی دیر میں اس نے دروازے کے پرخچے اڑا دیے، اور اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ باہر نکلا تو جاوید اس کے مضبوط جبڑوں میں دبا ہوا آخری سانس لے رہا تھا، عالیہ سوائے خوف سے کانپنے اور بے بسی سے دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی جبکہ جاوید کا ہمزاد شیر کی شکل میں اسے ساتھ لیے ہوئے جنگل میں غائب ہو گیا۔

کچھ دیر بعد جب حواس بحال ہوئے تو وہ ڈرتے ڈرتے باہر نکلی اور ہمت کر کے اس کمرے میں چلی گئی جہاں کچھ دیر پہلے جاوید چلہ کر رہا تھا۔ سفید دائرے میں پھیلا خون لوتھڑوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ کمرے میں موجود چیزیں دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ جاوید کن چکروں میں تھا۔

پھر اس کی نظر ایک طرف پڑے ہوئے سیل فون پر پڑی، جو شیر کے حملے کے دوران جاوید کی جیب سے گر گیا تھا۔ عالیہ نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا، اس نے فون چیک کیا تو یہاں سگنل آ رہے تھے سگنلز دیکھ کر اسے لگا کہ جیسے اس کا رابطہ ایک بار پھر زندگی سے ہو گیا ہو۔

☆☆.....☆☆

چھٹی منگنی

سباس گل

اُس دوشیزہ کی داستانِ عجب، جسے اپنوں کا کیا گیا کالا جادو کر گیا مگر.....

جادو، ٹونا، سفلی عمل، تعویذ گنڈے، دھاگے، ہمارے معاشرے میں ایک وبا کی طرح پھیل چکے ہیں۔ لوگ اپنے اچھے کام کے لیے کم ہی عمل کراتے ہوں گے جتنے وہ دوسروں کے کام تمام کرانے کی غرض سے کالا جادو اور تعویذ دھاگے کراتے ہیں۔ نہ خود چین سے جیتے ہیں نہ ہی دوسروں کی زندگیوں میں سکون رہنے دیتے ہیں۔ جادو ٹونے کے تعویذ دھاگے کے قصے میں نے بہت سنے تھے لیکن یہ کہانی جو میں آپ سب کے ساتھ شیئر کر رہی ہوں یہ میری ایک دوست کی کہانی ہے، جو جادو اور تعویذ کے اثرات سے بہت عرصے بڑی مشکل میں رہی آیئے آپ بھی اس کہانی کو پڑھیے۔

صدف اور کشف دو بہنیں تھیں اور دو بھائی تھے امیر اور سفیر۔ والدہ دردانہ شفیق اور والد شفیق احمد مقامی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ کشف اور امیر بڑے تھے۔ دونوں کی شادیاں کردی گئی تھیں مگر دونوں ہی مالی حالات اچانک خراب ہوجانے کے سبب پریشان تھے۔ کشف کے سسرال والوں کو جب تک میکے سے مال ملتا رہا، وہ سسرال میں نوکرانی بن کر دن رات ان کی خدمت میں لگی رہی۔ شوہر کی معمولی سی ملازمت تھی وہ بھی اس کی کام چوری کے سبب جاتی رہی تو کشف کو اس نے تین بچوں سمیت میکے بھیج دیا کہ جب تک اس کو اچھی نوکری نہیں مل جاتی وہ تب تک اپنے ماں باپ کے گھر رہے۔ کشف کو والدین کے گھر آکر شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے اچھے وقتوں میں بیوٹیشن کا کورس کیا تھا اور اب اس ہنر کو استعمال میں لاکر وہ اپنا اور اپنے بچوں کا خرچ اٹھانا چاہتی تھی۔ والدین پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی لہٰذا اس نے والدین سے کچھ رقم لی اور ضروری سامان خرید لائی اور گھر کے ایک کمرے میں ہی بیوٹی پارلر کا کام شروع کردیا۔ صدف بیس سال کی تھی تب سے اس کے رشتے آنا شروع ہوگئے تھے کیونکہ وہ گوری چٹی، دلکش نین نقش کی مالک تھی۔ خوب صورت تھی اسی لیے ہر کوئی اسے اپنی بہو بننے کے چکر میں تھا۔ صدف کے والدین کا معیار بھی خاصا اونچا تھا۔ ہر رشتے میں مین میخ نکال کر اسے رد کردیتے اور اگر کوئی رشتہ انہیں پسند آجاتا منگنی ہو جاتی تو چند ہفتوں یا دو چار مہینوں میں وہ منگنی ختم ہو جایا کرتی۔ یہاں تک کے منگی خالہ نے اپنے بیٹے سے نکاح کرایا اور سال بعد صدف کو خلع لینا پڑا۔ رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی اور خالہ کی ڈیمانڈ بہت زیادہ تھی۔ وہ بنا بری کے رخصت کرانا چاہتی تھیں اور یہ صدف کے والدین کو منظور نہ تھا۔ مزید

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ لڑکا کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ صرف گھر کا سودا سلف لایا کرتا تھا۔ لہٰذا خلع ہوگئی۔ اب تک چار منگنیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ صدف کی وہ بہت زیادہ دلبرداشتہ ہو چکی تھی ہر وقت ٹینشن میں رہا کرتی کیونکہ منگنیاں ٹوٹنے کے پیچھے قریبی رشتے داروں، پھوپو اور تایا کی فیملیز کی کارستانیاں سامنے آیا کرتی تھیں۔ وہ جلتے تھے صدف کی فیملی سے۔ ہمیشہ ہی پھوٹ پڑواتے، جھگڑے کرتے اور جہاں منگنی ہوتی وہاں جا کر صدف کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتے۔ لڑکے والے بدظن ہو جاتے اور منگنی توڑ دیتے، ساتھ ہی صدف کے ارمان اس کے خواب اور اس کا دل بھی۔

صرف یہی نہیں تھا صدف کے ساتھ عجیب وغریب واقعات بھی پیش آتے تھے۔ کبھی اس کے کپڑے کٹے ہوئے ملتے، کبھی بال کٹے ہوئے، کبھی اس کے پینے کا پانی [illegible] جاتا تو کبھی انڈہ فرائی کرنے لگتی تو اس میں [illegible] نکل آتیں۔ کبھی سوتے ہوئے کوئی غیر مرئی [illegible] کا دبانے لگتی تو کمرے کی چیزیں خود بخود اچھلنا شروع ہو جاتیں۔ وہ ڈری سہمی، ڈپریشن کا شکار ہو کے رہ گئی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون کروا رہا ہے بھی گھر والے اس صورت حال سے پریشان اور نالاں تھے۔

مسجد کے مولوی صاحب سے دم والا پانی لاکر گھر کے چاروں کونوں میں بھی چھڑکا گیا۔ تعویذ بھی صدف کو پہنایا گیا اور ایک تعویذ گھر کے بیرونی دروازے کے ماتھے پر چسپاں کیا گیا تھا۔

''صدف! شام کو تیار رہنا، لڑکے والے آرہے ہیں تمہیں منگنی کی انگوٹھی پہنانے۔'' دردانہ نے صدف کو بتایا۔

''مجھے نہیں کرنی یہ منگنی چار منگنیاں ٹوٹ چکی ہیں میری، ہر منگنی نے جب ٹوٹنا ہی ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ منگنی اب کی ہی نہ جائے۔'' صدف نے غصے سے جواب دیا۔

''دماغ خراب ہے تمہارا۔'' دردانہ شفیق غصے میں آتے ہوئے بولیں۔

''نہیں، نصیب خراب ہے میرا۔''

''نصیب کو برا نہیں کہتے لڑکی، اللہ ناراض ہوتا ہے۔''

''اچھا! تو پھر کسے برا کہوں۔ وہ جو میرے ساتھ برا کروا رہے ہیں یقیناً وہ تایا جان اور بڑی پھوپو ہی ہوں گی ناں وہی جلتے ہیں۔ حسد کرتے ہیں ہم سے ان کی اپنی اولاد جو بیکار اور بن بیاہی بیٹھی ہے تو بھلا وہ کیوں چاہنے لگے کہ ان کے چھوٹے بھائی بھاوج کی اولاد خوشگوار زندگی بسر کرے۔ امی پہلے آپ اس جادو ٹونے کا توڑ کروائیں اس کے بعد منگنی کروائیں۔'' صدف نے جلے ہوئے انداز میں کہا۔

''جادو کا توڑ آسان نہیں ہوتا۔ بعد میں منگنی کرانے کے چکر میں اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' دردانہ شفیق نے تیز لہجے میں کہا۔

''نہیں نکلے گا امی! جو میرا نصیب ہوگا وہ نہیں نکلے گا۔''

''اچھا فلسفہ نہیں چاہیے مجھے شام کے لیے اپنے کپڑے نکال کر استری کرلو۔''

''امی! مجھے اب کوئی منگنی نہیں کرنی یہ چوتھی منگنی تھی جو ٹوٹ گئی۔ نکاح آپ کی بہن نے بڑی منت جتا کر منت سماجت کر کے گھر میں دھرنا دے کر کروایا تھا نا اپنے بیٹے کے ساتھ اور پھر چند مہینوں میں ہی وہ کیسے بدل گئی تھیں۔ رکھتیں وہ اپنا نالائق، نکھٹو اور ناہنجار بیٹا اپنے پلو سے باندھ کے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''جو ہونا تھا ہوگیا اب آگے کی سوچو۔''

دردانہ شفیق سنجیدگی سے بولیں۔ اسی وقت گھر کے سارے دروازے، کھڑکیاں اور برتن بجنے لگے۔ بند کھڑکیاں اور دروازے یوں پیچھے کھنچ رہے تھے جیسے کوئی پوری قوت سے انہیں کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پورے گھر میں کچن کے برتنوں کے بجنے کا شور مچا ہوا تھا۔ صدف اور دردانہ شفیق شدید خوف کے عالم میں ڈرائنگ روم میں صوفے پر جا بیٹھیں۔ دردانہ شفیق سر پر دوپٹہ اوڑھتے ہوئے آیۃ الکرسی پڑھنے لگیں۔ بلند آواز میں اور صدف تو خوفزدہ سی صوفے پر دبکی ہوئی حیران ہراساں نظروں سے گھر کی اشیاء کو اِدھر اُدھر بکھرتے، ٹوٹتے دیکھ رہی تھی۔

''اب سوچیں آگے کی..... کرائیں منگنی۔''

صدف نے ہمت کر کے کانپتی آواز میں ماں سے کہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ وہ گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ چند منٹ بعد سارا سلسلہ تھم گیا۔ کھڑکیاں، دروازے ساکت ہو گئے۔ ایک پراسرار اور خوفناک خاموشی پورے گھر میں بکل مارے آن بیٹھی تھی۔ دردانہ شفیق بلند آواز میں آیۃ الکرسی اور چاروں قل سات سات بار پڑھ رہی تھیں اور کچن سے پانی کا گلاس بھر لائی تھیں۔ پانی پڑھ کرنے کے بعد انہوں نے پانی دائیں ہاتھ کی اوک میں لیکر تھوڑا سا صدف پر چھڑکا اور باقی گھر کی دیواروں اور کونوں میں چھڑک دیا۔ یہ سارا عمل نہایت خاموشی سے انجام پایا۔

''مجھے ڈر ہے کہ کہیں تجھ پر کوئی جن تو عاشق نہیں ہوگیا جو تیری منگنی تڑوا دیتا ہے اور اب نئی منگنی کا سن کر غصے میں آکر یہ سب کر رہا ہے۔'' دردانہ شفیق نے فکرمندی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو صدف نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر پریشانی اور بے بسی واضح لکھی نظر آرہی تھی۔

''اب کیا ہوگا امی؟'' وہ خوفزدہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''فکر نہ کرو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ شام کو تمہاری منگنی خیریت سے ہوجائے پھر کچھ کرتی ہوں۔''

''پھر منگنی۔'' صدف نے غصے اور بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''ہاں تو اور کیا ان چیزوں سے ڈر کے بیٹھ جائیں ہم عمر نکلی جارہی ہے تمہاری شادی نہیں کرنی کیا؟'' دردانہ شفیق نے تند لہجے میں کہا تو وہ تلخی سے بولی۔

''آپ کو عمر کی فکر ہے اور مجھے ڈر ہے کہ میری سانس ہی نہ نکل جائے ان حالات میں پھر کرتی رہیے گا منگنی۔''

''اچھا فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے چیزیں سمیٹو یہاں سے شام کو مہمان آنے والے ہیں اور اس کم بخت جن نے سارے گھر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔'' دردانہ شفیق نے نیچے جھک کر گلدان اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ فکرمندی سے بولی۔

''امی! اگر یہ کارروائی مہمانوں کی آمد پر دوبارہ ہوگئی تو سوچیں کیا ہوگا؟ وہ لوگ تو ڈر کے یہاں سے بھاگیں گے ہی لیکن سارے شہر میں اعلان کرا دیں گے کہ اس گھر میں جن بھوتوں کا ڈیرا ہے یا آسیب ہے پھر اس گھر کا رخ

''ہاں لڑکے گانہ ہی کبھی میرا کوئی رشتہ آئے گا۔''

''ائے ہائے اللہ نہ کرے، اچھا سوچو اور اچھا بولو اللہ ...ے گا۔'' دردانہ شفیق نے تڑپ کر کہا اور وہ بے ... بکھری ٹوٹی پھوٹی چیزیں سمیٹنے لگی۔

☆.....☆

صدف کی یہ پانچویں منگنی تھی جو غیر خاندان میں ہوئی تھی اور خیر و عافیت سے ہوگئی۔ کسی جادو ٹونے، جن بونے کی کوئی کارستانی نہیں ہوئی تھی۔ اس سادہ سی تقریب کے دوران صدف نے ایک بار پھر امید کی ڈور تھام لی تھی اور خوابوں کے در کھول لیے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اپنے آپ آن بسی تھی۔ نئی امید، نئی آس، نئے سپنے آنکھوں میں سجائے وہ خوشی خوشی نیند کی وادی میں سیر کرنے لگی۔ ابھی اسے سوئے ہوئے بمشکل آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی ایک بار دو بار صدف کی آنکھ نہ کھلی، تیسری بار مسلسل تیزی سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی جلدی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ آن کیا۔

''صدف! صدف اٹھو صدف۔'' اب دروازے پر دستک بند ہوگئی تھی اور نسوانی آواز صدف کو پکار رہی تھی۔ یہ آواز کشف کی تھی۔ صدف نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی رات کے ڈھائی بج رہے تھے اسے تشویش ہونے لگی کہ رات کے اس پہر کشف باجی کو کیا کام پڑ گیا اس سے؟''

''کیا ہوا باجی؟'' صدف نے وہیں سے پوچھا۔

''صدف دروازہ کھولو۔'' کشف کی آواز دوبارہ اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے جلدی سے بستر چھوڑا، پاؤں میں چپل پہنے۔ دوپٹہ شانوں پر پھیلایا اور تیزی سے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

کشف کی آواز میں درد شامل ہوگیا تھا۔ وہ مسلسل صدف کو آوازیں دے رہی تھی۔ صدف کمرے سے باہر آئی برآمدے کی لائٹ آن کی تو اس سے ملحق صحن بھی روشنی میں نہا گیا جہاں کشف تکلیف دہ حالت میں ... سنبھالی دی۔ دھند اور کہر کی خوشبو سردی کے ساتھ اٹھلا رہی تھی۔ خنک ہوا نے اس کے وجود کو ... لرزا دیا۔ وہ جلدی اور گھبراہٹ میں شال ... بھول گئی تھی مگر اس سرد رات میں جو منظر اس کے سامنے تھے وہ اس کے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھا۔ کشف کے بائیں ہاتھ سے بہت زیادہ خون بہہ رہا تھا اور صحن کے فرش پر ٹپ ٹپ کر کے گر رہا تھا۔ کشف کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''صدف! میرا ہاتھ کٹ گیا ہے۔ میرے ہاتھ پر پٹی باندھ دو۔'' کشف نے صدف کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''باجی! آپ صحن میں اتنی سردی میں کیا کر رہی ہیں، اندر کمرے میں آئیں میں امی کو بلاتی ہوں۔''

''امی! امی جان جلدی سے آئیں دیکھیں باجی کو کیا ہوا؟''

صدف نے اسے دیکھتے ہوئے تیزی سے بلند آواز میں کہا اور امی کو آواز دی وہ بھی گھبرا کر کمرے میں سے باہر نکل آئیں۔

''امی! کو کیوں بلا رہی ہو؟ تم میرے پٹی کر دو ورنہ میرا سارا خون بہہ جائے گا۔'' کشف کی آواز میں اس بار بھری پن اور غصہ تھا۔ صدف اس کے قریب پہنچ کر اس کی حالت دیکھ کر مزید ڈر گئی اور پریشانی بھی بڑھ گئی تھی اس کی۔

''کشف! یا اللہ رحم کر۔ یہ کیا ہوا ہے تمہیں کشف آدھی رات کو تم یہاں کیا کر رہی ہو اور یہ خون۔''

دردانہ شفیق نے کشف کا خون سے لت پت ہاتھ دیکھا تو وہ گھبرا گئیں۔ اتنے میں شفیق احمد، امیر اور سفیر بھی اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے تھے اور امیر کی بیوی لبنیٰ بھی آنکھیں ملتی ہوئی وہاں آگئی۔

''تم سب کیوں آئے ہو؟ تمہیں یہاں کس نے بلایا ہے؟'' کشف کی آواز خوفناک ہوتی جارہی تھی اور عصیلی بھی ان سب کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ فضا یکدم سے پراسرار ہوگئی تھی۔

''کشف! یہ کیا پاگل پن ہے چلو اندر آؤ۔''

امیر جو سب سے بڑا بیٹا تھا گھر کا اسے دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔ صدف جو گہری نظروں سے کشف کا جائزہ لے رہی تھی یکا یک الٹے قدموں واپس جانے لگی اور سورت الناس پڑھنے لگی۔

''میں سب کا خون پی جاؤں گی۔'' کشف کی آواز بلند اور خوفناک تھی۔ سب ڈر گئے سب کا دھیان جادو ٹونے

کی طرف گیا تھا۔

''خون تو تم ویسے بھی پی رہی ہو سب کا، دو سال سے میکے آ کے بیٹھی ہو بچوں سمیت اب رات کو یہ تماشے ہوں گے اچھا طریقہ ہے گھر والوں کی توجہ حاصل کرنے کا۔''

لبنیٰ بھابی نے تیز اور غصیلے لہجے میں کہا تو ان کے پیچھے سے لبنیٰ کی آواز آئی۔

''بھابی! کوئی وقت تو دیکھ لیا کرو طعنے دینے کا اور میں کسی پر بوجھ نہیں بنی بیٹھی اپنا اور اپنے بچوں کا خرچ خود اٹھاتی ہوں تمہارا دیا نہیں کھاتی۔''

''کک..... کشف..... تت..... تم یہاں ہو تو..... وہاں کون ہے؟'' سب نے کشف کی آواز پیچھے سے سنی تو گردن گھما کر دیکھتے ہوئے لبنیٰ نے خوفزدہ ہو کر سوال کیا۔ ''کشف کا بھوت ہاہاہا۔''

صحن میں کھڑی کشف دراصل ہوائی مخلوق تھی جو کشف کا روپ دھار کر وہاں آئی تھی۔ لبنیٰ کے سوال کا جواب کیا دیا تھا اس نے سب کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ لبنیٰ تو ڈر سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ دردانہ شفیق نے جلدی سے صحن کی لائٹ کا بٹن آن کر دیا۔ وہ بدروح خوفناک ہنسی کے ساتھ چند لمحوں میں منظر سے غائب ہو گئی تھی مگر اپنے پیچھے ایک ڈر، خوف اور عدم تحفظ کا احساس چھوڑ گئی تھی۔ صحن میں خون کے قطروں کی لائن دیکھ کر سبھی خوفزدہ اور پریشان ہو گئے تھے۔ صدف تو آنکھیں بند کیے مسلسل درود پاک اور چاروں قل، آیۃ الکرسی پڑھ رہی تھی۔ سب ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے اور سارے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ لبنیٰ کو ہوش آ گیا تھا مگر وہ بھی بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ وہ خوفناک بدروح یا چڑیل اسے اپنے آس پاس محسوس ہو رہی تھی۔

''دیکھ لیا صدف کا بوائے فرینڈ؟ ہو گئی تمہاری تسلی، پکڑ لیا اسے رنگے ہاتھوں؟ بڑی کہتی تھیں بلکہ الزام لگاتی تھیں ناں میری بہن پر کہ وہ راتوں کو اٹھ کر کسی سے چھپ کر ملتی ہے اب دیکھا اپنی آنکھوں سے کہ وہ کس کے بلانے پر اپنے کمرے سے باہر نکلتی ہے اور کس سے ملتی ہے؟ پڑ گئی ٹھنڈ تمہارے کلیجے میں؟''

امیر نے لبنیٰ کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرمندگی سے پانی پانی ہو گئی۔ صدف کو ایک بار پہلے بھی ایک نامانوس آواز نے پکارا تھا۔ آدھی رات کو اور وہ آواز کے تعاقب میں اپنے کمرے سے نکل کر صحن سے ملحق سیڑھیوں تک آ گئی اور لبنیٰ بھابی نے اتفاق سے اسے وہاں جاتے دیکھ لیا تھا اور صبح اٹھتے ہی سب گھر والوں کے سامنے اس پر الزام دھر دیا تھا کہ صدف نے اپنے بوائے فرینڈ کو گھر بلایا تھا ملنے کے لیے۔ صدف نے سچ پر اس وقت کسی نے یقین نہیں کیا تھا سب کے دل میں اس کے لیے شک سا بیٹھ گیا تھا سوائے دردانہ شفیق کے کیونکہ اس کے ساتھ ہونے والے عجیب و غریب سے وہ سب سے زیادہ واقف تھیں۔

''دیکھ لیا منگنی کا نتیجہ، میں نے کہا بھی تھا کہ مت کریں منگنی اور آپ نے تو رشتے داروں کو مٹھائی بھی فوراً بھجوا دی۔ جانتے ہوئے بھی کہ ان کو کوئی خوشی نہیں ہو گی۔ الٹا حسد ہی کریں گے۔ وہ تو اور دعا کریں گے کہ یہ منگنی بھی جلد ٹوٹ جائے۔'' صدف نے دردانہ شفیق کو دیکھتے ہوئے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا تو شفیق احمد نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''صدف! تم اپنی پھوپو اور تایا تائی پر شک کر رہی ہو۔ یہ بہت غلط بات ہے بھلا وہ کیوں تم سے جلنے لگے؟''

''ابو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کیوں جلتے ہیں اور میں ان پر شک نہیں کر رہی بلکہ یقین سے کہہ رہی ہوں کیونکہ انہیں تعویذ دھاگے کرانے کی بہت عادت ہے اور تو اور میری ایک دوست نے انہیں ہندوؤں کی بستی میں کالے جادو کرانے والے ہندو عامل کے پاس بھی دیکھا تھا وہ وہاں اپنے بھتیجی کے سلسلے میں گئی تھی۔ دو بار اور دونوں بار تائی اور پھوپو کو وہاں دیکھا تھا اس نے۔ آپ ہی بتائیں ابو کہ ان کا ہندو عامل سے کیا کام ہے جو وہ وہاں اس سے ملنے گئیں؟'' صدف نہایت سنجیدگی سے بولی۔

''ان کے اپنے گھر کے مسئلے کم ہیں کیا؟ ان کے گھروں میں بیٹیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ گئی ہوں گی ان کی شادی کے لیے کوئی تعویذ لینے۔ تم کیا کوئی مس ورلڈ یا حور پری ہو جو وہ تم سے جلیں گی جادو ٹونے کرائیں گی تم پر؟''

شفیق احمد نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے تیز اور درشت لہجے میں کہا تو وہ خاموش رہی مگر دردانہ شفیق نے سلگ کر کہا۔

''کچھ تو خیال کریں ماسٹر صاحب! بیٹی سے کوئی ایسے بات کرتا ہے۔ اور کیا غلط کہا صدف نے؟ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے اس کی تائی، پھوپو دونوں سے کبھی ہمارے گھر کا ملہ اطمینان اور خوشی ہضم نہیں ہوئی۔ ان کی اپنی بیٹیوں کا رشتہ نہیں ہو رہا لہٰذا وہ ہماری بیٹی کے راستے میں بھی رکاٹیں ڈال رہی ہیں۔ جادو ٹونے کروا کے اور یاد رکھیے ماسٹر صاحب اگر آپ کی بیٹی اور بھاوج یہ سب کروا رہی ہیں ناں تو گناہ کما رہی ہیں کالے جادو کرانے والا بھی کافر ہوتا ہے اور کرنے والا بھی۔ اپنے ایمان کو خراب کر رہی ہیں اور ہماری بیٹی کی زندگی کو بھی۔''

''کچھ نہیں ہو گا ہماری بیٹی کی زندگی کو۔ بعض جگہوں پر ایسی ہوائی چیزیں بسیرا کر لیتی ہیں۔ ہم یہ مکان ہی بدل لیں گے۔ بیچ دیں گے اس مکان کو یا کرائے پر دے دیں گے۔ خود کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔'' شفیق احمد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ہم مکان کیوں بیچیں؟ اس مسئلے کا حل کیوں نہ نکالیں، جادو ہے تو اس کا توڑ بھی ہو گا نا؟ خوامخواہ مکان بیچ دیں۔''

دردانہ نے غصے سے کہا اور وہاں سے اٹھ گئیں۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ صدف بھی وضو کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

صدف فون پر اپنی گہری دوست رابعہ سے بات کر رہی تھی۔ اس کی کسی بات پر اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی تو افشاں جو اس کے تایا رفیق احمد کی بیٹی تھی ستائیس برس کی ہونے کے باوجود کنواری تھی، بہت ہی تک چڑی اور بدمزاج، حاسد قسم کی لڑکی تھی وہ سامنے سے چلی آئی۔ اسے دیکھتے ہی صدف نے رابعہ کو خدا حافظ کہا اور رابعہ سے مصافحہ کیا۔

''بڑی خوشی ہے تمہیں منگنی کی۔'' افشاں نے اسے دیکھتے ہی کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہر لڑکی کو ہوتی ہے۔''

''خیر ہر لڑکی کو نہیں ہوتی جس کی من پسند من چاہی منگنی ہوا سے ہوتی ہے۔'' افشاں نے اسے گہری اور کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' صدف نے مٹر والا شاپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''چلو مان لیتی ہوں تمہاری پہلے چار منگنیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ پھر بھی ایک اور منگنی ہو گئی تمہارا خوش ہونا تو بنتا ہے کزن۔''

افشاں کی طنزیہ مسکراہٹ اور حاسدانہ طنزیہ لہجہ صدف کو برا نہیں لگا اس بار کیونکہ وہ اس کی عادت سے واقف ہو چکی تھی۔

''تم بتاؤ تمہاری منگنی شادی کا کیا سین ہے کزن؟''

صدف نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی میں تو ڈائریکٹ شادی کرواؤں گی یہ منگنی ونگنی پر مجھے یقین نہیں ہے آج کی، کل ٹوٹ گئی اس سے زیادہ دن تو کانچ کا گلاس چل جاتا ہے، اتنے دن تمہاری منگنی نہیں چلتی۔'' افشاں نے بے نیازی سے کہتے ہوئے اس پر طنز کیا تو وہ بولی۔

''یہ سب تو نصیب کی بات ہے افشاں ڈیئر، جس کے ساتھ میرا نصیب لکھا ہو گا میری شادی اسی کے ساتھ ہو گی۔''

''ہاں اگر ہوئی تو۔''

''کیوں؟''

''اب دیکھو نا، اتنی منگنیاں ٹوٹی ہیں تمہاری ایک نکاح سے خلع لیا ہے تم نے وہ بھی رخصتی سے پہلے تم خود ہی بتاؤ ایسی لڑکی کو کون بیاہنے آئے گا؟ تمہارا کردار تو داغدار اور مشکوک ہو گیا ہے ان ٹوٹی منگنیوں اور خلع کی وجہ سے۔ تم لاکھ صفائیاں دیتی پھرو، لوگ تھوڑا یقین کریں گے تمہاری بے گناہی اور معصومیت کا اور اس بات کا کہ یہ سب جادو ٹونے یا تعویذ دھاگے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اکیسویں صدی میں ایسی باتوں پر کون یقین کرتا ہے صدف ڈیئر۔'' افشاں نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''سب یقین کرتے ہیں سوائے ان کے جو یقین کرنا نہیں چاہتے جو خود یہ کالے جادو اور تعویذ کرواتے ہیں اور دوسروں کے سامنے معصوم اور ان کے ہمدرد بنے رہتے ہیں، ان کا دھیان اصل حقیقت سے ہٹانے کے لیے انکار کرتے ہیں اور اِدھر اُدھر کے قصے لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

صدف نے نہایت سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

''ارے کزن! تم تو ناراض ہی ہوگئیں، اچھا بھئی مان لیا کہ تم پر کسی نے جادو ٹونہ کرایا ہے، تعویذ کرائے ہیں جبھی تمہاری ہر منگنی ٹوٹ جاتی ہے، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کون ہے جسے تمہاری منگنی سے، رشتہ طے ہو جانے سے تکلیف ہے؟ مانا کہ تم بہت حسین ہو پر اتنی بھی نہیں کہ کوئی تمہاری اتنی منگنیاں تڑوائے تم پر جادو ٹونا کروائے کہ تم کسی کی ہو نہ سکو کوئی پاگل چاہنے والا ہوگا شاید۔''

''کوئی چاہت میں نہیں کراتا جادو ٹونہ، نفرت اور حسد میں ہی کرواتے ہیں لوگ یہ سب۔ وہ نہ تو خود خوش رہتے ہیں نہ ہی ان سے دوسروں کی یا اپنوں کی خوشی دیکھی جاتی ہے یونو، کالا جادو کرنے اور کرانے والے دونوں دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ کافر ہو جاتے ہیں۔ صرف صاحبِ ایمان بچتا ہے ان فضولیات، عملیات سے جن کے ایمان کمزور ہوں دل حسد و بغض سے بھرے ہوں وہ جلدی اس چکر میں پڑتے ہیں اور جادو ٹونا کروا کے اپنا دین ایمان سب گنوا بیٹھتے ہیں، کافر کہلاتے ہیں ایسے لوگ۔ بخشش نہیں ہوتی ایسے لوگوں کی۔''

''کیا واقعی؟'' افشاں نے سنجیدہ اور متفکر لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! اسی لیے میں مطمئن ہوں کہ یہ سب جو کوئی بھی کرتا کراتا ہے وہ اپنے لیے جہنم کی آگ اور قبر کا عذاب جمع کر رہا ہے۔'' صدف نے سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا میں چلتی ہوں، ایک بار پھر منگنی مبارک ہو اب شادی اسی منگیتر سے کرنا کہیں کل کو پتا چلے کہ یہ منگنی بھی ٹوٹ گئی۔'' افشاں نے جانے کے لیے پر تولتے ہوئے طنز سے کہا۔

''اللہ جو کرے گا بہتر کرے گا میرے لیے۔''

''لو تم لوگوں نے یہ بتا رکھا ہے ہمیں کہ تم پر کوئی جادو ٹونا کروا رہا ہے۔'' افشاں نے بدک کر کہا۔

''بہتری اور خیر ہمیشہ اللہ کی طرف سے آتی ہے اور برائی ہمیشہ بندوں کے برے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔''

صدف نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اچھا بھئی، میں تو چلی تم بھی چکر لگا لینا ہماری طرف ہمارا پوچھ رہی تھیں۔'' افشاں نے جاتے جاتے کہا۔

''تائی جان کو میرا اسلام کہنا اور تایا کو بھی۔''

''کہہ دوں گی۔ خدا حافظ۔''

افشاں مصنوعی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

''تم پر کسی نے کالا جادو کروایا ہے۔'' رابعہ نے اسے ٹیکسٹ کیا۔

''کالا ہو یا نیلا، پیلا..... میں نے بھی سوچ لیا ہے اس کا توڑ کروا کے رہوں گی الٹا نہ پڑوا دیا جادو کروانے والوں پر تو میرا نام بھی صدف شفیق نہیں۔ میں ایسے ڈر ڈر کر نہیں جی سکتی رابی۔''

صدف نے اس کے ٹیکسٹ کا جواب لکھ کر بھیج دیا۔

☆.....☆

''امی! اپنی صدف پر تو جن عاشق ہو گیا ہے جبھی تو کہیں اس کا رشتہ نہیں ہونے دے رہا۔ منگنیاں ٹوٹنے کا ریکارڈ توڑ دیا ہے اس نے تو۔'' لبنیٰ نے سبزی کاٹتے ہوئے ساس دردانہ شفیق سے کہا۔

''مولوی صاحب کہہ رہے تھے کالا جادو ہے جس نے کیا ہے وہی اس کا توڑ بتا سکتا ہے۔'' دردانہ شفیق بولیں۔

''اور توڑ کے چکر میں یہ مولوی، عامل، بابا ٹائپ لوگ ہزاروں، لاکھوں بٹور لیتے ہیں آپ جیسے لوگوں سے، مرض پھر بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ سیدھا سیدھا جناتی کیس لگ رہا ہے اور افشاں نے اس کے آس پاس جن کو دیکھا بھی ہے۔''

''کمال ہے پھر بھی اسے کچھ نہیں ہوا، اتنی بہادر وہ کب سے ہوگئی؟''

دردانہ شفیق نے لبنیٰ کی باتیں سن کر کہا تو وہ کھسیانی سی ہوگئی۔

''حیرت کی بات ہے لوگوں کو ''جن'' نظر آ جاتا ہے۔ ''خدا'' نظر نہیں آتا۔'' صدف نے مسکراتے ہوئے لبنیٰ بھابی کو دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا تو وہ خجل سی ہو کر سبزی اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

''صدف! چھت پر سے کپڑے اتار لا، سوکھ گئے ہوں گے۔''

دردانہ شفیق نے وضو کرتے ہوئے صدف کو آواز دے کر کہا۔

''اچھا امی لاتی ہوں۔'' وہ کتاب تخت پر رکھ کر ننگے پاؤں ہی اٹھ کر چھت پر چلی آئی۔

یکایک تیز ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ وہ الگنی پر سے کپڑے اتارنے لگی تھی کہ کپڑے اڑ اڑ کر صحن میں یہاں وہاں اڑنے لگے وہ ایک کپڑا اٹھاتی تو دوسرا دور اڑ جاتا۔ فضا میں عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ صدف کو اپنے پاؤں بھیگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ کپڑے سنبھالنے کی کوشش میں اس نے پاؤں کی طرف دھیان نہ دیا۔ ہوائیں تیز ہوتی چلی گئیں۔ عجیب پراسراریت تھی فضا میں، ہوائیں چیخ رہی تھی اور بادلوں میں ایکدم سے گرج چمک پیدا ہوگئی تھی۔ صدف جلدی جلدی کپڑے سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک نادیدہ قوت نے ٹھنڈا یخ پانی صدف کی کمر پر پھینکا تھا۔ صدف بے اختیار چیخی تھی اور خوفزدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا صرف ایک مردانہ قمیض ہوا میں اس کی آنکھوں کے عین سامنے رقص کر رہی تھی۔ وہ زور زور سے چیخنے لگی ہاتھوں میں موجود کپڑے اب اس کے پاؤں میں پڑے تھے وہ خوف کے مارے سرد اور پیلی پڑ چکی تھی۔

''ص..... ص..... د..... ف.....''

اس مردانہ قمیض میں آواز آئی تو صدف کا تو جیسے سانس ہی اٹک گیا اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو گیلے پاؤں میں الجھے اور وہ نیچے گر گئی۔ نیچے گرنے پر اس کی نظر اپنے پاؤں پر پڑی تو خون دیکھ کر اس کی چیخیں مزید بلند ہوگئیں۔

''صدف..... صدف..... کیا ہوا صدف؟ ہاہاہا''

رقص کرتی سفید قمیض میں سے آواز آ رہی تھی۔ بہت ہی بھاری خوفناک آواز تھی۔ صدف ایک بیمار، زخمی اور ملگجی چڑیا کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی اس نے خوفزدہ نگاہوں سے صحن میں دیکھا جہاں وہ چل کر گئی تھی وہاں اس کے پاؤں کے نشان موجود تھے۔ وہ اگر یہ سب محسوس نہ کر رہی ہوتی تو کہہ سکتی تھی کہ یہ کسی ڈراؤنی فلم کا بہت ہی ہولناک منظر تھا۔

اس کی چیخیں سن کر سب گھر والے چھت پر پہنچے تو وہاں کا منظر ان سب کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ صدف خوف سے بے ہوش ہوگئی تھی اور آن کی آن میں فضا پہلے کی طرح نارمل ہوگئی تھی۔ صدف کو اس کے کمرے میں لا کر لٹا دیا گیا۔ دردانہ شفیق اس کے خون میں لت پت پاؤں ٹب میں لٹکا کر دھو رہی تھیں۔ خوف سب کے چہروں پر ہویدا تھا۔ شفیق احمد قرآنی آیات کا ورد کر رہے تھے۔

☆.....☆

''سنیں میں تو اپنے میکے جا رہی ہوں۔ میں ان حالات میں یہاں نہیں رہ سکتی۔'' لبنیٰ نے ڈرتے ڈرتے مدھم آواز میں امیر احمد سے کہا تو وہ تاسف زدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم ان حالات میں ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤ گی جب کہ تمہیں تو ہمارا، صدف کا ساتھ دینا چاہیے۔''

''دیکھیں میاں جی! سسرال چھوڑ کر جانا، دنیا چھوڑ کر جانے سے زیادہ بہتر ہے میں اس خوفزدہ ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ بچوں کے ذہنوں پر بھی برا اثر پڑے گا ان کے دل میں خوف بیٹھ جائے گا۔ یہ صدف بے چاری کا حوصلہ ہے کہ سب جھیل رہی ہے اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔''

لبنیٰ نے سنجیدگی سے کہا تو امیر احمد کو بھی اپنے بچوں کی فکر ہونے لگی۔ وہ ابھی تین چار سال کے تھے خدانخواستہ اگر انہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو..... اس سے آگے وہ بھی نہ سوچ سکا۔

''آمین۔'' امیر احمد بولا۔

''آپ لوگ کوئی توڑ کروائیں کسی مولوی، مفتی، اللہ والے سے صدف کا مسئلہ حل کرائیں یہ جادو ٹونا، تعویذ دھاگہ، جن چڑیل، بھوت پریت جو بھی ہے اس کا توڑ تو کرنا ہوگا نا؟ صدف ساری زندگی ایسے ڈر ڈر کر تو نہیں مر سکتی نا۔ آپ کسی عالم سے بات کریں جب یہ مسئلے حل ہو جائیں گے تو میں بچوں کو لے کر واپس آ جاؤں گی تب تک میکے ہی میں رہوں گی۔'' لبنیٰ سنجیدگی سے بولی۔

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔''

امیر احمد نے ہار مان کر گہرا تھکا ہوا سانس لبوں سے خارج کرتے ہوئے کہا تو فوراً اپنا اور بچوں کا سامان پیک کرنے چل دی۔ صدف کے تایا رفیق احمد اور تائی شکیلہ رفیق اگلے دن صدف کی ہونے والی سسرال پہنچ گئے۔ اپنا

تعارف کرایا تو ان لوگوں نے ان دونوں کا بہت عزت دی، چائے پلائی۔

''کتنے بچے ہیں آپ کے؟'' صدف کی ہونے والی ساس نے سوال کیا۔

''ہمارے ماشاءاللہ دو بیٹے ہیں، تین بیٹیاں ہیں اور بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے خیر سے بیٹے بھی جاب کر رہے ہیں۔''

''اچھا ماشاءاللہ، شادی شدہ ہیں بیٹے؟'' انہوں نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں، لڑکی دیکھ رہے ہیں انشاءاللہ جلد ہی دونوں بیٹوں کے سر پر سہرا سجائیں گے۔'' رفیق احمد نے فوراً جواب دیا۔

''آپ سوچ رہی ہوں گی کہ ہم نے اپنی بھتیجی صدف کو اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک کے لیے پسند کیوں نہیں کیا؟ اس کا رشتہ کیوں نہیں مانگا؟''

شکیلہ رفیق نے اصل بات کو زبان دی۔

''بہن یہ تو نصیب کی بات ہے صدف کا نصیب ہمارے بیٹے کے ساتھ جڑا تھا۔ شاید اس لیے آپ نے اس کا رشتہ ہیں مانگا۔'' اس مہذب خاتون نے سنجیدگی اور نرمی سے جواب دیا۔

''آپ بہت سادہ ہیں بہن، آپ کے بیٹے کی بدنصیبی ہے جو صدف سے اس کی منگنی ہو گئی۔'' شکیلہ نے ہنس کر کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ عورت پریشان ہو گئی۔

''سچ کہہ رہی ہوں، اب آپ ہی بتائیں صدف جیسی حسین و جمیل ایم اے پاس گھڑلڑکی کو جو ہم سے زیادہ کسی کو عزیز ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ ہماری بھتیجی ہے سگی بھتیجی، ارے اگر ہم نے اسے اپنی بہو بنانا پسند نہیں کیا تو اس کی کوئی بڑی اور اہم وجہ ہی ہو گی نا؟''

''کیسی وجہ؟ آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہیں صاف صاف کہیے نا کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' لڑکے کی ماں نے متفکر لہجے میں کہا۔

''آپ جانتی ہیں، صدف کی یہ پانچویں منگنی ہے۔''

''جی میں جانتی ہوں۔''

''اچھا تو پھر تو منگنی ٹوٹنے کی وجہ بھی بتائی ہو گی دردانہ بھابی نے آپ کو۔'' شکیلہ رفیق سٹپٹا سی گئی تھیں کہ ان کو پہلے سے صدف کی گزشتہ منگنیوں کا علم تھا۔

''آپ اصل بات بتائیں بہن؟''

''بھئی اصل بات یہ ہے کہ صدف پر آسیب کا سایہ ہے جن آتے ہیں اس پر کسی نے کالا جادو کرا رکھا ہے اس پر تاکہ اس کی شادی نہ ہو سکے جبھی تو اس کی ہر منگنی ٹوٹ جاتی ہے اور پھر صدف نے اپنی مرضی سے بھی دو منگنیاں کی تھیں سنا ہے جو جن صدف پر عاشق ہے اس نے ان دونوں لڑکوں کو اپاہج کر دیا تھا۔ شکیلہ رفیق نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہانی سنائی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ صدف پر آسیب ہے؟''

لڑکے کی ماں کے تو اوسان خطا ہو گئے ان کی باتیں سن کر۔

''جی ہاں اگر یہ عیب نہ ہوتا تو ہم کب کا صدف کو اپنی بہو بنا چکے ہوتے بھائی بھابی کو خاندان برادری سے باہر نہ دیکھنا پڑتا رشتہ۔'' شکیلہ رفیق نے تیزی سے کہا۔

''اپنے بیٹے کی سلامتی چاہتی ہیں تو یہ منگنی ختم کر دیں ورنہ وہ جن تو ہے ہی ختم کرانے کے لیے۔'' رفیق احمد نے انہیں مزید ڈرایا۔

''ایسے کیسے صدف پر جن کا سایہ ہو سکتا ہے؟''

''جن حسین لڑکیوں پر ہی عاشق ہوا کرتے ہیں۔ اب اللہ جانے وہ جن صدف پر عاشق ہوا ہے یا اس کا سایہ ہے اس پر جو بھی ہے وہ صدف کا رشتہ کہیں ہونے نہیں دیتا، دو چار ہفتوں میں منگنی ٹوٹ جاتی ہے اور صدف کے منگیتر کی ہڈیاں بھی۔''

شکیلہ رفیق نے انہیں مزید بددل اور خوفزدہ کرتے ہوئے کہا اور انہیں پریشان چھوڑ کر وہ دونوں وہاں سے چلے آئے۔

ان کی اس حاضری اور گل افشانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدف کی پانچویں منگنی پانچویں ہی دن یہ کہہ کر توڑ دی گئی کہ لڑکی پر تو جن عاشق ہے، آسیب زدہ ہے صدف اور صدف ایک بار پھر ٹھکرائے جانے کی ذلت میں دھنستی چلی گئی۔ اللہ نے اس کے نصیب کیا لکھا تھا یہ تو وہ نہیں جانتی تھی مگر آج اس نے رو رو کر اس آسیب یا جادو سے نجات کی دعا مانگی تھی جس نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔

☆.....☆

صدف کے والدین نے صدف پر کرائے گئے تعویذ اور جادو ٹونوں کے توڑ کے لیے عالموں سے رابطے کیے۔ ایک قادری سلسلے کے بزرگ نے انہیں تعویذ لکھ کر دیا، کچھ دعائیں بتائیں اور ایک پتھر تجویز کیا صدف کے لیے جسے انگوٹھی میں جڑوا کے صدف کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہننا تھا۔ ایسا ہی کیا گیا تو قدرے سکون ہوا۔ قادری صاحب نے جادو تعویذ کروانے والوں کے نام تو نہ بتائے بس اتنا بتایا کہ وہ ان کے قریبی رشتے دار ہیں جو یہ بیس شیطانی عمل کروا رہے ہیں۔ بہرحال چند دن سکون سے گزرے اور صدف کے لیے ایک رشتہ کرانے والی عورت کے ذریعے ایک غیر برادری کے لڑکے کا رشتہ آ گیا۔ لڑکا کالج میں لیکچرار تھا۔ اپنا ذاتی گھر تھا اس کا اور کچھ زمین بھی تھی۔

ردانہ شفیق اور شفیق احمد کو یہ رشتہ مناسب لگا۔ انہوں نے لڑکے اور اس کے گھر والوں کو آنے کی اجازت دے دی۔ وہ گھر آئے صدف سے ملے انہیں صدف پسند آ گئی۔ لڑکا بھی ساتھ آیا تھا اسے بھی خوب صورت صدف پہلی نظر میں ہی بھا گئی تھی۔ صدف کی منگنیاں ٹوٹنے کا انہوں نے لڑکے کو علیحدگی میں ملاقات کر کے بتا دیا تھا اور نکاح کا بھی۔ وہ صورت حال سمجھ گیا تھا۔ اسے اس رشتے پر اعتراض نہیں تھا۔ ہاں البتہ اس کے والدین پرانے خیالات کے مالک تھے۔ جادو ٹونوں کو منگنیاں ٹوٹنے کو بدشگونی اور نحوست سے تعبیر کرتے تھے لہٰذا لڑکے جبران نے خود ہی یہ بات ان سے پوشیدہ رکھی اور صدف کے والدین کو بھی کہہ دیا کہ وہ صدف کی منگنیاں اور نکاح ٹوٹنے کا ذکر اس کے گھر والوں سے ہرگز نہ کریں۔ بعد میں بات کھل بھی گئی تو وہ خود سنبھال لے گا۔ جس پر صدف اور اس کے گھر والے بھی مطمئن ہو گئے یوں یہ رشتہ طے پا گیا۔

''آنٹی ایک مشورہ دوں آپ کو؟'' صدف کی دوست رابعہ نے اس کی بات ہونے کا سنا تو مبارک باد اور کچھ مشورہ دینے اس کے گھر چلی آئی اور دردانہ شفیق سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں بیٹی کہو۔'' دردانہ شفیق شفقت سے بولیں۔

''آنٹی! آپ نے لڑکے کو ساری صورت حال تو بتا ہی دی ہے آپ لڑکے والوں کو سادگی سے نکاح پر راضی کر لیں آپ کے گھر والے ہوں اور لڑکی کے گھر والے اس نکاح میں شریک ہوں اور شادی یعنی رخصتی سے ایک ہفتہ پہلے رشتے داروں کو دعوت نامے بھیج دیں جس نے آنا ہو گا آ جائے گا نہیں آنا ہو گا نہ آئے۔ کم از کم اس طرح صدف کی شادی تو خیریت سے ہو جائے گی نا۔ ابھی آپ کسی سے بھی اس رشتے کا ذکر مت کیجئے۔ صدف کا نکاح ہو جائے گا تو یہ جادو، تعویذ اپنے آپ بے اثر ہو جائیں گے۔''

رابعہ نے سنجیدگی سے مدھم لہجے میں انہیں کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے بولیں۔

''بیٹی! تم نے بہت اچھی بات کہی بہت عمدہ مشورہ ہے ہم ایسا ہی کریں گے جیتی رہو اللہ تمہارے نصیب بھی نیک کرے۔''

''آمین۔'' وہ مسکرا دی۔

''ایک اور بات۔''

''وہ کیا؟'' دردانہ شفیق اور صدف دونوں کی جانب متوجہ ہوئیں۔ رابعہ نہایت سنجیدگی اور رازداری سے گویا ہوئی۔

''یہاں جو ہندوؤں کی بستی ہے نا، وہاں کچھ لوگ کالا جادو کرتے ہیں، میں نے صدف کی پھوپو اور تائی کو ایک بار وہاں دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے وہاں کے کسی ہندو جادو کرنے والے عامل سے عمل تعویذ کرائے ہیں صدف پر۔ کیوں نہ ہم ایک بار وہاں جا کر کسی عامل سے معلوم کریں اور اس کا لے جادو کا توڑ کروا لیں؟''

''بیٹا! یہ کالے جادو کرنے کروانے والے شیطان کے چیلے ہوتے ہیں، مسلمان کبھی ان چکروں میں نہیں پڑتا۔''

''آنٹی! ہم نے کالا جادو نہیں کرنا ہم نے تو توڑ کروانا ہے اگر صدف پر واقعی کسی نے جادو ٹونا کروایا ہے تو ہمیں اس کا توڑ کرانا ہو گا۔ ورنہ صدف کی زندگی ہمیشہ بے ترتیب، بے سکون اور پریشانیوں کا شکار ہی رہے گی اور یہ جو آئے دن عجیب و غریب بلکہ خوفناک واقعات اس کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں یہ خدانخواستہ کسی دن بڑے حادثے یا سانحے کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ ہمیں ایسے کسی

سانحے سے پہلے اس فساد کی جڑ کو کاٹ پھینکنا ہوگا۔''

رابعہ نے سنجیدگی سے انہیں سمجھانے، قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''امی! رابی بالکل صحیح کہہ رہی ہے ہم چلیں گے ہندوؤں کی بستی۔'' صدف نے اس کی بات سے متفق و قائل ہوکر کہا۔

''ٹھیک ہے پھر کل ہی چلتے ہیں، اللہ مالک ہے۔''

دردانہ شفیق دل سے رابعہ کی باتوں اور دلیلوں سے قائل ہوچکی تھیں جبھی حامی بھرتے ہوئے بولیں۔

☆.....☆

اور پھر اگلے روز وہ تینوں ہندوؤں کی بستی جا پہنچیں۔ یہ کوئی زیادہ اچھا، صاف ستھرا علاقہ نہیں تھا۔ کہیں گھاس پھوس اور سرکنڈوں، بانس کی جھونپڑیاں بنی تھیں، کہیں کچے مکان تھے، گندی نالیاں، ابلتے گٹر، کچرے کے ڈھیر جا بجا بیماریوں کا سامان بنے ہوئے تھے۔ کہیں چائے، سگریٹ کے کھوکھے بنے تھے، کہیں چھابڑی والے پھل، سبزیاں بیچ رہے تھے۔ ننگ دھڑنگ بچے مٹی، دھول اڑاتی سڑکوں، گلیوں میں گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیل رہے تھے۔ نارنجی رنگ کے چوٹے پہنے کچھ ہندو گھروں کے باہر بنے تھڑوں پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ سگریٹ، بیڑی پی رہے تھے۔ اس قدر گندگی تھی کہ ان تینوں کو وہاں چلنا، سانس لینا اور دو گھڑی رکنا محال لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی جب یہاں تک آ گئی تھیں تو کام کیے بنا کیسے جاسکتی تھیں؟

رابعہ نے جس جگہ صدف کی تائی ارر پھوپو کو دیکھا تھا وہ اسی جگہ ان دونوں کو لے آئی اور ایک ہندو سے بات کی اس نے بتایا کہ اس کا باپ عمل کرتا ہے وہ ان تینوں کو اس کے پاس لے گیا جب دردانہ شفیق نے بوڑھے ہندو کو اپنے آنے کا مقصد اور صدف کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتائی تو وہ ہندو کچھ دیر سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا رہا اور جب سر اٹھایا تو صدف کے چہرے پر نظریں مرکوز کرکے بولا۔

''پتری! عمل تو تجھ پر بڑا پکا کرایا ہے تیرے اپنوں نے اس کا توڑ میں نہیں کرسکتا کیونکہ یہ جادو میں نے ہی کیا ہے تیری منگنی نہ ہو، ہوجائے تو ٹوٹ جائے، تیری شادی میں رکاوٹ رہے، بندش رہے تیرے تایا پھوپی نے اس مقصد سے کرائے ہیں تجھ پر یہ کالے عمل۔''

''ہمیں تو پہلے ہی یقین تھا کہ یہ شیطانی کام وہی کر سکتے ہیں پر بابا جی! کوئی تو توڑ ہوگا نا اس کا؟ ہم نے سنا ہے جس نے یہ جادو کیا ہو ہی اس کا توڑ کرسکتا ہے۔ آپ میری بچی کو اس دکھ سے نجات دلا سکتے ہیں ناں؟ آپ یہ عمل ختم کردیں۔''

دردانہ شفیق نے منت بھرے لہجے میں ہندو عامل سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں توڑ کرتا ہوں پر اس کے لیے وقت لگے گا اور پیسہ بھی، مفت میں کام نہیں کرتا عامل بابا۔ تیرے رشتے داروں نے دس ہزار روپے دیئے تھے مجھے اس کام کے۔ تو بھی کل بیس ہزار لے کے آجا۔ کام ہوجائے گا۔''

ہندو عامل نے کرخت آواز میں کہا۔ دردانہ شفیق نے فکرمندی سے کہا۔

''عامل بابا! میں اور میرا شوہر اسکول ٹیچر ہیں۔ ریٹائر ہونے والے ہیں دونوں۔ ہمارے پاس بیس ہزار تو نہیں ہیں دینے کے لیے۔ دس ہزار دے سکتی ہوں۔ پر آپ وعدہ کریں کہ کام ہوجائے گا میری بچی کی زندگی کا سوال ہے۔''

''ٹھیک ہے تو دس ہزار روپے اور دو کالی مرغیاں کل لے آنا۔ کام ہوجائے گا اور ہاں اب کی بار منگنی نہ کرنا لڑکی کی۔ صرف شادی کرنا۔'' عامل نے مانتے ہوئے کہا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' دردانہ شفیق نے فوراً کہا۔

''رابعہ صحیح کہہ رہی تھی کہ منگنی کریں ہی نہیں نکاح کریں خاموشی سے اور یہی بات یہ عامل کہہ رہا ہے۔''

دردانہ شفیق اور صدف نے بیک وقت یہی بات سوچی تھی اور پھر اگلے روز دردانہ اور صدف ہندو عامل کے پاس دوبارہ گئیں۔ اسے دس ہزار روپے دیئے۔ عامل نے انہیں چند ضروری ہدایات دیں اور اپنے کیے عمل کو زائل کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ وہ دونوں وہاں سے واپس چلی آئیں اور دل ہی دل میں دعا کرتی رہیں کہ اب سب اچھا ہوجائے گا اور یوں سادگی سے صدف کا نکاح جبران کے ساتھ ہوگیا۔ چار دن بعد مقامی ہوٹل صدف کی شادی پر رخصتی کی شاندار تقریب منعقد ہوئی۔ دردانہ شفیق اور شفیق احمد نے اس کا صدقہ اتارا۔ قادری صاحب نے جو

خاص دعائیں بتائی تھیں۔ وظائف بتائے تھے وہ مسلسل جاری تھے۔ رفیق احمد، شکیلہ رفیق، افشاں، پھوپو زبیدہ اور ان کی بیٹیاں تو صدمے میں تھیں کہ آخر ان کے وار خالی کیسے چلے گئے؟ یوں اچانک صدف کی شادی کیسے ہوگئی وہ بھی اس کی اتنی منگنیاں ٹوٹنے کے بعد اور اتنے ہینڈسم، قابل، اچھی ملازمت پر فائز لڑکے کے ساتھ۔ خاندان والے تو جلتے بھنتے رہے۔ صدف والدین کی دعاؤں میں رخصت ہوگئی۔

''مبارک ہو شفیق! آخر کار تمہاری صدف بھی بیاہ کے رخصت ہو ہی گئی۔'' رفیق احمد نے مبارک باد بھی طنز بھرے لہجے میں دی تھی۔ شفیق احمد اور دردانہ شفیق مسکرا رہے تھے۔

''خیر مبارک بھائی جان! یہ سب اللہ کا کرم ہے اور اس کے بزرگ عالم کی دعائیں ہیں جن کی بدولت آج میری بیٹی اپنے گھر کی ہوگئی۔''

''بے شک ورنہ حاسدوں نے تو ایسا عمل کررہا تھا کہ اس کی شادی ہی نہ ہو منگنیاں ٹوٹتی رہیں اور ہماری صدف بدنام ہوجائے مگر مارنے والے سے ہمیشہ بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ ہم نے جس عالم، عامل سے توڑ کرایا ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر ابھی بھی جادو تعویذ کرانے والے باز نہ اپنی حرکتوں سے تو یہ سارے عمل ان پر الٹے پڑ جائیں گے اور ان کا وہ حشر ہوگا کہ وہ نہ تو زندوں میں رہیں گے نہ مُردوں میں۔ کالا جادو کروا کر کافر تو وہ لوگ ہو ہی گئے ہیں جہنم تو خرید ہی لی ہے انہوں نے اپنے لیے۔''

دردانہ شفیق نے سنجیدگی سے سمجھداری سے بات بناتے ہوئے انہیں سنایا تھا تاکہ رفیق احمد، شکیلہ، افشاں اور زبیدہ کے دل میں بھی ڈر خوف پیدا ہو اور وہ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز رہیں۔ ان کی باتیں سن کر ان سب کے رنگ فق ہوگئے تھے۔ سب نظریں چرا رہے تھے۔ کھسیانے سے ہوکر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

''اچھا تمہیں بتایا نہیں تمہارے عالم اور عامل نے کے وہ کون لوگ ہیں؟ ان کے نام نہیں بتائے؟''

شکیلہ رفیق نے کانپتی آواز میں پوچھا تو شفیق احمد مسکرا کر بولے۔ ایک ایک کا نام بتایا ہے بھابی! یہ اپنے ہی ہوتے ہیں جو سامنے اپنے پن کا محبت کا دکھاوا کرتے ہیں اور پیٹھ پیچھے نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتے ہیں۔ اپنے ہیں جبھی ہم نے انتقامی کارروائی نہیں کروائی اس بار کہ اس کا ظرف اور عمل ان کے ساتھ اور ہمارا ظرف اور عمل ہمارے ساتھ ہے لیکن اگر آئندہ انہوں نے ایسی کوئی حاسدانہ اور جاہلانہ حرکت کی تو وہ فوراً اس کی پکڑ میں آئیں گے اور اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔''

شفیق احمد سنجیدگی سے بولے۔ وہ سب نظریں چراتے ہوئے زبردستی مسکرانے کی کوشش کررہے تھے۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان اتنا حاسد اور گھٹیا کیوں ہوجاتا ہے کہ اپنے خون کے رشتوں پر جادو ٹونے تعویذ دھاگے کرانے چل پڑتا ہے۔ بھئی کرنا ہی تو اپنی بیٹیوں کے رشتے کے لیے تعویذ کرائیں یہ کیا کہ حسد، جلن میں دوسروں کی بیٹیوں کی زندگی برباد کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ میرا تو بالکل بھی دل نہیں تھا انہیں معاف کرنے کا یہ تو شفیق صاحب کی شفیق طبیعت آڑے آگئی ورنہ وہ سب کے سب اس وقت اپنے کیے پر پچھتا رہے ہوتے ایسا حشر ہوتا ان کا۔''

دردانہ شفیق نے انہیں مزید شرمندہ اور خوفزدہ کرنے کے لیے کہا تھا۔

''اللہ تعالیٰ! انہیں ان کے کیے کی سزا اس دنیا میں دیں گے اور اگلے جہاں میں بھی۔ لہٰذا ہمیں فکرمند ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

لبنیٰ نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''بالکل۔'' امیر احمد نے تائید۔

''اور ان گھٹیا رشتے داروں کے نام ہم نے اس لیے ان کے سامنے نہیں بتائے نہ ہی خاندان والوں کے سامنے ان کے کرتوت ظاہر کیے کہ وہ بیٹیوں والے ہیں بے چارے بدنام ہوجائیں گے خود تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہیں گے نہیں۔ ساتھ ہی ان کی بیٹیوں کے رشتے بھی نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے لوگ تو سوچیں گے تاکہ جن کے ماں باپ ایسے ہیں ان کی اولاد کیسی شاطر، چالباز اور حاسد، فسادی ہوگی۔'' لبنیٰ نے جان بوجھ کر انہیں سننے کے لیے کہا۔

''ہاں..... آں..... ٹھیک کہا تم نے۔''

شکیلہ سٹپٹا کر بولیں۔ لبنیٰ نے لوہا گرم دیکھ کر مزید

چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

''بابا جی کہہ رہے تھے کہ وہ لوگ اب صدف اور اس کے شوہر پر تعویذ جادو کرانے کا سوچیں گے بس پھر ان کی خیر نہیں ایسا مزا چکھائیں گے ان کو کہ مرتے دم تک پچھتائیں گے، روئیں گے کہ انہوں نے یہ گناہ کیوں کیا؟''

''اللہ صدف کو خوش آباد رکھے اپنے شوہر کے ساتھ۔'' زبیدہ پھوپو نے مرے مرے لہجے میں دعا دی۔

''آمین! انشاء اللہ۔'' لبنیٰ اور درد انہ شفیق نے ایک ساتھ کہا۔ شکیلہ رفیق نے وہاں سے نکلنے کے لیے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''رات بہت ہو گئی ہے اب گھر چلیں، صبح تک بستر سے نہ لگ جاؤں۔''

''ہاں چلو، چلو سردی بھی بڑھ رہی ہے اور سردیوں میں تمہاری یہ بیماری بھی بڑھ جاتی ہے۔ اچھا شفیق اور بھابی خدا حافظ اور رفیق احمد بھی جانے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے۔ بیوی کی بات سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی سے کہتے ہوئے ان سے اجازت لی۔

''خدا حافظ بھائی صاحب۔''

انہوں نے ان سب کو الوداع کہا اور خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔ ہوٹل سے قادری صاحب نے صدف کو جو دعائیں بتائی تھیں وہ سارے راستے ان دعاؤں کا اسمائے الٰہی کا ورد کرتی آئی تھی۔

☆.....☆

سسرال میں صدف کا شاندار، استقبال کیا گیا۔ روایتی رسمیں ادا کی گئیں۔ صدف دلہن کے روپ میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ جبران تو اس کے اس روپ پر فدا ہو رہا تھا۔ صدف کی نندوں نے اسے اس کے کمرے پہنچا دیا۔ دلہن کا کمرہ بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ بیڈ پر ہر طرف سرخ گلابوں کی چادر بچھی تھی۔ اس کے جہیز کا فرنیچر کمرے میں سیٹ کیا گیا تھا۔ فرش پر گرین کارپٹ بچھا تھا۔ میرون اور کریم کلر کے پردے دروازے اور کھڑکیوں پر آراستہ تھے۔ کمرے میں گلاب کے تازہ پھولوں کی مہک رچی تھی۔ اس کے آنے پر اس کی نند نے ہیٹر آن کر دیا تھا تاکہ سردی کا احساس کم ہو جائے صدف بہت مطمئن اور مسرور تھی لیکن دل میں کہیں ہلکا سا خوف بھی ہلکورے لے رہا تھا کہ اس کا شوہر نہ جانے کس مزاج کا آدمی ہو وہ اس کے ساتھ خوش رہے گی یا نہیں اس کی زندگی میں پھر سے کسی جادو کا اثر تو نہیں ہو گا؟ ایسے بہت سے سوال تھے جو اس وقت اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ اسی دوران اسے دروازہ کھلنے کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ سنبھل کر سمٹ کر نگاہیں جھکا کر بیٹھ گئی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز نے اس کی دھڑکن پل بھر کو بند کر دی تھیں۔ وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ کمرے کی گرمی اور حرارت یکا یک ختم ہی میں بدلنے لگی۔ بند کھڑکی کے پٹ پوری قوت سے کھلے اور دیوار میں اتنے زور سے جا کے لگے تھے صدف ڈر کر بری طرح اچھل گئی تھی۔ پردے تیز ٹھنڈی، آوارہ ہوا سے لہرانے لگے۔ ہوا کی سرگوشیاں بہت پراسرار اور دل دہلانے والی تھیں۔ صدف سردی محسوس کر رہی تھی۔ بدن کانپنے لگا تھا۔ اچانک لائٹ چلی گئی۔ ایسے میں تیز ہوا کا شور، دیواروں سے سرپٹختی کھڑکیوں کے پٹ، اندھیرے کا دہلائی نہ دینے والا خوف صدف کی جان نکالے دے رہا تھا۔

''صدف۔'' اچانک کسی مردانہ آواز نے اسے پکارا۔ اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا تھا۔

اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صدف کو اس وقت اسی آسیب کا خیال آیا جو اسے تنگ کرتا آیا تھا اب تک۔

''کیا جادو کا توڑ ٹھیک سے نہیں ہوا؟ اور میرے اللہ! میری مدد فرما صدف کے ذہن میں پہلا خیال یہی آ رہا تھا جو اسے بہت ڈرا رہا تھا۔

''صدف، صدف، کہاں ہو؟''

صدف کو پھر سے وہی آواز سنائی دی۔ صدف نے ڈرتے ڈرتے آواز کی سمت دیکھا۔ موم بتی کی نارنجی روشنی میں اسے ایک ہیولا سا دکھائی صدف کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک گئی۔ کھڑکی کے پٹ زور سے بجے تھے۔ صدف کی زوردار چیخ کمرے میں گونجی تھی اور پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا گہرا، خوفناک پراسرار سناٹا۔''

☆☆☆

چھل

شمینہ طاہر بٹ

اُس لیکچرار کی عجب کتھا' جو وعدہ نبھانے کے لیے اجل سے مہلت لے آئی تھی

لاہور!! سورج سوا نیزے پر تھا۔ ہوا بالکل بند تھی، گرمی اور گھٹن کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ ایسے شدید موسم میں وہ سب لڑکیاں انتظار کی دوہری اذیت میں مبتلا بار بار کلاس روم کے دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر اپنی لیکچرار مس شہلا کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کے فائنل ایگزامز سر پر تھے اور کہنے کو وہ لوگ کالج سے بھی فری ہو چکی تھیں مگر اس روز ان کی اکنامکس کی ٹیچر نے انہیں خصوصی طور پر کچھ اہم نوٹس اور کچھ خصوصی ہدایات دینے کے لیے بلوایا تھا۔ اور یہ پیغام سب لڑکیوں کو ایک ساتھ ملا تھا اور وہ بھی خاص طور سے کالج انتظامیہ کی طرف سے، اسی لیے موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر بھی بی۔ ایس۔ سی۔ اکنامکس کی ساری کلاس وقت مقررہ پر حاضر تھی۔ لیکن ابھی تک خود مس شہلا کا دور دور تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ وہ سب بہت حیران ہو رہی تھیں کیونکہ مس شہلا وقت کی بہت پابند تھیں۔

''کلاس۔!! آپ لوگ تھوڑا ویٹ اور کر لیں، ابھی تک ہمارا آپ کی میم شہلا سے کانٹیکٹ نہیں ہو پایا۔ شاید وہ راستے میں ہیں اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ وہ دورانِ ڈرائیونگ فون اٹینڈ نہیں کرتیں۔ اس لیے آپ تسلی رکھیں، شہلا بس پہنچنے ہی والی ہونگی۔!!''

ان سب کی بے چینی دیکھ کر میم تابندہ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تو ان سب کی نگاہیں بے ساختہ سامنے بلیک بورڈ کے اوپر لگی گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ گھڑی دوپہر کا سوا ایک بجا رہی تھی۔ اور اس وقت کے حساب سے انہیں میم شہلا کا انتظار کرتے دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔

''میم!! اب تو چھٹی ہونے والی ہے، اور تھوڑی دیر تک تو باقی کلاسز کی بھی چھٹی ہو جائے گی، اگر میم شہلا تب تک بھی نہیں آئیں تو کیا ہم خالی کالج میں بیٹھ کر ان کا ویٹ کریں گے۔؟'' طیبہ منصور کا مزاج تو ویسے ہی بڑا تیکھا تھا، اور اس پر اس ''لاحاصل'' دکھائی دیتے انتظار نے اس کا مزاج اور زیادہ برہم کر دیا تھا، اسی لیے وہ بنا لحاظ کیے میم تابندہ سے الجھ پڑی تھی۔

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میری ابھی ابھی شہلا کے فادر سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ کافی دیر ہوئی گھر سے کالج کے لیے نکل چکی ہیں، ہوسکتا ہے کہ راستے میں ٹریفک میں پھنس گئی ہوں، یا پھر کوئی اور پرابلم بھی تو ہوسکتا ہے ناں۔ اس لیے میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ پریشان مت ہوں۔ شہلا بس تھوڑی دیر میں ہی پہنچنے والی ہے۔!!'' میم تابندہ نے اپنے مخصوص نرم انداز سے طیبہ کے ساتھ ساتھ ان سب کی تسلی کروائی اور کلاس سے باہر کی راہ لی۔ وہ سب ایک دوسری کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''یار! میرا تو بالکل بھی موڈ نہیں ہو رہا تھا کالج آنے کا۔ امی بھی پرمیشن نہیں دے رہی تھیں، اس پر یہ منحوس گرمی۔ پتا ہے تمہیں، کتنی مشکلوں سے آئی ہوں میں آج، اور اوپر سے یہ میم شہلا۔؟ پتا نہیں آتی بھی ہیں کہ لارا ہی لگا گئی ہیں ہمیں۔!!'' ثمن کی مایوسی اور اکتاہٹ میں ڈوبی آواز کلاس میں ابھری تو سب لڑکیوں کو اپنی اپنی بولیاں بولنے کا موقع مل گیا۔

''ارے نہیں یار۔!! میم ضرور آئیں گی۔ انہوں نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا تھا، اور میں جانتی ہوں کہ وہ وعدہ خلافی نہیں کریں گی۔ تم لوگ اطمینان رکھو، وہ آتی ہی ہوں گی۔'' انعم نے تمن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے یقین بھرے انداز سے کہا تو سب اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ اب انہیں سوائے انتظار کے اور کرنا بھی کیا تھا، اور ایسے میں جب بائیس، تیئیس لڑکیاں ایک جگہ جمع ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ باتیں نہ کریں، سو اب کلاس میں ان سب کی دبی دبی سرگوشیاں اور بے ساختہ امڈتے قہقہے گونجنے لگے تھے۔

''ارے!! وہ دیکھو۔ بادل آرہے ہیں۔ کالے کالے بادل، اور ہوا بھی کتنی مست ہو گئی ہے۔ یار، یہ موسم اچانک اتنا اوسم کیسے ہو گیا۔؟ پتا کرو، کہیں میم شہلا پہنچ تو نہیں گئیں کالج۔؟'' وہ سب اپنی اپنی باتوں میں مگن تھیں کہ کھڑکی کے پاس بیٹھی نوبیہ کی نظر باہر پڑی تو

وہ تیزی سے رنگ بدلتے موسم کو دیکھ کر چلا اٹھی۔ اس کی چہکتی آواز نے سب لڑکیوں کی توجہ باہر کی طرف مبذول کروا دی۔ اب ساری لڑکیاں خوش دکھائی دینے لگی تھیں۔ آسمان پر کالے بادل بڑی تیزی سے پھیل رہے تھے، اور اس بھی زیادہ تیزی سے ہوا چلنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا آسمان بادلوں سے بھر گیا۔ کالے سیاہ بادلوں نے دن کی ساری روشنی نگل لی تھی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا سا پھیل گیا تھا۔ اس ''اوسم موسم'' نے دیکھتے ہی دیکھتے جیسے'' قیامت'' کا روپ دھار لیا تھا۔ کلاس کی سب بچیاں حیرت اور خوف سے لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتے آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ تیز ہوا کالج کی دیواروں کے ساتھ سر پٹختی، سیٹی جیسی تیز آواز میں شور مچاتی ادھر سے ادھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ گراؤنڈ اور لان میں لگے درخت اور پودے ہوا کے ان زوردار تھپیڑوں کو بڑی ہمت سے سہتے تیز تیز جھوم رہے تھے۔

''کھڑکیاں بند کردو، ساری لائٹس آن کردو، اور کلمہ طیبہ کا ورد کرو، یہ بڑا خوفناک طوفان ہے۔ دعا کرو کہ اس کا زور جلد ہی ٹوٹ جائے ورنہ ہم سب کسی نہ کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔''

فاطمہ اور انعم حافظ قرآن تھیں۔ انہوں نے ہمت کی اور اٹھ کر کمرے کی ساری کھڑکیاں بند کرنی شروع کر دیں۔ ساتھ ساتھ وہ کلمہ بھی پڑھتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے باقی لڑکیوں کو بھی یہی تلقین کی مگر چند ایک لڑکیاں جو کہ ان کے ہی گروپ کی تھیں ہ ان کے سوا اور کسی نے بھی ان کی تاکید پر عمل نہیں کیا، اور خوفزدہ نگاہوں سے باہر دیکھتے ہوئے رونا شروع کر چکی تھیں۔

''اللہ! اب کیا ہوگا۔؟ ہم گھر کیسے جائیں گے۔؟ میرا تو گھر بھی اتنی دور ہے اور مجھے جانا بھی اکیلے ہی پڑتا ہے، اور آج تو لگتا ہے کہ کوئی رکشہ، ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔ یا اللہ، میں کیا کروں اب؟'' ثمن موسم کے بگڑے تیور دیکھ کر سب سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی۔ اس کا گھر واقعی بہت دور تھا۔ اور دور تو مس شہلا کا گھر بھی بہت تھا۔ بلکہ، وہ دونوں ایک ہی علاقے میں رہتی تھیں۔ بس سیکٹر الگ الگ تھے۔ اسی وجہ سے چند ایک بار وہ میم شہلا سے لفٹ بھی لے چکی تھی۔

''پریشان مت ہو۔ میم شہلا کے ساتھ چلی جانا تم۔ وہ تمہیں حفاظت سے تمہارے گھر پہنچا دیں گی۔ بس دعا کرو کہ وہ اس طوفان میں خیریت کے ساتھ کالج پہنچ جائیں کسی نہ کسی طرح۔'' ارم نے اسے تسلی دی تو وہ بھی میم کی خیریت کے لیے دعا گو ہوگئی۔

جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا، موسم اور زیادہ خراب ہوتا جا رہا تھا۔ ہوائیں خوب شور مچاتیں، سرپٹختیں اب دیواروں کے ساتھ ساتھ کمرے کی کھڑکیوں، دروازوں کو بھی ٹکریں مار مار کر زور وشور سے بین کرتی پھر رہی تھیں۔ تیز ہوا کے ساتھ گراؤنڈ کی مٹی اور گری پڑی اشیاء بھی بگولوں کی صورت فضا میں چکراتے پھر رہی تھیں۔ ہوا کا زور اس قدر زیادہ تھا کہ لگ رہا تھا کہ کوئی پل جاتا ہے اور کھڑکیاں دروازے ٹوٹ کر گر جائیں گے۔ ماحول کی خوفناکی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی اور ایسے میں کمزور دل کی لڑکیوں کی وبی دبی چیخیں بلند ہونے لگی تھیں۔ وہ سب ایک دوسری سے لپٹی بری طرح رو رہی تھیں۔ صرف چند لڑکیاں ہی ایسی تھیں جو اس صورتِ حال میں بھی خود پر قابو رکھتے ہوئے اپنی ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اچانک آسمان نے ایک اور رنگ بدلا اور گہرے سیاہ بادلوں میں زوردار کڑک کے ساتھ تیز آنکھوں کو چندھیاتی بجلی چمکنے لگی۔ بادلوں کی کڑک اور بجلی کی دھمک اس قدر زوردار تھی پورے کالج میں نسوانی چیخیں گونج اٹھیں۔ اکنامکس کی کلاس کے علاوہ بھی جو چند کلاسز ہو رہی تھیں، سب کا شاید یہی حال تھا، مگر ان لوگوں کی حالت اس لیے بھی زیادہ پتلی ہو رہی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی لیکچرار نہیں تھیں اس لیے وہ بہت زیادہ ڈر رہی تھیں۔ ابھی وہ لوگ بادلوں اور بجلی کی کڑک سے ہی سنبھل نہیں پائی تھیں کہ ایک اور حادثہ ہو گیا۔ اچانک ایک چھناکے کی آواز آئی اور کمرے کی ساری لائٹس اسپارک ہونے لگیں۔ وہ بری طرح ڈری سہمی خوفزدہ انداز سے لائٹس کو دیکھنے لگیں اور پھر ایک اور جھٹکا لگا اور ساری لائٹس اپنے آپ بجھ گئیں۔ اب ان لڑکیوں کی آواز بھی نہ نکل سکی، وہ ساری اس قدر خوفزدہ ہو چکی تھیں کہ ان کی قوتِ گویائی ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ کمرے میں مکمل طور پر اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس

اندھیرے میں خاموشی اس قدر زیادہ تھی کہ سانسوں کی **مدھم مدھم** آوازوں کے سوا اور کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا **تھا**۔ وہ دل ہی دل میں سخت پچھتا رہی تھیں کہ وہ کالج آئی **ہی کیوں؟** بھلا ٹوٹس جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہو سکتے **تھے** ناں، اور اب تو ان سب کو اپنی جان کے لالے پڑ **چکے تھے**۔ انہیں صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کمرے میں ان کے علاوہ کوئی غیر مرئی مخلوق بھی بیٹھی اپنی نادیدہ آنکھوں سے ان کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہی ہے، ورنہ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ کوئی ٹیچر ان کی مدد کو نہ آتی۔

☆.....☆

''بیٹا!! آج آپ کا جانا کیا بہت ضروری ہے؟''

پروفیسر صاحب کے انداز میں ایک عجیب طرح کی بے چینی اور پریشانی تھی جسے محسوس کر کے وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

''جی بابا! یقین کریں اگر ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی آپ کو اس طرح چھوڑ کر نہ جاتی۔ مگر کیا کروں، میری بھی مجبوری ہے۔ میں نے کمٹمنٹ کر رکھی ہے اور آپ نے ہی تو سکھایا ہے کہ وعدہ کسی حال میں نہیں توڑتے، چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے، وعدہ نبھانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔'' اس نے مسکرا کر انہیں تسلی دی تھی مگر پروفیسر صاحب کے دل کو قرار نہیں آ رہا تھا۔ وہ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہے تھے، جیسے ان کی کوئی بہت قیمتی چیز ان سے چھن جانے والی ہو۔

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا، مگر جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا۔ میرا دل مجھ سے کہہ رہا کہ آج میں تمہیں کہیں نہ جانے دوں۔ ساری دنیا سے چھپا کر بس اپنے پاس ہی رکھ لوں!''

''بابا! آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ میں بہت جلد واپس آ جاؤں گی۔ کوئی اتنا لمبا کام نہیں ہے، بس ایک پیریڈ ہی تو لینا ہے مجھے، اور وہ بھی ایک ہی کلاس کا۔ میں بس یوں گئی اور یوں آئی۔ آپ تب تک کوئی بک پڑھ لیں، یا پھر پیپٹ میں کوئی ٹاک شو دیکھ لیں۔ اس طرح آپ کا دل بھی لگا رہے گا اور میں اپنا وعدہ بھی پورا کر لوں گی!'' اس نے نرمی سے اپنے بابا کے ہاتھ تھامتے ہوئے انہیں ایزی چیئر پر بٹھایا اور خود اپنا بیگ شانے پر ڈالے، ضروری فائل سینے سے لگائے گاڑی کی چابی ہلاتی، انہیں مسکرا کر دیکھتی باہر نکل گئی۔

وہ جیسے جیسے دور ہوتی جا رہی تھی، پروفیسر صاحب کو لگ رہا تھا کہ ان کی جان ان کے جسم کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ ان کے ماتھے پر پسینہ ننھے ننھے قطروں کی صورت پھوٹ پڑا تھا، ان کا سانس جیسے سینے میں ہی اٹکنے لگا تھا اور آنکھوں میں صدیوں کا انتظار ابھی سے ابھر آیا تھا۔ وہ ایک ٹک آہستہ آہستہ ہلتے دروازے کو دیکھتے وہیں ساکت سے ہو گئے تھے۔ وہ جاتے جاتے ٹی وی آن کر گئی تھی، اور ہلکی آواز میں چلتے کسی نیوز چینل کی رنگ بدلتی لہریں ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کے ساتھ مدغم ہوتی عجیب سا تاثر چھوڑ رہی تھیں۔

''ٹرن، ٹرن'' پروفیسر صاحب جانے کب تک خود فراموشی کے عالم میں بیٹھے رہتے کہ ان کے قریب رکھے لینڈ لائن فون کی گھنٹی زور وشور سے چلانے لگی تھی۔ اس گھنٹی کی آواز انکی سماعتوں پر کسی ہتھوڑے کی طرح لگی تھی، وہ ایک دم بری طرح سے چونکے تھے۔ گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی تھی، اور اس کی گونج دار آواز کے ساتھ ہی ان کا دل کسی انجانے اندیشے کے زیرِ اثر بڑی گہرائی میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ انہوں نے خوفزدہ نگاہوں سے فون کو دیکھا اور پھر کانپتے ہاتھوں سے رسیور اٹھا لیا۔

''السلام علیکم سر! شہلا ابھی تک کالج نہیں پہنچی، اس کی اسٹوڈنٹس اس کا بے صبری سے انتظار کر رہی ہیں۔ وہ میرا فون بھی نہیں اٹھا رہی۔ وہ آ رہی ہے ناں سر؟'' ان کے ''ہیلو'' کے جواب میں ائیر پیس سے ابھرنے والی آواز نے ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر ڈالے تھے۔ رسیور ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ بے چینی سے اٹھنے کو تھے کہ ان کی نگاہ سامنے چلتے ٹی وی پر پڑی اور پھر وہ جہاں کے تہاں بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ اسکرین پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی، اور یہ وہ نیوز تھی جس کو دیکھنے اور سننے سے پہلے وہ مرجانا پسند کرتے، مگر ان کی قسمت کہ انہیں اپنے پورے ہوش وحواس میں یہ خبر سننی بھی پڑ رہی تھی اور یہ اندوہناک منظر کھلی جاگتی آنکھوں سے دیکھنا بھی پڑ رہا تھا۔ اور جانے ابھی ان کی قسمت میں اور کیا کیا تھا دیکھنے کے لیے، انہیں خود بھی اس کا علم نہیں تھا۔

☆.....☆

اندھیرے میں ڈوبی تاریک کلاس میں برف جیسی ٹھنڈک پھیل چکی تھی۔ ایسی ٹھنڈک جیسی کسی مردہ خانے میں ہوسکتی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ تو پہلے ہی بھائی نہیں دے رہا تھا، اب یہ روح تک کو منجمد کرتی ہوئی ٹھنڈک انہیں ہراساں کر رہی تھی۔ وہ سب دل ہی دل میں رب کو یاد کرتی اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتی کسی معجزے کی منتظر تھیں۔ اور پھر واقعی جیسے معجزہ ظہور پذیر ہوگیا تھا۔ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کلاس روم کا دروزہ کھلا اور پھر ''ٹھک'' کی زوردار آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔ دروازے کے بند ہوتے ہی ایک دم کمرے کے سارے بلب ایک ساتھ ہی روشن ہوگئے اور پورا کمرہ سفید دودھیا روشنی میں نہا گیا۔ شاید بجلی کی فروانی تھی یا کوئی اور وجہ کہ ان بلبوں کی روشنی پہلے سے ہزار گنا بڑھ چکی تھی۔ سب لڑکیاں اس تیز روشنی سے حیران پریشان ہوتی مُنہ اٹھائے تیزی سے چمکتے بلبوں اور ہلکی رفتار سے چلتے پنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

''ارے! وہ دیکھو، میم شہلا آگئیں۔'' پچھلی سیٹوں پر بیٹھی کچھ لڑکیوں کی نگاہ روسٹرم کے ساتھ رکھی ٹیچرز چیئر پر پڑی تو انہوں نے بے ساختہ چلا کر ساتھ والیوں کو بھی آگاہ کیا تھا۔ ان کی خوشی سے بھرپور آواز نے جیسے سب کے چہروں پر خوشی کی لالی دوڑا دی تھی۔ سب نگاہیں ایک ساتھ روسٹرم کی طرف اٹھی تھیں، اور وہاں سر جھکائے بیٹھی مس شہلا کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی تھی۔

''تھینکس گاڈ میم کہ آپ آگئیں۔ ہم تو بہت پریشان ہوگئے تھے کہ شاید اتنے شدید طوفان میں آپ نہ آسکیں، اور ہمارا آج کا وزٹ بیکار ہی چلا جائے۔'' انعم نے میم کو دیکھتے ہوئے کہا تو ساری کلاس اثبات میں سر ہلانے لگی۔ میم شہلا نے اپنا جھکا سر اٹھا کے انعم کو دیکھا تو انعم کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ میم کے انداز بہت بدلے ہوئے تھے، ان کی چہرے پر پھیلی سنجیدگی اور بے رونقی کا احساس بہت عجیب سا تھا۔ وہ تو بہت خوش اخلاق اور ملنسار طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کے دوستانہ رویے کی وجہ سے ہی تو سارے اسٹاف کے ساتھ ساتھ ساری طالبات بھی انہیں دل سے پسند کرتی تھیں۔ ان کے چہرے پر ہر وقت ایک نرم سی مسکراہٹ رہتی تھی اور ذہانت سے بھرپور چمکدار سیاہ آنکھوں سے محبت کی نرم اور میٹھی لہریں نکل کر دیکھنے والوں کو ایک سحر میں جکڑے رہتی تھیں۔ مگر اس وقت نہ تو ان کے چہرے پر وہ مانوس مسکراہٹ تھی اور نہ ہی آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک اور محبت بھری کوئی لہر تھی۔ بلکہ اس کی جگہ ایک نامعلوم سی اجنبیت اور سرد مہری بھری تھی۔ ان آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی، مگر وہ پھر بھی زندہ تھیں۔ ان سب کو دیکھ رہی تھیں۔ انعم کی نگاہ جیسے ہی ان نگاہوں سے ملی وہ جہاں کی تہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر آچکی ہے۔ میم شہلا نے کوئی بھی جواب دیے بغیر ایک فائل اس کی طرف بڑھائی۔ انعم ٹرانس میں چلتی ہوئی ان کے قریب گئی اور فائل ان سے لے لی۔

''یہ بہت ضروری نوٹس ہیں۔ انہیں بلیک بورڈ پر لکھو اور سب کو کہہ دو کہ انہیں اتار لیں۔ اگر تم لوگوں نے یہ تیس سوال اچھی طرح تیار کر لیے تو بہت اچھے مارکس کے ساتھ پاس ہو جاؤ گی۔ لو، اپنا کام شروع کرو۔ اور جلدی کرنا، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں بہت مشکل سے مہلت لے کر آئی ہوں۔ جلدی کرو اب۔''

یہ آواز بھی میم شہلا کی نہیں تھی۔ عجیب سرسراتی ہوئی دھیمی سی آواز، جیسے کوئی نیند کے عالم میں بول رہا ہو۔ انعم کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ دوبارہ شہلا کے چہرے کی طرف دیکھے۔ اس نے روسٹرم کے اوپر سے چاک اٹھایا اور اسی ٹرانس کے عالم میں بورڈ کی طرف بڑھ گئی۔ پوری کلاس اس صورتِ حال پر حیران، پریشان ہوتی ہوئی اپنے رجسٹرز اور جرنلز کھولنے لگی تھی۔ جلد ہی انعم نے بلیک بورڈ پر سوالات لکھنے شروع کر دیے۔ سب لڑکیاں پورے انہماک سے وہ سوال اتارنے میں مصروف ہوچکی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا، میم شہلا کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور پھر جیسے ہی انعم نے آخری سوال بورڈ پر لکھا، میم شہلا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ساری کلاس ان کے احترام میں ان کے ساتھ ہی کھڑی ہوچکی تھی، مگر میم نے کسی کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ وہ جیسے خواب کے عالم میں چلتی ہوئی دروازے کی طرف

بڑھ رہی تھیں۔

''میم!! آپ کی فائل۔!!'' شہلا دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی کہ انعم جیسے ایک جھٹکے سے ہوش میں آئی تھی۔ اس کی نظر اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل پر پڑی تو وہ بے ساختہ اسے پیچھے سے پکار بیٹھی۔

''یہ تم رکھ لو۔ اب اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ وہیں کھڑے کھڑے ذرا سا پلٹی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی پہلے سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں گہرا کرب اور تکلیف جھلک رہا تھا۔ ''اور ہاں، میں وعدہ خلاف نہیں ہوں۔ سب کو بتا دو کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، کسی کو ''لارا'' نہیں لگایا، مجھے اپنی بچیوں کا فیوچر کل بھی عزیز تھا اور آج بھی عزیز ہے۔'' ان کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور وہ پلٹ کر ہوا کے سبک جھونکے کی طرح کلاس کے کھلے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ انعم فائل ہاتھ میں لیے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ باقی کی لڑکیاں بھی دم بخود سی کھڑی آہستہ آہستہ ہلتے دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔

☆.....☆

''انعم! تم نے سنا کچھ؟ تمہاری میم شہلا کی ڈیتھ ہو گئی۔'' وہ آخری پیپر دے کر باہر نکلی تو سامنے سے آتی کنزہ سے ٹکرا گئی۔ کنزہ ان کی کلاس فیلو ضرور تھی مگر اس کی سبجیکٹ دوسرے تھے، اس لیے ان کی سلام دعا تو ضرور تھی، مگر گہری دوستی کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ اور اب اس کے مُنہ سے یہ ہولناک خبر سن کر انعم کے ہاتھوں سے چیزیں گر گئیں تھیں۔

''کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو کنزہ۔ میم شہلا کی ڈیتھ؟ کب اور کیسے؟ اور ہمیں کیوں پتا نہیں چلا اس بات کا؟'' انعم کے پیچھے پیچھے ثمن، طیبہ، فاطمہ اور ارم بھی آکر کھڑی ہوگئی تھیں اور ڈوبتے دلوں اور اڑتے حواسوں کے ساتھ اس سے سوال پر سوال کیے جا رہی تھیں۔

''لو، مجھے کیا پتا کہ یہ واقعہ کب پیش آیا، یہ تو میں نے میم تابندہ کو میم فاخرہ کے ساتھ باتیں کرتے سنا تھا تو سوچا کہ تم سے کنفرم کرتی ہوں، بھئی آخر کو تم لوگوں کی تو فیورٹ ٹیم تھیں نا وہ۔ تم لوگوں کو تو پتا ہونا چاہیے تھا۔'' اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو سب ایک دوسری کا مُنہ دیکھنے لگیں۔

''چلو، ہم ابھی میم تابندہ سے پوچھتے ہیں چل کر شاید کنزہ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' ثمن نے اسٹاف روم کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو سب کی سب اسکے پیچھے چل پڑیں، حالانکہ ان سب کے دل بری طرح سے دھڑک رہے تھے، کسی انہونی کا احساس انہیں ابھی سے پریشان کرنے لگا تھا مگر وہ ہر احساس کو ذہنوں سے جھٹکتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔

''ہاں بیٹا! یہ خبر سچی ہے۔ شہلا کی وفات ہو چکی ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ اور سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس کے بابا بھی اس کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہ پائے۔ چند دن پہلے ان کی بھی ہارٹ فیل کی وجہ سے ڈیتھ ہوگئی۔'' میم تابندہ سے اپنے بہتے آنسوؤں میں جذب کرتے ہوئے بڑے ہی دکھ بھرے انداز سے کہا تو وہ سب کی سب بے ساختہ رونے لگیں۔

''لیکن کب میم؟ یہ حادثہ کب اور کیسے ہوا، اور ہمیں اس کی خبر کیوں نہیں ہوئی؟'' ارم نے روتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھ ساتھ سب میم کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

''بس بیٹا۔!! یہ اسی روز کا واقعہ ہے، جس روز اس نے تم لوگوں کو نوٹس دینے کے لیے بلایا تھا۔ وہ تو اپنے وعدے کی بہت پابند تھی، اسی لیے وقت پر ہی اپنے گھر سے نکل پڑی تھی، مگر موت اس سے بھی زیادہ پنکچوئل ہوتی ہے، اور شہلا کا شاید وقت پورا ہو چکا تھا اسی لیے اس کی موت نے اسے راستے میں ہی آن لیا۔ وہ غریب تو کالج پہنچ ہی نہیں سکی اور راستے میں ہی ٹریفک حادثے کا شکار ہوگئی۔ ہمیں بھی اس کی ڈیتھ کی خبر شام کو ملی تھی اور پھر پرنسپل صاحبہ کے حکم پر ہم نے اس خبر کو آپ سب سے چھپا لیا۔ کیونکہ آپ کی شہلا کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ کچھ اس طرح کی ہوچکی تھی کہ ہمیں ڈر تھا کہ اگر آپ کو یہ نیوز اسی وقت دے دی جاتی تو شاید آپ میں سے کئی اسٹوڈنٹس پیپر ہی نہ دے پاتیں، اور اس طرح آپ کے پورے دو سال ضائع ہو جاتے، جو کہ نہ تو ہمیں قبول تھا اور نہ ہی شہلا ایسا چاہتی ہوگی۔ اس لیے بیٹا، ہم نے آپ سب سے آپ کی میم کی موت کی خبر کو چھپا لیا۔'' میم فاخرہ نے افسردگی کے ساتھ انہیں مفصل جواب دیا تو وہ سب رونا دھونا بھول، شاکڈ کے عالم میں انہیں دیکھنے لگیں۔

''.....یہ کیسے ہوسکتا ہے میم۔؟ میم شہلا تو اس دن کالج آئی تھیں، انہوں نے ہمیں نوٹس بھی دیئے تھے، اور یہ، یہ دیکھیں ان کی فائل بھی ابھی میرے پاس ہے جو وہ جاتے جاتے مجھے دے گئی تھیں؟'' انعم نے بے یقینی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔؟ شہلا اور کالج آئی تھی۔؟ ہم نے تو اسے نہیں دیکھا، ویسے اس وقت ٹائم کیا ہو رہا تھا، کچھ یاد ہے آپ لوگوں کو۔؟ '' تابندہ نے بھی چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ وہ سب کی سب بہت الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

''میم۔!! یاد کریں، ایک بج کر بیس منٹ پر آپ نے ہمیں آکر بتایا تھا میم شہلا گھر سے نکل چکی ہیں اور جلد ہی کالج پہنچ جائیں گی۔ پھر آپ چلی گئیں تو یکدم زور کا طوفان آ گیا تھا۔ اتنا شدید طوفان ہم نے تو اپنی لائف میں کبھی نہیں دیکھا، اور پھر اچانک لائٹ بھی چلی گئی تھی۔ پھر جب لائٹ آئی تو ہم نے دیکھا کہ میم شہلا اپنی چیئر پر بیٹھی تھیں۔ اس وقت دو بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے، انہوں نے ہمیں نوٹس دیئے اور پھر وہ واپس چلی گئیں اور ان کے جاتے ہی طوفان بھی تھم گیا اور کالج سے چھٹی بھی ہوگئی، اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میم کالج ہی نہیں آئی تھیں۔ تو پھر ''وہ'' کون تھیں؟''

اور انعم کے اس سوال نے وہاں موجود سب نفوس کو ایک عجیب سے سنسناہٹ کا شکار کر ڈالا تھا۔ میم تابندہ اور میم فاخرہ نے بے یقینی سے بھری خوفزدہ نگاہوں سے ایک دوسری کو دیکھا تھا۔ ان کے رنگ سفید پڑنا شروع ہوگیا تھا، خوف اور دہشت سے ان کی نگاہیں پھٹ سی گئیں تھیں۔ اپنی لیکچرارز کا یہ حال دیکھ کر ان لڑکیوں کی سٹی بھی گم ہوئی جا رہی تھی۔ وہ سب کی سب بے دم ہو کر وہیں بیٹھتی چلی گئیں تھیں۔

''دو بجنے میں دس منٹ۔ مگر وہ اس وقت آپ لوگوں کے پاس کیسے آ سکتی تھی بھلا۔ اس کی گاڑی کی ٹرک کے ساتھ ٹکر تو پونے ایک بجے ہی ہوگئی تھی، اور ٹکر اس قدر شدید تھی کہ اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا، تو پھر کیسے، اور کس طرح.....''

''اور طوفان کب آیا تھا؟ اس روز تو بس معمولی سی بارش ہوئی تھی اور اس سے پہلے تھوڑی سی آندھی چلی تھی، تو پھر آپ لوگ کون سے طوفان کا ذکر کر رہی ہیں۔؟ اور لائٹ تو ایک منٹ کے لیے بھی نہیں گئی تھی اور آپ کہہ رہی ہیں کہ کریک ڈاؤن ہوگیا تھا؟'' میم فاخرہ کی خوف اور حیرت میں ڈوبی آواز نے انہیں اور زیادہ خوفزدہ کر دیا تھا۔ ان کے [illegible] پاس پھر ویسی ہی سرسراہٹیں دوڑنے لگی تھیں۔ میم تابندہ اور فاخرہ بھی چونک گئی تھیں۔ ان کے پاس سے ایک دم [illegible] سرد ہوا کا جھونکا سا گزرا تھا۔ اس جھونکے سے ان کے [illegible] پٹے اور بال یوں لہرائے تھے جیسے وہ کھلے آسمان تلے [illegible] ہوں۔ لڑکیاں خوفزدہ ہو کر چیختی ہوئی ایک دوسری سی لپ [illegible] تھیں۔ ہوا کا جھونکا سرسراتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا تو ان سب کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹ سی گئیں۔ شہلا خون سے بھرے لباس میں، زخم زخم وجود کے ساتھ دروازے کے قریب کھڑی انہیں بے بسی اور کرب سے دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆

''وہ کون تھی؟'' اگر وہ شہلا نہیں تھی تو پھر وہ کون تھی؟ اور اگر وہ شہلا کی روح تھی تو پھر اسے ان لڑکیوں کی مدد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر وہ ان کی مدد کرنے آ بھی گئی تھی تو اس طوفان کی آمد کا کیا مقصد تھا؟ اور اگر طوفان آ بھی گیا تھا تو، صرف ان لڑکیوں کو ہی کیوں دکھائی دیا تھا باقی لوگوں کو سب کچھ نارمل کیوں لگ رہا تھا۔؟؟ یہ ایسے سوال تھے جنہوں نے سب کو اپنی اپنی جگہ جکڑ لیا تھا۔ ان سوالوں کے جواب بظاہر کسی کے پاس بھی نہیں تھے، مگر سب کے دلوں کے اندر کہیں ایک احساس سا ضرور تھا کہ وہ سب شہلا جیسی ذمہ دار اور [illegible] استاد کے احساس ذمہ داری کی بدولت ہی ہوا تھا۔ جن [illegible] نے وہ حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، وہ کتنی دیر تک صدمے کی حالت میں رہی تھیں۔ اور یہی حال ان سب [illegible] کا بھی ہوا تھا جنہوں نے شہلا کو مرنے کے بعد بھی [illegible] آنکھوں کے سامنے زخمی حالت میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ کئی سال گذرنے کے بعد بھی یہ سب سوال سب کے ذہنوں میں جوں کے توں تھے کہ آخر ''وہ تھی کون'' جو فطرت کے قانون سے ٹکرا کر اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے موت سے مہلت مانگ کر واپس زندگی کی طرف چلی آئی تھی۔

☆☆☆

تل کا اشٹاپ

ہارون الطاف

ایک عامل کی زندگی کی کتاب کا ورق؛ جس کا اشٹاپ آج بھی اک قبرستان پر برس رہا ہے

آج ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ میں بہاولپور میں قیام پذیر تھا۔ یہاں چند گھر شدید قسم کے جادو [illegible] آسیب کی لپیٹ میں تھے۔ ان کی زندگی بچانی تھی۔ قصہ مختصر یہ تھا کہ کچھ دن پہلے سویرے سویرے میرے آبائی گاؤں کے

ساتھ والے قصبے سے میرے ایک دوست کی کال آئی۔ وہ کافی پریشان اور گھبرایا ہوا تھا اور شدید بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ شاید مجھ سے کوئی اہم بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ سلام دعا کے بعد میں نے ہی پہل کی۔

''کیوں بھئی خیریت تو ہے۔ آج صبح ہی صبح اور اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ کیا ہوا، گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔'' وہ گھبراہٹ کے عالم میں اور لڑکھڑاتے ہوئے گویا ہوا۔

''ہارون بھائی آپ نے یہاں کب آنا ہے؟ یہاں لوگوں کی جان پر بنی ہوئی ہے لوگوں کی زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ خدا کے لیے تمام کام چھوڑ کر جتنی جلدی ہو واپس آئیں آپ کی مدد سے معصوم لوگوں کی جانیں بچ سکتی ہیں۔'' اس کی بات سن کر میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔

''یار تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ آخر ماجرا کیا ہے؟''

اس نے کانپتی ہوئی اور ڈری ڈری سی آواز میں کہا۔

''ہارون بھائی بات دراصل یہ ہے اپنے قصبے کے پرانے قبرستان سے عشاء کے بعد سے کافی لوگ ڈر گئے ہیں وہ جو گھر قبرستان کے ساتھ ہیں وہ بھی عذاب میں ہیں۔'' رات کو ان گھروں میں قبرستان سے پتھر آتے ہیں اور طرح طرح کی خوفناک آوازیں بھی آتی ہیں۔ جس سے پوری بستی خوفزدہ ہے۔ رات تو رات دن کو بھی لوگ گھروں سے نکلنے سے ڈرتے ہیں۔'' دو تین عامل بھی آئے وہ بھی شدید ناکامی کا شکار ہو گئے۔ ان کا عاملوں کا کہنا تھا کہ پانچ دن پہلے محلے والوں نے عشاء کے بعد کسی انجان اور نقاب پوش آدمی کو قبرستان جاتے دیکھا۔ محلے کے چند لوگ اس کا پیچھا کرتے چلے گئے۔ وہ آدمی قبرستان کے درمیان جا کر بیٹھ گیا اور کوئی خاص عمل پڑھنے لگا جب وہ اپنے عمل میں مگن ہوا تو لوگوں نے اسے پتھر مارے اور اس کا عمل ضائع کرا دیا۔ وہ کوئی سفلی بنگالی جادوگر تھا اور یہ اس کے چلے کی آخری رات تھی۔ عمل ٹوٹنے کی وجہ سے اس کے منہ سے ایک بہت درد اور اذیت بھری چیخ نکلی اور اس کا وجود آگ کی لپیٹ میں آ گیا اور اسی وقت دیکھتے ہی دیکھتے وہ جل کر بھسم ہو گیا۔ پھر وہاں طرح طرح کی وحشت ناک چیخ و پکار شروع ہو گئی اور ان لوگوں پر بارش کی طرح پتھر برسنے لگے۔ بہت مشکل سے وہ لوگ اپنے گھروں کو واپس آئے۔ کچھ کمزور دل یہ منظر دیکھ کر تاب نہ لا سکے اور گر کر وہیں بے ہوش ہو گئے۔ سب کو اپنی اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ رات کا عالم تھا اور جو وہیں گر کر بے ہوش ہوئے کوئی بھی انہیں واپس اٹھا کر لانے کو تیار نہ تھا۔ اس وقت کسی کی جرأت بھی نہ ہوئی کہ قبرستان کی طرف رخ بھی کرے۔ تمام لوگوں پر جیسے موت اور خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ صبح ہوئی تو ان لوگوں کا پتا کرنے چند لوگ قبرستان گئے۔ جب وہاں پہنچے تو تمام لوگوں کے کلیجے منہ کو آ گئے۔ اف میرے اللہ ان لوگوں کے پیٹ پھٹے پڑے تھے۔ آنتیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ آنکھیں دل دل اور گردے بھی نہیں تھے اور لاشیں بھی پہچان کے قابل نہیں تھیں۔

آج پانچواں دن ہے۔ لوگ خوف کے عالم میں زندگی گزار رہے ہیں۔ رات ساری قبرستان سے دل لرزا دینے والی خوفناک آوازیں آتی ہیں۔ خدا کے لیے آپ ہماری مدد کریں۔ انسانی جانوں کا سوال ہے۔

جو قریب کے شہروں سے عامل آئے وہ بھی بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کے واپس ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ہمارے بس کا روگ نہیں آپ کوئی ایسا عامل تلاش کریں جو سفلی بنگالی انجیل اور قرآن کے عملیات کا ماہر ہو یعنی ہر مذہب کے علم کا عامل ہو۔ وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہارون بھائی آپ ہی ہیں جو تمام علوم کے ماہر عامل ہیں۔ لوگ بہت شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے آپ ہماری مدد کریں اور اس مصیبت سے ہمیں چھٹکارا دلائیں۔''

اس کی بات سن کر میں کافی پریشان ہو گیا۔ جہاں پر میں رہائش پذیر تھا۔ انہیں میں نے تمام رام کہانی سنائی اور فوراً واپسی کی تیاری کرنے لگا اور تقریباً ایک گھنٹے بعد وہاں سے روانہ ہوا۔

یہ بابا فرید کی روہی کا علاقہ تھا۔ دو گھنٹے پیدل ریت کے ٹیلوں پر چلنے کے بعد ہم لوگ ایک سنسان سڑک پر آ گئے۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد دور سے ایک رکشا آتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر ہم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کو کہا۔ بات چیت کرنے کے بعد میں اس

رکشے میں بیٹھ گیا اور ان صاحبان کو جو مجھے چھوڑنے آئے تھے انہیں اللہ حافظ کہہ کر رکشے والے کو چلنے کے لیے کہا۔

رکشے والے نے ایک گھنٹے بعد مجھے بہاولپور لاری اڈے پر پہنچا دیا۔ وہاں ایک فلائنگ کوچ کھڑی تھی۔ گاڑی نے بہاولپور سے ملتان، جھنگ اور جھنگ سے جوہر آباد آنا تھا۔ میں نے ڈائریکٹ جوہر آباد کا ٹکٹ خریدا اور اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد گاڑی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میری پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کسی اڑن طشتری میں بیٹھ کر اسی وقت ان لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں جو پریشانی کے عالم میں میرا انتظار کر رہے ہیں جو حسرت بھری نگاہوں سے میری راہ دیکھ رہے ہیں۔

بالآخر گاڑی نے ملتان آ کر اسٹاپ کیا۔ تھوڑی دیر رکھنے کے بعد پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ مجھے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ میں بغیر ناشتا کیے ہی وہاں سے روانہ ہوا تھا لیکن میں نے کھانا کھانے سے جان بوجھ کر پرہیز کیا۔ اپنا پیٹ بھرنے سے زیادہ مجھے ان لوگوں کی فکر ہو رہی تھی جو پریشان حال تھے۔

میرے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ نہ جانے ان بے چاروں نے خوف کی وجہ سے کچھ کھایا پیا بھی ہو گا یا نہیں۔ نہ جانے وہ مظلوم کتنے دنوں سے ڈر اور اذیت میں گھٹ گھٹ کر سانسیں لے رہے ہوں گے، نہ جانے میری کتنی مائیں بہنیں بوڑھوں اور بچوں کی نگاہیں میری راہ تک رہی ہیں اور اس آس پر ہیں کہ نہ جانے کب ہمارا مسیحا آئے گا اور ہمیں اس مصیبت سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائے گا۔ میرا دوست مجھ سے فون پر باقاعدہ رابطے میں تھا۔

قصہ مختصر گاڑی نے جھنگ آ کر اسٹاپ کیا اور پھر جوہر آباد کی طرف روانہ ہوئی۔ سفر کافی لمبا تھا اور گاڑی بھی کسی ضعیف مسافر کی طرح تھکی تھکی سی چل رہی تھی۔ آخر مسافروں کے اصرار پر ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

اللہ اللہ کر کے ہم جوہر آباد لاری اڈے پر پہنچ گئے۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا جس میں میرے کپڑے اور علمیات کی کتابیں تھیں۔ گاڑی سے نیچے اترا تو سامنے میرا دوست میرا منتظر تھا۔ خیر وہ خوش تپاکی سے مجھے ملا۔ کھانے کا پوچھا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اس نے چائے کا اصرار کیا اور قریب کے ایک ہوٹل میں ہم نے چائے پی۔ چائے پینے کے بعد ہم کار میں بیٹھے اور منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

رات کا ایک بجنے والا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اپنے دوست کے گھر پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد بات چیت ہوئی اور ہم سو گئے۔ نماز فجر کے وقت آنکھ کھلی نماز ادا کی اور میں اپنے بستر پر آ کر قرآن کی تلاوت کرنے لگ گیا۔

ناشتے کے بعد ہم ان لوگوں کے گھر فاتحہ خوانی کے لیے بھی گئے جن کے پیاروں کی موت قبرستان کی مخلوق کی وجہ سے ہوئی تھی۔

جب ہم گھر واپس آئے تو پورا محلہ عورتیں کیا اور مرد کیا مجھ سے ملنے میرے دوست کے گھر آئے بیٹھے تھے۔ تمام نے مجھے اٹھ کر سلام کیا اور میں ان کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

قصہ کہانی سننے کے بعد میں نے انہیں بھرپور تسلی دی کہ میں آ گیا ہوں چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے لیکن آپ لوگوں کی حفاظت بھی کروں گا اور ان آفات سے تا زندگی چھٹکارا بھی دلاؤں گا۔ وہ کافی دیر میرے پاس بیٹھے رہے۔ کچھ لوگ بیمار تھے تو میں نے انہیں دم کیا۔ غرض کہ لوگ آتے رہے اور میں انہیں دم کتا رہا یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا۔

☆.....☆

عصر کی نماز پڑھنے کے بعد میں اپنے دوست کے ساتھ قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں اس عامل کی موقت واقعہ ہوئی تھی۔ کیونکہ رات کو میں نے اسی جگہ بیٹھ کر عمل کرنا تھا۔ یہ قبرستان کا سینٹر تھا۔ چار قبروں کے درمیان تقریباً بیس فٹ کی چوڑی سی جگہ تھی پورا قبرستان بہت پراسرار تھا۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد ہم نے واپسی کا راستہ اختیار کیا اور گھر آ گئے۔

شام کو میں نے اپنے دوست سے پانچ کلو گوشت بغیر ہڈی کے منگوایا جسے میں نے رات کو عمل کے لیے ساتھ لے کر جانا تھا۔

نماز عشاء کے بعد پورا محلہ پھر سے میرے پاس جمع

ہوگیا۔ میں نے قبرستان جانے کی تیاری شروع کردی۔ میں نے ایک سرسری سی نظر سب پر ڈالی اور انہیں تسلی دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

میں نے انہیں الوداعی سلام کیا۔ گوشت پکڑا اور ایک تیز دھار چھری لے کر قبرستان کی طرف روانہ ہوگیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور رات کا اندھیرا اپنے عروج پر تھا۔ ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔

جیسے ہی میں نے قبرستان کی حدود میں پاؤں رکھا تو جیسے زلزلہ سا آگیا ہو میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہر طرف پرانی قبریں ہی قبریں تھیں۔ تاریخ کے لحاظ سے یہ قبرستان پانچ سو سال پرانا تھا۔ عجیب پراسرار سا ماحول تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں قبرستان کے درمیان اس جگہ موجود تھا جہاں اس عامل کی موت واقع ہوئی تھی مجھے اپنی سانسوں اور دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اللہ کو یاد کیا اور ایک شدید قسم کا عمل پڑھ کر چھری کی نوک پر دم کیا اور اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھینچا۔ گوشت کا تھیلا بھی حصار کے اندر ہی رکھ لیا۔

میں نے گوشت کا تھیلا کھولا اور ہر بوٹی پر عمل پڑھ کر حصار سے باہر پھینکنے لگا۔ دراصل یہ عمل ان بدروحوں اور جنات کو حاضر کرنے کے لیے تھا جنہوں نے لوگوں کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔

پہلی بوٹی پھینکتے ہی مجھے اپنے ارد گرد سائے منڈلاتے دکھائی دیئے۔ جیسے جیسے میں عمل پڑھتا جارہا تھا اور گوشت پھینکتا جارہا تھا ویسے ویسے سائے بڑھتے جارہے تھے وہ سائے اپنی اصلی شکلیں اختیار کرتے جارہے تھے۔ وہ اپنے خوفناک چہروں کے ساتھ اور دل ہلا دینے والی چنگھاڑوں کے ساتھ گوشت پر پاگلوں کی طرح جھپٹ رہے تھے۔

وہ پہلے بھوتوں کی شکل میں نمودار ہوئے جن کے ناک ماتھے پر ہاتھی کی سونڈ جیسے تھے۔ آنکھوں کی جگہ گہرے سوراخ تھے جن سے آگ کے شعلے برس رہے تھے۔ بھیڑیے جیسے دانت اور سانپ جیسی زبان ان کے قد دو تین فٹ سے زیادہ نہ تھے۔

پھر چڑیلیں آئیں جن کے ہاتھی جیسے بڑے بڑے دانت باہر کو ہوئے تھے۔ جسم پر بندروں جیسے بال تھے اور چوڑیوں تک لمبی تھی۔ بہت بڑے بڑے ہاتھ اور پیچھے کو مڑے ہوئے تھے۔ منہ سے نہایت لیس دار خون ٹپک رہا تھا۔ پھر جنات اپنی بھیانک شکلوں سے نمودار ہوئے۔ ان کے ماتھے پر الو جیسی گول مٹول آنکھیں بر[illegible] نام سی ناک گائے جیسے کان چوپائیوں جیسے پاؤں

وہ پھر بولی پر پاگلوں کی طرح جھپٹ رہے تھے۔ ایسے جیسے انہوں نے زندگی میں پہلی بار گوشت دیکھا ہو یا جیسے صدیوں سے بھوکے ہوں۔

میں اپنے عمل میں مگن تھا اور میرے ارد گرد خبیث جنات اور بدروحوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ وہ تمام میرے سامنے حاضر تھے اور بہت غصے میں تھے۔ ''میں اکیلا ان درندوں میں گھر چکا تھا۔ وہ پگلوں کی طرح گوشت پر جھپٹ رہے تھے ان کی وحشت ناک دل ہلا کر رونگٹے کھڑے کردینے والی چنگھاڑوں سے پورا قبرستان لرز رہا تھا۔''

بالآخر گوشت کے ختم ہوتے ہی ان کی حاضری کا عمل بھی اختتام پذیر ہوا۔ وہ تو جیسے گوشت ختم ہونے کا انتظار کررہے تھے وہ تمام ایک ہی بار زور دار چنگھاڑ مارتے مجھ پر حملہ آور ہوئے لیکن حصار سے ٹکرانے کے بعد دور جا گرے۔

پھر انہوں نے مجھ پر آگ کے گولے اور شعلے برسائے لیکن وہ بھی حصار سے ٹکرانے کے بعد غائب ہو گئے پھر وہ پتھروں کی بارش مجھ پر برسانے لگے لیکن پتھر بھی حصار کے اندر نہ آسکے وہ مجھے نقصان دینے کے لیے ہر طرح کے حربے کررہے تھے لیکن سب بے سود، پھر یکدم انہوں نے خاموشی اختیار کرلی۔ پھر ان کے سردار جو کہ نہایت بھیانک شکل کے تھے مجھ سے ہمکلام ہوئے۔

''اے آدم زاد تم نے ہمیں بے بس کردیا ہے۔ بے شک ہم طاقت ور اور تعداد میں تم سے زیادہ تھے اور تم اکیلے ہم تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ پائے۔ بتاؤ ہم تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں۔''

میں نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔ معصوم انسانوں کی جانوں سے کھیلنا چھوڑ دو۔ آج کے بعد کسی انسان کو تمہاری وجہ سے تکلیف نہ ہو اور نہ ہی کسی کی جان

جائے۔ میں مانتا ہوں انہوں نے نادانی کی جس وجہ سے اس عامل کی جان گئی لیکن ان کی نادانی کی انہیں اتنی بڑی سزا تو نہ دیں کہ وہ معصوم تمہارے خوف اور ڈر سے گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوجائیں۔

میری بات سن کر وہ سردار غصے میں آگ بگولا ہوگئے اور کہا ہم نہیں مانتے تمہاری یہ بات۔ انہوں نے عمل تڑوا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ عامل ہمارا محسن تھا۔ ہمارا خیال رکھتا تھا ہم اسی کے ماتحت کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے اس کی جان چلی گئی۔ ہم ہرحال میں انہیں اس جرم کی سزا دیتے رہیں گے۔

ان کی بات سن کر میں بھی حد سے زیادہ آتش مزاج تھا اور میں شدید غصے میں آگیا اور کہا کہ اچھا گھی سیدھی انگلی سے نہیں ٹیڑھی انگلی سے نکلے گا۔ میں سمجھا پیار سے مسئلہ حل ہوجائے گا لیکن تم لاتوں کے بھوت ہو باتوں سے نہیں مانو گے۔

میں آخری بار آپ سے کہہ رہا ہوں میری بات مان لیں اور باز آجائیں۔

''ورنہ!''

''ورنہ کیا۔'' ان کے سردار غصے سے چنگھاڑے ہوئے بولے۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو آپ کی اور میری کھلی جنگ شروع ہوجائے گی جس میں آپ تمام کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ ایسا نہ ہو مجھے آپ سب کو جلا کر بھسم کرنا پڑے۔''

''آپ کر لو جو کرنا ہے، میں نے آپ سے جو کہا وہ پورا ہو کر رہے گا۔'' ان سرداروں میں سے ایک نے مجھے چتاونی دی۔

خیر جب وہ کسی طرح نہ مانے تو میں نے بھی ان سے اعلان جنگ کردیا۔

میں نے اپنی ماتحت مخلوق کو بلانے کا عمل پڑھنا شروع کردیا تاکہ وہ آکے میری مدد کریں۔

پہلے تو میں نے اپنے سفاک قسم کے تین جنات بلائے جو کہ غصے اور درندگی کے لحاظ سے ان بدروحوں کے مقابلے میں چار ہاتھ آگے تھے۔

پھر میں نے اپنی ایک نہایت طاقت ور موکلہ فضائیہ کو بلایا جو کہ اپنے قبیلے کی سردار تھی۔ میں نے [illegible] سب سے طاقت ور تعل بادشاہ کو بلایا جو کہ ایک بڑا دیو تھا۔ جس کا اور پنجل قدوس ہاتھیوں جتنا بڑا تھا۔ جس کا جسم ہاتھی جیسا، آنکھیں الو جیسی بہت بڑی۔ چمگادڑ جیسے پر سر پر دو سینگ، یہ جتنا خوفناک تھا اتنا ہی طاقت ور بھی تھا۔

یہ تمام اپنے اپنے قبیلے کے سردار تھے اور اپنے لشکروں کے ساتھ میری مدد کو آئے تھے۔ میں نے انہیں ساری بات سمجھائی اور حکم دیا کہ ان درندوں نے معصوم انسانوں کی جانیں لی ہیں اور مزید بھی نقصان کے درپے ہیں میں نے ان سے اعلان جنگ کردیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔

انہوں نے یکجا ہو کر کہا۔ ''جیسے آپ کا حکم۔''

اگلے ہی پل دیکھتے ہی دیکھتے خیر اور شر کی خونریز جنگ شروع ہوگئی۔

میں حصار میں بیٹھا اپنی ماتحت مخلوق کی حفاظت اور ان کی طاقت بڑھانے کے لیے شدید قسم کا عمل پڑھنے لگا۔ پورا قبرستان خوفناک اور دل ہلا دینے والی چنگھاڑوں سے لرز رہا تھا۔ دونوں طرف سے کافی دیر گھمسان کی جنگ جاری رہی۔ میری چیزوں نے ان تمام جنات بھوتوں اور بدروحوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پھر جنگ سرد ہوتی چلی گئی اور میری تابع ہوائی مخلوق نے انہیں اپنے قبضے میں لے لیا اور میرے سامنے حاضر کردیا۔

میں نے ایک جان لیوا اور شدید قسم کا عمل پڑھا اور ان درندہ صفت بدروحوں اور جنات کی طرف اور ان کے اردگرد آگ کا حصار باندھا۔

اگلے ہی پل میں نے پھر آیت الکرسی اور نادِ علی کا ایک عمل پڑھا اور ایک زوردار پھونک ان کی طرف ماری تو یک لخت آگ کے شعلوں نے حصار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ ہر طرف دل دہلا دینے والی دردناک چیخ و پکار تھی۔ تھوڑی دیر بعد آگ ٹھنڈی ہوگئی اور وہ بھسم ہوتے چلے گئے۔

اور یوں وہ درندہ صفت جنات اور خونی بدروحیں میری آنکھوں کے سامنے واصلِ جہنم ہوگئے۔

میں نے جوش میں آکر یا علی مدد کا زوردار نعرہ فضا میں بلند کیا اور اپنے حصار سے باہر آگیا۔

☆☆☆

نیم والے بابا جی!

نازیہ بتول رضا

اک ایسی برگزیدہ ہستی کی داستانِ عجب جو آج بھی اُس نوجوان کی کامیابی ہے

آج جمعہ کا دن تھا اور حسب معمول جمیلہ بیگم کی صبح منہ اندھیرے ہو چکی تھی۔ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر انہوں نے آٹا گوندھ کر رکھا۔ چولھے پر چائے کا پانی چڑھایا اور جھاڑو سنبھال کر پہلے صحن میں چلی آئیں۔ ایک طائرانہ نظر چاروں اطراف دوڑائی کچے صحن میں جا بجا بیری کے پتے اور لال پیلے بیر بکھرے پڑے تھے۔

یوں تو کہنے کو بیری کا پیڑ پچھلے گھر میں تھا لیکن پورا جمیلہ بیگم کے گھر چھایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے گھر میں سایہ بھی تھا اور پھر ابھی وہ صبح و شام صحن کو چکانی اور پانی چھڑکتی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے گلاب، موتیا اور بیلا بھی لگایا ہوا تھا جس کی دیکھ بھال وہ جی جان سے کرتیں اور جب موتیا کھلتا اور تو وہ بڑے چاؤ سے اس کے پھول کانوں میں پہنتی بس یہ ہی تھے ان کے شوق۔ ویسے تو سارا دن وہ اپنے بچوں اور شوہر کی خدمت میں لگی رہتیں۔ ماشاء اللہ ایک درجن بچے تھے ان کے لیکن چونکہ وہ پرانے زمانے کی عورت تھیں تو بحسن و خوبی ان سب کو پال رہی تھیں۔ پہلے کے زمانے میں یوں بھی لوگ سادہ ہوا کرتے تھے۔ زندگی بہت آسان تھی۔ لوگ فضول خرچی سے اجتناب کرتے تھے تو زندگی بہت سہل گزرتی تھی۔ جمیلہ بیگم کے شوہر طاہر صاحب بھی معمولی کاروبار کرتے تھے۔ جس سے ان کی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ بچے بھی جو ملتا کھا لیتے۔ کبھی کوئی فرمائش نہ کرتے اور خود جمیلہ بیگم بھی قناعت پسند تھیں۔ جس حال میں تھیں خوش تھیں۔ دو کمروں اور ایک کچے صحن پر مشتمل گھر میں وہ بہت خوش اور مگن تھیں۔ پودے اور درخت صرف ان کے گھر کے اندر ہی نہیں تھے بلکہ گھر کے باہر دروازے کے ساتھ نیم کا عالیشان درخت ایستادہ تھا جو بڑی ٹھنڈی چھاؤں دیا کرتا تھا۔ جمیلہ بیگم اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے دروازے پر نیم کے سائے تلے چبوترے پر براجمان ہو جاتیں اور پھر ایک ایک کر کے محلے کی ساری عورتیں نکل آتیں اور سب اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے سے بیان کرتیں۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں اور سب کے بچے اکھٹے ماؤں کے سامنے کھیلا کرتے اور پھر یہ محفل کافی دیر تک جما کرتی۔

اس دن بھی جمیلہ بیگم نے صحن صاف کر کے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ پودوں کو پانی دیا اور باورچی خانے کا رخ کیا۔ طاہر صاحب کے جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ چائے بن چکی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی روغنی روٹی بنائی دودھ سے بالائی اتار کر اس میں چینی ملائی تب تک طاہر صاحب پیڑھی پر آ کر بیٹھ چکے تھے۔ جمیلہ بیگم نے ناشتا ان کے سامنے رکھا اور پیالی میں چائے انڈیلی تبھی طاہر صاحب بولے۔

”یہ بچے آج ابھی نہیں اٹھے نیستی پھیلا رہے ہیں۔ اٹھاؤ ان سب کو۔ ہزار بار کہا ہے کہ صبح جلدی اٹھا کریں لیکن نہیں بھئی مجال ہے جو ایک دفعہ کی بات سن لیں۔“

”بچے تو روز صبح جلدی اٹھتے ہیں آج پتا نہیں.....“ اور ان کی بات منہ میں ہی رہ گئی کیونکہ بچے جاگ چکے تھے اور اب ایک ایک کر کے منہ دھو رہے تھے۔ کوئی باتھ روم میں تھا تو کوئی صحن میں لگے نل سے منہ دھو رہا تھا۔ جمیلہ بیگم طمانیت سے مسکرا دیں اور تیزی سے بچوں کے لیے ناشتا تیار کرنے لگیں۔

بچے ایک ایک کر کے ناشتا کرنے لگے طاہر صاحب اپنے کام پر روانہ ہو گئے لیکن جانے سے پہلے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا نہ بھولے۔

”خبردار شرارت نہ کرنا۔ باہر آوارہ گردی نہ کرنا اور انسانیت سے رہنا۔“ بچے بھی عادی ہو چکے تھے اسی لیے خاموش رہے بڑا بیٹا زاہد باپ کے ساتھ ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس کی عمر اس وقت اٹھارہ برس تھی۔ اس کے بعد دو، دو سال چھوٹے بہن بھائی تھے اور دو بھائیوں کی وفات کے بعد اب یہ دس بہن بھائی تھے۔ پانچ بہنیں اور پانچ بھائی زاہد، صابر، عابد، ساجد اور راشد (بہنوں کے نام کی یہاں ضرورت نہیں) زاہد اپنے بابا کے ساتھ کام پر چلے جاتے باقی سب گھر پر ہی رہتے اور کھیل کود کر وقت گزارتے۔

بچوں کو ناشتا کروا کر جمیلہ بیگم نے جلدی سے برتن سمیٹ کر دھوئے گھر کی صفائی ستھرائی کی آج کھانا سب کو اکھٹے کھانا تھا کیونکہ جمعہ کی نماز ادا کر کے طاہر صاحب بھی گھر آ کر ہی بچوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ خیر سب کاموں سے فارغ ہو کر جمیلہ بیگم نے کھانا تیار کیا سب نے نماز سے فراغت کے بعد کھانا کھایا طاہر صاحب اپنی دوکان پر لوٹ گئے اور جمیلہ بیگم کچن سمیٹ کر باہر نیم کے سائے تلے بیٹھک جمانے آ بیٹھیں۔ رفتہ رفتہ سارے دروازے کھلنے لگے اور دیکھتے دیکھتے ساری محلے کی عورتیں جمع ہو گئیں اور ان کے بچے بھی آ گئے۔ عورتیں اپنی اپنی باتوں میں مگن ہو گئیں اور بچے مل کر کھیلنے لگے۔ عورتیں مطمئن تھیں کہ بچے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور بچے ماؤں کی وجہ سے مطمئن تھے۔ کھیلتے کھیلتے عابد کو نجانے کیا سوجھی کہ اس نے ایک لمبی سی تیلی لی اس کے ایک سرے پر پتھر باندھا اور نیم کی شاخ پر لنگر ڈالا نجانے یہ کون سا کھیل تھا؟ جمیلہ بیگم کی نظر پڑی عابد نے سفید کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سر پر جالی والی ٹوپی تھی جو نماز کے بعد بھی پہن رکھی تھی اور

آج تو بابا کے ساتھ عطر بھی لگایا تھا۔ بڑا پیار آیا دیکھ کر جمیلہ بیگم نے نظروں ہی نظروں میں بچے کی بلائیں لے ڈالیں محض بارہ برس کا تو تھا وہ بے حد شرارتی۔ جمیلہ بیگم نے اسے جب پیڑ کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے دیکھا تو اسے ٹوکا نہ بیٹا ایسا نہیں کرتے اور پھر سے باتوں میں مگن ہوگئیں اور عابد نے پھر سے لنگر ڈالنا شروع کر دیا۔ کھیلتے کھیلتے نجانے کیا ہوا کہ عابد دھڑام سے گر پڑا آواز سنتے ہی جمیلہ بیگم کی نظریں بے اختیار اٹھیں اور بے سدھ گرے عابد پر جا ٹکیں وہ جلدی سے دوڑیں۔

''ارے کیا ہوا میرے بچے کو؟ عابد اٹھو کیا ہوا۔'' کہہ کر حواس باختہ سی اسے اٹھانے لگیں لیکن۔ عابد تو بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا انہوں نے پریشان ہو کر بچوں کی طرف دیکھا کہ شاید کسی بچے نے لڑائی میں یا شرارت میں دھکا دیا ہو لیکن بچے خود سہمے ہوئے گم صم تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر عابد کو ہوا کیا تھا؟ وہ کیوں بے ہوش ہو گیا تھا؟ لیکن جمیلہ بیگم کے پاس ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ انہیں تو بس عابد کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ جمیلہ بیگم کی تو عقل سمجھ کام کر نہیں رہی تھی۔ ایک عورت نے عابد کو گود میں اٹھایا اور گھر کے اندر لے گئی۔ جمیلہ بیگم کی بھی پیچھے بھاگیں۔ پھر اندر جا کر عابد کو ہوش میں لانے کے جتن ہونے لگے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تو عابد نے آنکھیں کھول دیں اور گم صم سا اٹھ بیٹھا۔ جمیلہ بیگم بیٹے کو اٹھتے دیکھ کر جلدی سے ہلدی والا دودھ لے آئیں۔

''کیا ہوا تھا میرے بیٹے کو؟ کہاں چوٹ لگی ہے؟'' جمیلہ بیگم عابد کا چہرہ ہاتھوں میں لیے پوچھ رہی تھیں اور عابد ٹکر ٹکر سب کو دیکھ رہا تھا کیونکہ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا ہوا تھا۔ وہ تو لنگر ڈالتے ڈالتے گر پڑا تھا جیسے کسی نے دھکا دیا ہو لیکن دھکا دینے والا دکھائی نہیں دیا تھا۔ عابد کو گم صم دیکھ کر جمیلہ بیگم کا دل بیٹھنے لگا۔ عجیب عجیب وسوسے ذہن و دل میں کلبلانے لگے کہیں میرے بیٹے پر کوئی اثرات تو نہیں ہو گئے؟ اس نے آج خوشبو بھی تو لگا رکھی تھی۔ میں منع بھی کرتی ہوں لیکن میری سنتا کون ہے اور پھر وہ نیم کا درخت بھی تو ہے شاید اس پر سے کچھ؟ نہیں نہیں وہ خود ہی اپنے خیال کی نفی کرنے لگیں اور عابد کو دودھ کا گلاس ختم کروایا اور سلانے لٹا دیا۔ عورتیں کو بڑی مشکل سے گھروں کو بھیجا سب اپنی اپنی ہانک رہی تھی۔ زیادہ تر کا کہنا یہ ہی تھا کہ عابد پر اثر ہو گیا ہے لیکن جمیلہ بیگم نے سب کو خاموش کروا دیا اور سب گھروں کو روانہ ہو گئیں۔ جمیلہ بیگم دیر تک سوئے ہوئے عابد کو تکتی رہیں۔

شام کو عابد کو تیز بخار ہو رہا تھا۔ جمیلہ بیگم ہول کر رہ گئیں جلدی سے بخار کی دوا پلائی۔ جمیلہ بیگم نے طاہر صاحب کو کچھ نہ بتایا کہ کہیں وہ غصہ نہ کریں اندر ہی اندر ہولتی رہیں۔ عابد کے بخار نے تین دن لے لیے اب عابد زیادہ تر خاموش خلاؤں میں دیکھتا رہتا یا پھر اکیلا کھیلتا اور ضدی تو انتہا درجے کا ہو گیا تھا۔ جس چیز کی ضد پکڑ لیتا وہ ہر حال میں چاہیے ہوتی۔ یہاں تک کہ اپنی ضد منوانے کے لیے وہ صحن میں تپتی دھوپ میں جلتے فرش پر لیٹ جاتا۔ جمیلہ بیگم لاکھ مناتیں لیکن وہ ضد پوری کیے بنا نہ ہٹتا وہ حیران ہوتیں کہ عابد کو آخر ہوا کیا ہے یہ پہلے تو ایسا نہ تھا اور پھر جلتی زمین پر کوئی نارمل بچہ اتنی دیر نہیں لیٹ سکتا۔ کبھی کبھی انہیں لگتا کہ جیسے محلے کی عورتوں کی بات ٹھیک ہی تھی کہ عابد پر اثرات ہو گئے ہیں لیکن پھر اپنے اس خیال کی وہ سختی سے نفی کر دیتیں۔ نہیں میرا بیٹا تو غازی ہے ایسا ویسا کچھ نہیں ہو سکتا لیکن پھر عابد کی خاموشی گم صم رہنا اور سب سے بڑھ کر دھوپ میں دو دو گھنٹے جد پکڑ کر لیٹ جانا جمیلہ بیگم کے خیال کی تصدیق کر دیتا لیکن وہ حقیقت سے آنکھیں چرا رہی تھیں لیکن کب تک آخر ایک مہینے بعد ہی یہ عقدہ کھل گیا۔

ہوا یوں کہ گلی میں کسی کے گھر محفل سماع تھی۔ بہت بڑے بڑے نامور قوال آ رہے تھے۔ رات بھر کا پروگرام تھا۔ جمیلہ بیگم بھی بچوں کو لیے پہنچ گئیں۔ آدھی رات تک محفل عروج پر پہنچ گئی۔ ایک نامور قوال نے جب اپنا کلام شروع کیا تو ایک سماں بندھ گیا۔ سب جھومنے لگے اور پھر جمیلہ بیگم نے دیکھا کہ عابد جو کبھی کبھار ہی قوالیاں سنتا تھا نے دھمال ڈالنا شروع کر دیا لیکن یہ عابد تو ہرگز نہیں لگ رہا تھا یہ..... یہ عابد کو آج کیا ہو گیا ہے جو اتنا مست ہو کر دھمال ڈال رہا ہے وہ اپنے ہوش میں بالکل نہیں تھا۔ لوگ قوال پر پیسے برسا رہے تھے اور جمیلہ بیگم ایک ٹک عابد کو تک رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ سب عابد کی طرف متوجہ ہو گئے قوال بھی خاموش ہو کر عابد کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ کچھ صورتحال اس کو سمجھ آ رہی تھی کہ عابد اسی طرح چلتا ہوا قوال

کے پاس پہنچا۔

''بولو کیا چاہتے ہو۔'' عابد اس وقت بھی ہوش و فرد سے بے گانہ تھا عابد کی بات سن کر قوال کی محویت ٹوٹی اس نے سوچا یہ ہی موقع ہے وہ سمجھ چکا تھا کہ کسی کی حاضری ہوئی ہے یہ بچہ اپنے آپ میں نہیں ہے جھٹ بولا۔

''بس مدت سے حج کی آرزو ہے۔ اللہ کا گھر دیکھ آؤں بس یہ ہی خواہش ہے۔''

''وہ تو تم اسی سال کر لو گے کچھ اور بولو۔'' عابد کسی اور ہی لب و لہجے بول رہا تھا۔ مجمع پر سکتہ طاری تھا۔ جمیلہ بیگم حواس باختہ سی کھڑی کی کھڑی رہ گئیں آگے بھی نہ بڑھ سکیں یعنی ان کا خدشہ صحیح عابد پر کچھ.....

قوال نے جلدی سے بڑھ کر عابد کے ہاتھ تھام کر چوم لیے رونے لگا۔

''بس بس مجھے کچھ اور نہیں چاہیے اگر آپ کا کرتا مل جائے تو یہ ہی پہن کر کرچ کروں گا۔'' قوال کی خواہش نرالی تھی۔ عابد نے اپنا کرتا اتار کر قوال کو تھمایا تو قوال نے ہمت کر کے پوچھا۔

''اپنا نام تو بتا دیجیے۔'' عابد نے کہا۔

''ہم حمید بابا ہیں ٹھٹے والے! اگلا محفل سماع تمہیں طاہر کے گھر کرنا ہے جمعرات کے دن۔'' یہ کہہ کر عابد بے ہوش ہو گیا۔ جمیلہ بیگم دوڑیں۔

''ارے کوئی پانی لاؤ دیکھو میرے بچے کو کیا ہوا ہے۔'' پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لائیں تو وہ بالکل نارمل تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو ہاں قوال کی دنیا بدل چکی تھی۔ وہ اشک بہاتے ہوئے کرتے کو چوم رہا تھا۔

☆.....☆

اڑتے اڑتے یہ خبر طاہر صاحب کے کانوں میں پڑی کہ محفل سماع میں عابد کے ساتھ کیا معاملہ ہو گیا تھا۔ وہ فوراً تصدیق کے لیے جمیلہ بیگم کے سر پر جا پہنچے۔ جمیلہ بیگم طاہر صاحب سے بہت ڈرتی تھیں۔ سٹپٹا گئیں لیکن پھر سچائی بتائے بنا چارہ بھی نہ تھا۔ سو بتانا پڑا۔ طاہر صاحب سب سن کر سوچ میں ڈوب گئے۔ جمیلہ بیگم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ کی۔ ''اور جی جمعرات کو ہمارے گھر محفل سماع ہونی ہے انہوں نے کہا تھا۔''

''کس نے..... کس نے کہا تھا؟'' طاہر صاحب چونک پڑے۔

''وہ..... وہ بابا جی نے۔'' جمیلہ بیگم ڈری سہمی بول رہی تھیں مبادا طاہر صاحب غصہ کرنے لگیں۔

''اچھا یعنی اب ہم یہ خرچے بھی خود کریں گے یا وہ تمہارے بابا جی خرچ کریں گے۔''

''کیسی بات کر رہے ہیں محفل سماع ہمارے گھر ہو گی تو خرچہ بھی ہمیں ہی کرنا ہو گا ناں۔''

''لو اب یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی لیکن کان کھول کر سن لو یہ پہلی اور آخری بار ہو گا۔ اس کے بعد میں کوئی خرچہ کرنے والا نہیں اور ہاں اس کا بھی مجھے کچھ فائدہ نظر آنا چاہیے بے مقصد کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' طاہر صاحب یہ کہہ کر بھناتے ہوئے چلے گئے اور جمیلہ بیگم نے سکھ کا سانس لیا ورنہ وہ اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں تھے۔

☆.....☆

آج گھر میں محفل سماع تھی۔ جمیلہ بیگم صبح ہی سے کام میں مگن تھیں گھر کی دھلائی، صفائی، ستھرائی غرے انہوں نے کمروں میں چاندنی بچھا دی تھی تاکہ عورتیں اندر بیٹھ سکیں۔ مردوں کے لیے باہر انتظام کیا گیا تھا۔ بڑے بیٹوں زاہد اور صابر نے باہر کے انتظامات سنبھالے ہوئے تھے۔ طاہر صاحب بڑی خاموشی سے سب دیکھ رہے تھے۔ اصل میں وہ فطرتاً لالچی واقع ہوئے تھے۔ ابھی بھی اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں ان کی لالچ ہی معاون تھی۔ انہیں لگتا تھا کہ جیسے بابا جی کو خوش کر کے وہ مالا مال ہو جائیں گے۔ ان کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ قصہ مختصر شام ہوتے ہوتے آہستہ آہستہ لوگ جمع ہونے لگے۔ دور و قریب سے جہاں تک بھی عابد کے قصے گئے لوگ آتے گئے آج شاید سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے کہ حقیقت کیا ہے انہی میں کچھ شرارتی گلی کے بچے بھی تھے جو یہ سب دیکھ رہے تھے لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس دن عابد کو ہوا کیا تھا۔ ایسا دھمال تو اس نے کبھی نہیں ڈالا تھا۔ اس سے پہلے بھی علاقے میں کئی بار محفل سماع ہو چکی تھی اور وہ سب بچے شریک بھی ہوئے تھے۔ لیکن عابد کا یہ روپ انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا اکثر بچے اسے ڈرامے بازی سمجھ رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ حقیقت جلد از جلد آشکار ہو جائے یا یوں کہہ لیں کہ بچہ ہونے کے

ناتے عابد کے اتنے چرچے اور پذیرائی وہ سہہ نہیں پا رہے تھے جو بھی تھا وہ جلد از جلد حقیقت جاننا چاہ رہے تھے۔

بہرحال قوال آئے، محفل شروع ہوئی تھوڑی ہی دیر میں عابد پر وہ کیفیت طاری ہوگئی سب چونکنے ہو گئے۔ سب کی نظریں قوال سے ہٹ کر عابد پر ٹک گئیں۔ مجمع پر سکتہ طاری تھا۔ ادھر مکمل ماحول بن چکا تھا اور باہر وہ ہی شرارتی بچے عابد کی پول کھولنے کی مکمل تیاری کر رہے تھے۔ ان کا پلان تھا کہ عابد پر جس وقت یہ کیفیت طاری ہوگی تو وہ اس کے قریب جا کر اسے سوئیاں چبھوئیں گے جس سے اسے تکلیف ہوگی اور وہ ساری ڈرامے بازی بھول جائے گا اور حقیقت کھل کے سب کے سامنے آجائے گی اور انہیں عابد پر ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔ ان کے اس منصوبے کے بارے میں سوائے ان چاروں کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ آج کیا کرنے والے ہیں۔ ادھر عابد پر جو چیز تھی اسے سب خبر ہوگئی اور جلال میں آگئے۔ بڑے غصے میں ان چاروں کا نام لے کر انہیں بلوانے کو کہا کوئی جا کر ان چاروں کو بلا لایا۔ سب حیران پریشان ہو گئے کہ بابا نے ان بچوں کو کیوں بلوایا ہے۔ خود یہ بچے بھی ہونق ہو گئے تھے کہ ہمیں کیوں بلوایا گیا ہے۔ کیا ہمارے پلان کے بارے میں پتا چل گیا ہے؟ لیکن وہ تو کوئی نہیں جانتا کہ آج ہم کیا کرنے والے ہیں تو پھر..... اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں سکے۔ عابد کی جلال بھری گرجدار آواز سنائی دی لیکن یہ عابد کی آواز ہرگز نہیں تھی بلکہ بڑی بھاری آواز تھی۔

''کیا کرنے جا رہے تھے آج تم لوگ۔'' عابد بچوں سے مخاطب تھا۔

''ٹک..... کچھ نہیں ہم تو باہر کھڑے تھے۔''

''جھوٹ مت بولو کیا تم نے ہاتھوں میں سوئیاں نہیں چھپا رکھی ہیں ہمیں چبھونے کے لیے..... بولو بتاؤ۔''

عابد کے منہ سے حقیقت سن کر بچوں کے چہرے فق ہو گئے۔ وہ بری طرح ڈر گئے کہ عابد کو اس سب کے بارے میں کیسے پتا چل گیا۔ یقیناً کچھ تو ہے کوئی تو وجہ ہے ورنہ ہمارے دل کی بات عابد کو کیسے پا چل گئی۔ بچے بری طرح ڈر چکے تھے فوراً ہاتھ جوڑ کر رونے لگے۔ ''ہمیں معاف کر دیجیے ہم سے بہت بڑی بھول گئی۔ ہم یہ سب عابد کا ڈراما سمجھ رہے تھے ہمیں حقیقت کا علم نہیں تھا۔'' مجمع پر سکتہ طاری تھا۔ سب کی نظریں عابد پر تھیں کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے لیکن پھر عابد کے منہ سے آواز آئی۔ ''جاؤ آئندہ ایسا کچھ کرنے کا سوچنا بھی مت ورنہ پریشانی میں آجاؤ گے۔'' خلاصی ملتے ہی بچے بھاگ کھڑے ہوئے مبادا روک لیے جائیں۔

جمیلہ بیگم آگے بڑھیں اور بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

''خدارا اب تو بتا دیجیے آپ میرے بچے کے ساتھ کیسے آئے، کہاں سے آئے اور کیوں؟'' جواباً عابد کے منہ سے آواز نکلی۔

''ہم حمید بابا ہیں ٹھٹھہ والے، ہم اکثر تمہارے گھر کے باہر نیم کے درخت پر یا اس کے سائے میں ہوتے ہیں اس دن عابد نے عطر لگا رکھا تھا ہمیں یہ بچہ بڑا پیارا لگا۔ یہ نیم کے درخت کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ہم نے اسے دوست بنا لیا۔ اب ہم اس کے ساتھ ہی رہیں گے اور اس پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ نہ ہی آپ کو تنگ کریں گے اور چاہتے ہیں ہمیں بھی تنگ نہ کیا جائے۔''

عابد پر مکمل کیفیت طاری تھی۔ وہ بالکل ہوش میں نہیں تھا۔ اس سب صورت حال میں محلے کی عورتیں جو جمیلہ کے گھر میں قوالیاں سننے جمع ہوئی تھیں باہر آگئیں۔ سب پر حقیقت آشکار ہو چکی تھی لیکن اس وقت پر جلال ماحول میں عورتیں اپنی زبان پر قابو رکھے ہوئے تھیں۔ کسی میں بات کرنے کی ہمت نہیں تھی کہ ایک عورت بڑی ہمت کر کے مجمع سے باہر آئی وہ رو رہی تھی۔ جمیلہ بیگم نے دیکھا وہ پچھلے دنوں ہی اس محلے میں شفٹ ہوئی تھیں۔ وہ عورت ادھر ادھر دیکھے بنا سیدھی عابد کے سامنے جا پہنچی اور رونے لگی اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ ''بابا جی میرا بچہ.....؟'' وہ بہت رو رہی تھی۔

عابد کے منہ سے آواز آئی۔ ''مل جائے گا تیرا بچہ بلکہ خود چل کے تیرے دروازے پر آئے گا۔ بس اللہ پر کامل یقین رکھ۔''

''کیسے..... کیسے آئے گا وہ جب وہ گمشدہ ہوا تھا تو بہت چھوٹا تھا۔ تقریباً چار سال کا! اور میرا گھر بھی یہاں نہیں تھا پندرہ سال..... پورے پندرہ سال ہو چکے ہیں اسے کھوئے ہوئے اب تو اس کے ملنے کی آس بھی ٹوٹ چکی ہے۔ یہ پندرہ سال میں نے انگاروں پر لوٹتے گزارے ہیں۔ یہ ایک ماں کا دل ہی جانتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے بغیر کیسے جیتی ہے میں بس یہ جانتی ہوں کہ وہ یقیناً زندہ سلامت ہے اور ایک دن ضرور آئے گا بس اسی امید پر ہر

دن جیے جا رہی ہوں اگر سانس لینا زندگی ہے تو ہاں میں زندہ ہوں لیکن سوچتی ہوں کہ اب اس نئے گھر یا محلے میں وہ کیسے آئے گا ہمیں کیسے پہنچانے گا۔'' یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کتنی دکھی تھی وہ سبھی عورتوں کی آنکھیں بھر آئیں اور سب نے صدقِ دل سے اس کے بچے کے مل جانے کی دعا کی۔ عابد نے کہا۔

''ناامیدی کفر ہے اپنے اللہ پر یقین ہے ناں؟''

''بہت ہے اس یقین کے سہارے ہی تو زندہ ہوں۔''

''بس صدقِ دل سے مانگو بے شک اس کے لیے کچھ ناممکن نہیں تمہارا بچہ صحیح سلامت ہے اور اب جوان ہو چکا ہے وہ انشاء اللہ جلد تم سے آملے گا۔''

''کب؟ کیسے؟ خدارا کچھ تو بتائیے میں نے بتایا ناں میں اب اس گھر میں نہیں رہتی۔ پچھلے دنوں ہی یہاں آئی ہوں اس کو کیسے پتا چلے گا کہ میں.....''

''میں نے کہا ناں کب اور کیسے اللہ کی قدرت کے آگے کچھ بھی نہیں۔ وہ جب کسی کام کا ارادہ فرما لیتا ہے تو وہ بھی ہو جاتا ہے بظاہر ہمارے لیے ناممکن ہو شاید اسی لیے اللہ پاک نے تجھے اس نئے گھر میں بھیجا ہے کہ تیرا بیٹا یہیں ملے گا اور ہم ذریعہ بنیں گے بس اب بے فکر ہو جا اور انتظار کر اپنے بیٹے کا۔ وہ عید والے دن تیرے گھر آئے گا اور ہم خود لے کر آئیں گے۔'' عابد نے اسے تسلی دی تو جیسے اس میں نئی جان پڑ گئی۔

عید میں تقریباً ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔ اسے تو جیسے ہفت اقلیم مل گیا خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ فوراً قدموں میں گر گئی۔ عابد فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''نہ..... نہ اللہ کے آگے جھکو اس کا شکر بجا لاؤ۔ جب بیٹا مل جائے تو صدقہ خیرات کر دینا اللہ حامی و ناصر ہو۔'' یہ کہہ کر عابد ایک طرف گر گیا اس کی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ جمیلہ بیگم جلدی سے آگے بڑھیں اور عابد کو بیٹوں کی مدد سے اٹھوا کر اندر لے چلیں۔

مجمع جس کو سانپ سونگھ گیا تھا ہوش میں آگیا۔ عورتیں افسوس کرنے لگیں کہ کاش ہمیں بھی بات کرنے کا موقع مل جاتا اور وہ عورت جس کا نام خدیجہ تھا سجدہ شکر بجا لا رہی تھی اسے امید کی کرن نظر آ چکی تھی۔

☆.....☆

یہ سارا منظر طاہر صاحب نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن اس کو دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن خدیجہ بڑی پرامید تھی کہ یقیناً اس کا بیٹا لوٹ آئے گا انسان جب اللہ پر کامل یقین رکھتا ہے تو اللہ بھی اپنے بندے کو مایوس نہیں لوٹاتا بلکہ اس کی امید سے زیادہ نوازتا ہے کیونکہ وہ بڑا کریم ہے۔ خدیجہ بیگم بھی اللہ کی ذات پر مکمل یقین رکھتی تھیں اور یہ ان کا یقین ہی تھا کہ پندرہ برس گزر جانے کے بعد بھی انہیں اپنے بیٹے کے لوٹنے کی امید تھی۔ ہر چند کہ وہ اپنا پرانا گھر بھی چھوڑ چکی تھیں لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ امید پر دنیا قائم ہے تو یہی وجہ تھی کہ خدیجہ بیگم بھی پندرہ سال گزرنے کے باوجود اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوئی تھیں ویسے بھی مایوسی کفر ہے وہ جانتی تھیں کہ اللہ کی قدرت وسیع ہے جو چاہے کر سکتا ہے پھر یہ تو کچھ بھی نہیں تھا اس کی قدرت کے آگے۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور خدیجہ بیگم کا یقین ٹوٹنے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ ان کا بیٹا عید والے دن ان سے آملے گا کب! کیسے اور کہاں سے یہ سب وہ نہیں جانتی تھیں بس انہیں پتا تھا کہ اب ان کی ممتا کو قرار آجائے گا اور ہوا بھی یہی عید والے روز خدیجہ بیگم حسب معمول سویرے ہی بیدار ہو کر رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئیں۔ کتنی ہی دیر سجدے میں گر کر آہ و زاری کرتی رہیں۔ گڑگڑاتی رہیں۔

''اے میرے پروردگار تو جانتا ہے کہ یہ پندرہ سال میں نے کیسے گزارے ہیں میں جانتی ہوں ایک ماں ہو کے میں اپنے بیٹے کے لیے جتنا پریشان ہوں پھر تُو تو ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بچے پر کوئی آنچ نہیں آئی ہوگی کیونکہ میں نے اسے تیرے سپرد کر دیا تھا۔ بے شک تجھ سے بڑھ کر کوئی چاہنے والا نہیں نہ ہی کوئی اور حافظ و نگہبان ہے لیکن اب میری ممتا قرار چاہتی ہے میں اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی ہوں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے مولا مجھے میرے بیٹے سے ملا دے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔'' دعا مانگ کر خدیجہ بیگم مصلے پر ہی بیٹھی رہیں ذکر کرتی رہیں اور روتی رہیں۔ ان کے شوہر بھی ان کی بے قراری دیکھ اور سمجھ رہے تھے لیکن خاموش رہے وہ ان کی تڑپ جانتے تھے۔ پورے پندرہ سال انہوں نے صبر کیا تھا تبھی اپنے رب سے شکوہ نہ کیا لیکن اب وہ بڑی بے قرار تھیں۔'' انہوں

نے پوری رات خدیجہ بیگم کی بے قراری دیکھی تھی وہ پوری رات سو نہیں سکی تھیں فجر سے پہلے انہوں نے شیر خرما بھی تیار کرلیا تھا ان کے بیٹے کو پسند جو تھا آج پندرہ سال بعد انہوں نے عید پر اہتمام کیا تھا۔

مسلے پر ہی نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ کمرے میں سوائے سانسوں کے کوئی آواز نہ تھی۔ دونوں ہی خاموش تھے کہ اچانک کھلے دروازے پر دستک ہوئی خدیجہ بیگم دوڑیں کیا دیکھتی رہیں ایک نوجوان لڑکا ہے اور ساتھ ادھیڑ عمر عورت اور مرد ہیں۔ شاید دونوں میاں بیوی تھے۔ خدیجہ بیگم تو نوجوان لڑکے کو تکے جارہی تھیں اور ان کے آنسو شدت سے بہنے لگے تھے۔ انہوں نے بڑھ کے اسے سینے سے لگا لیا تھا کیونکہ وہ نوجوان کے ماتھے پر چوٹ کا نشان پہچان چکی تھیں۔ یہ انہی کا بیٹا ذیشان تھا کتنا بڑا ہوگیا تھا لیکن خدیجہ بیگم کی اولاد تھا اور ان کے لیے اپنی اولاد کو پہچاننا مشکل نہیں تھا۔

''میرا بچہ ذیشان تُو کہاں تھا اتنے سال میں نے کہاں کہاں تجھے تلاش نہیں کیا۔ کیسے کیسے میری ممتا نہیں تڑپی چل اب اندر چل اب میں تجھے کہیں جانے نہیں دوں گی۔ اب تو یہیں رہے گا میرے پاس میری نظروں کے سامنے۔'' وہ دیوانی ہوئی جارہی تھیں۔

وہ دونوں عورت اور مرد بڑے حیران تھے۔ عورت بولی۔

''آپ خدیجہ بیگم ہی ہیں ناں اس محلے میں نئی آئی ہیں۔''

''جی جی میں ہی خدیجہ ہوں اور یہ میرے شوہر رحمان ہیں اور یہ..... یہ میرا بیٹا ذیشان ہے جو بچپن میں کھو گیا تھا اور آج پورے پندرہ سال بعد میں اسے دیکھ رہی ہوں کتنا بڑا ہوگیا ہے میرا بیٹا ماشاءاللہ۔'' خدیجہ بیگم بے خودی میں ذیشان کے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ ادھیڑ عمر عورت بولی۔ ''ویسے آپ نے ذیشان کو پہچانا کیسے؟ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ ہمیں آپ کو یقین دلانا پڑے گا کہ یہی آپ کا بچھڑا بیٹا ذیشان ہے لیکن آپ نے تو خود سے اسے پہچان کر ہماری مشکل آسان کردی تب خدیجہ بیگم نے بڑے مکمل سے ساری روداد ادھیڑ عمر عورت کے گوش گزار کردی کہ کس طرح انہیں آج ذیشان کے آنے کی پیشن گوئی کی گئی تھی اور پھر ذیشان کے ماتھے پر چوٹ کا نشان ساری حقیقت کھول گیا۔ ''اب آپ بتائیے کہ آپ کو میرا گھر کیسے پتا چلا اور یہ بھی کہ ذیشان میرا گمشدہ بیٹا ہے یہ آپ کو کہاں سے ملا اور اب تک کہاں تھا؟''

خدیجہ بیگم سب کچھ جاننے کو بے قرار تھیں۔ تب انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم بے اولاد تھے زندگی کی ہر خوشی تھی ہمارے پاس سوائے اولاد کے۔ پھر ہم نے بہت سوچ کر ایک یتیم خانے سے ذیشان کو گود لیا۔ کوئی اسے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ شاید یہ آپ کی دعاؤں کا اثر تھا کہ ذیشان غلط ہاتھوں میں جانے سے بچ گیا اور محض پانچ سال کی عمر میں ہم نے اسے گود لے لیا۔ ہم نے اسے پڑھایا لکھایا اچھی تربیت دی پھر تقریباً ایک مہینہ پہلے ایک بزرگ میرے شوہر کو ملے وہ خود چل کر ہمارے گھر آئے تھے انہوں نے ذیشان کے بارے میں ہمیں بتایا اور آپ کا بھی بتایا کہ آپ لوگ اس کے اصل ماں باپ ہیں اور پندرہ سال سے اپنی اولاد کا غم سہہ رہے ہیں۔ ہمیں آپ کا ایڈریس بھی انہوں نے ہی دیا۔ ہم نے ان کے بارے میں مزید جاننا چاہا کہ وہ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں تو انہوں نے کہا کہ آپ خدیجہ بیگم کے پاس جائیں وہاں آپ کو سب حقیقت معلوم ہوجائے گی اور ہمیں آج عید کے دن آنے کی تاکید بھی انہوں نے ہی کی تھی کہ آج آپ ہمارا انتظار کریں گی اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی ہم آج آپ سے ملنے آگئے اب آپ بتائیے کہ وہ بزرگ کون تھے؟'' عورت نے اپنی بات مکمل کی تو خدیجہ بیگم کے بہتے آنسو ہچکیوں میں تبدیل ہوگئے پھر تھوڑی حالت سنبھلی تو خدیجہ بیگم نے ساری وضاحت کی اور کہا۔ ''مجھے یقین ہے یہ وہی بزرگ تھے جنہوں نے عید والے دن میرا بیٹا مجھ سے ملانے کا وعدہ کیا تھا اور بے شک انہیں اللہ نے وسیلہ بنا کر بھیجا ہے۔ مجھ گناہ گار کے لیے۔ میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے مجھے میرا بیٹا واپس مل گیا ہے اور آپ لوگوں کا بھی بے حد شکریہ کہ آپ نے میرے بیٹے کو اولاد کا پیار دیا اس کی بہترین پرورش کی۔''

خدیجہ بیگم بے حد ممنون تھیں یہ سب سن کر ذیشان اٹھ کر خدیجہ بیگم کے قدموں میں آبیٹھا اور ان کی پیشانی چومی اور امی کہہ کر لپٹ گیا۔ بڑا وقت آمیز منظر تھا۔ خدیجہ بیگم ذیشان کی بچپن کی تصویریں اٹھا لائیں جنہیں دیکھ کر ان دونوں مرد عورت نے تصدیق کی کہ ہاں یہی ذیشان ہے جو ہمیں بچپن میں ملا تھا۔ انہونی ہوچکی تھی اللہ نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ خدیجہ بیگم نے اگلے ہی دن اپنے گھر محفل سماع منعقد کرلی۔

☆.....☆

آج عید کا دن تھا۔ جمیلہ بیگم نے منہ اندھیرے ہی سارے کام نمٹا دیئے تھے۔ شیر خرما تیار تھا۔ بہنوں کا انتظار کررہی تھیں جو نماز ادا کرنے گئے تھے۔ پھر آکر شیر خرمے کا ناشتا کرنا تھا سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن جمیلہ بیگم کا دل بڑا بے چین تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی شاید وہ بھی دل ہی دل میں منتظر تھی کہ آج خدیجہ بیگم کا بیٹا انہیں مل جائے گا۔ دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ اے کاش ممتا کو قرار مل جائے لیکن ذہن تھا کہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ پندرہ سال پہلے گم ہوا بچہ اب کیسے مل گیا؟ اسے کیسے پتا چلے گا کہ میرے باپ یہاں اس محلے میں ہیں؟ لیکن پھر دل نے کہا کہ کیا تم اللہ کی قدرت کی منکر ہو؟ وہ کیا نہیں کرسکتا اس کے کن کہنے کی دیر ہے سب کچھ اس کی قدرت کے آگے ہیچ ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ عابد کے منہ سے یہی الفاظ ادا ہوئے تھے کہ تمہارا بیٹا عید والے دن تمہارے گھر ہوگا اور خدیجہ بیگم کیسے کھل اٹھی تھیں کیا آج ان کا بیٹا انہیں مل جائے گا؟ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ پھر انہیں عابد پر بے انتہا پیار آیا وہ کیسے عابد کو لے کر پریشان ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹر کی دوا بھی اثر نہیں کررہی تھی وہ اس کو لے کر کتنے باباؤں کے پاس گئی تھیں کتنے ہی تعویز اس کے گلے میں ڈالے تھے لیکن ہر تعویز غائب ہوجاتا تھا۔ کوئی سمجھ نہیں پارہا تھا کہ عابد کو ہوا کیا ہے۔ یہ تو محفل سماع میں ساری حقیقت سامنے آئی اور جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا عابد بالکل ٹھیک تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں عابد کی بلائیں لے ڈالیں۔

''السلام علیکم امی عید مبارک۔'' بچے عید کی نماز پڑھ کر آچکے تھے۔ جمیلہ بیگم سوچوں کے منجدھار سے ایک دم نکل آئیں۔

''وعلیکم السلام بیٹا، عید مبارک چلو آجاؤ اب ناشتا کرلو۔'' وہ اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔

☆.....☆

تقریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ جمیلہ بیگم دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگی تھیں۔ بچے سب باہر تھے کہ اچانک دوازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو سامنے خدیجہ بیگم خوشی اور آنسو کی ملی جلی کیفیت میں کھڑی تھیں۔ ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور ساتھ میں ایک نوجوان لڑکا اور ایک مرد و عورت بھی تھے۔ جمیلہ بیگم کو سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگی کہ خدیجہ بیگم کو ان کا بیٹا مل گیا ہے اسی لیے وہ مٹھائی کے ساتھ آئی ہیں۔ انہوں نے فوراً انہیں گلے لگا لیا۔ خدیجہ بیگم رونے لگیں۔

''دیکھیے بھابی میرا بیٹا مل گیا ہے۔ میرا ذیشان مجھے مل گیا ہے۔'' بڑا رقت انگیز منظر تھا۔ جمیلہ بیگم بھی اپنے آنسو نہ روک پائیں۔ محلے کی دوسری عورتیں بھی جمع ہوگئی تھیں۔ سب کی آنکھیں اشکبار تھیں جیسے آج ہر کوئی اس انہونی کا منتظر تھا۔ خدیجہ بیگم سے تو خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ وہ مستقل خوشی کے آنسو بہا رہی تھیں۔ بہت بہت مبارک ہو آپ کو اللہ پاک آپ کا کلیجہ ہمیشہ ٹھنڈا رکھے۔ آپ اپنے بچے کی خوشیاں دیکھیں۔'' جمیلہ بیگم کے دل کی دعائیں زبان تک آگئیں۔ وہ واقعی بہت خوش تھیں۔ سب عورتیں جمیلہ بیگم کے گھر میں آگئیں۔ خدیجہ بیگم نے سب کو مٹھائی کھلائی اس محلے کی یہی خاصیت تھی کہ یہاں خوشی ہو یا غم سب مل کر بانٹتے تھے یہ خوشی تو بہت بڑی تھی سب بہت خوش تھے۔

☆.....☆

اگلے ہی دن خدیجہ بیگم کے یہاں محفل سماع منعقد ہوئی حسب توقع حمید بابا کی سواری آئی۔ خدیجہ بیگم نے تشکر کے خوب آنسو بہائے اپنے بیٹے پر سے خوب صدقہ خیرات کیا۔ خدیجہ کی مراد پوری ہوتی دیکھ کر کئی عورتیں اور آگئیں ہر ایک کی جائز حاجت وقت آنے پر اللہ کے کرم سے پوری ہوئی ہر طرف عابد کے بابا کی دھوم مچی تھی لوگ دور دور سے آنے لگے تھے۔

☆.....☆

جمیلہ بیگم کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھر میں محفل سماع منعقد کرائیں۔ جمیلہ بیگم بہت پریشان تھیں کیونکہ ان کے پاس اس بار وسائل کی کمی تھی لیکن وہ یہ بات برملا کہہ نہیں پارہی تھیں۔ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جارہا تھا جیسے جیسے محفل سماع کی تاریخ قریب آرہی تھی۔ ان کی جان نکل رہی تھی اور پھر ان گزرتے گئے اب صرف دو دن باقی تھے اور جمیلہ بیگم خالی ہاتھ تھیں بالآخر تھک ہار کے بڑی ہمت مجتمع کر کے جمیلہ بیگم نے طاہر صاحب کے آگے دست سوال دراز کیا۔ ''وہ جی مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔''

''ہاں کہو کیا بات ہے۔''

''وہ پرسوں ہمارے گھر محفل سماع ہے۔'' کہہ کر خاموش ہوگئیں۔

''ہاں تو پھر؟''

جمیلہ بیگم نے تھوک نگلا پھر بولیں۔ ''دراصل مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی تو.....''

میرے پاس فالتو پیسے نہیں ہیں۔ جب دیکھو دعوتیں اور لنگر کرتی رہتی ہو تم ایک ایک کام کیوں نہیں کرتی ہو یہ جو تمہارے بابا ہیں ان سے ہی کہو ناں کہ وہ تمہیں محفل سماع کے لیے پیسے دے دیں۔ ان کی ہی خواہش پر یہ پروگرام ہو رہا ہے ناں تو بھئی وہ خود ہی کریں خرچہ بھی ان کے لیے کیا مشکل ہے۔ ہم تو غریب آدمی ہیں، ہم یہ خرچے روز برداشت نہیں کر سکتے ہو نہہ۔'' یہ کہہ کر طاہر صاحب یہ کہہ کر جا چکے تھے اور جمیلہ بیگم حیران پریشان کھڑی تھیں کہ اب وہ کیا کریں کہاں سے پیسے لائیں۔ بظاہر کوئی راستہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا جہاں سے پیسے ملنے کا امکان ہو۔ لے دے کے ایک اللہ کا ہی سہارا تھا جو غیب سے جمیلہ بیگم کی مدد کر سکتا تھا۔ ورنہ طاہر صاحب نے تو ہری جھنڈی دکھا دی تھی آخر وہ کہتیں بھی تو کس سے؟ بہرحال وہ اللہ پر توکل کر کے بیٹھ گئیں اور نماز کے بعد خوب گڑگڑا کے رب سے دعائیں مانگیں۔

اگلے دن صبح فجر کی نماز ادا کر کے وہ معمول کے کاموں میں لگ گئیں۔ پودوں کو پانی دے کے انہوں نے موتیا کے دو پھول کانوں میں پہنے۔ کیوں؟ یہ ان کا معمول تھا جب بھی موتیا کے پھول کھلتے وہ انہیں کانوں کی زینت بنا لیتیں اور پھر سارا دن اس کی خوشبو سے مسحور رہتیں اب ان کا رخ کچن کی جانب تھا۔ انہوں نے کچن میں جا کر اوپر کے سلیب سے چائے کی پتیلی اٹھائی چائے کا پانی رکھنے کے لیے جیسے ہی ڈھکن ہٹایا ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ چائے کی پتیلی میں بہت سے نوٹ رکھے تھے جو یقیناً محفل سماع کے لیے امداد تھی کیونکہ گھر میں اور کوئی تو پیسے یہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ تشکر سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں طاہر صاحب کو آواز دی وہ چلے آئے اور جمیلہ بیگم کے ہاتھ میں اتنے پیسے دیکھ کر حیران رہ گئے فوراً پوچھ بیٹھے۔ ''یہ اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟ کس سے قرض لیا ہے کیا؟''

''نہیں نہیں میں نے کسی سے قرض نہیں لیا۔ یہ تو ہماری امداد ہوئی ہے۔ کل آپ نے ہی کہا تھا ناں کہ محفلِ سماع کے لیے پیسوں کا انتظام بابا جی خود کریں تو دیکھیں یہ انہوں نے انتظام کر دیا ہے۔'' جمیلہ بیگم کا لہجہ بھیگا ہوا تھا جوش سے آواز میں لرزش تھی۔

طاہر صاحب لاجواب ہو گئے پھر بولے۔ ''اچھا سنو یہ پیسے پورے مت خرچ کر دینا کچھ بچا لینا۔''

''جی بہتر۔'' جمیلہ بیگم پیسے رکھنے الماری کی طرف چل دیں اب وہ مطمئن تھیں کہ کل محفلِ سماع دھوم دھام سے کروں گی۔''

☆.....☆

ایک بار پیسے ملنے کے بعد طاہر صاحب کو لت گئی اب وہ آئے دن پیسوں کا مطالبہ کرتے جمیلہ بیگم سے کہتے۔ ''بھئی اپنے بابا جی سے کہو بہت دن ہو گئے کچھ پیسے ویسے دیں۔'' جمیلہ بیگم حیرت سے طاہر صاحب کو تکتیں لیکن کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں اس لیے خاموش رہتیں۔

اور اس دن تو حد ہی ہو گئی جب طاہر صاحب نے بابا جی کو برملا کہہ دیا۔ ''بھئی بہت ہوا اب آپ کے یہ ڈرامے نہیں چلیں گے خالی خولی باتوں سے پیٹ نہیں بھرا کرتے۔ کچھ پیسے وغیرہ دیا کرو تب ہم آپ کو مانیں گے ورنہ آپ جا سکتے ہیں۔'' طاہر صاحب بپھرے ہوئے تھے۔ جمیلہ بیگم کے تو چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا تھا جیسے ان کا سارا لہو کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ خوف سے ان کا برا حال تھا۔ وہ طاہر صاحب کو خاموش بھی نہیں کروا سکتی تھیں کیونکہ طاہر صاحب اپنے آگے کسی کی سنتے ہی نہیں تھے۔ اتنے دن بھی وہ نجانے کیسے خاموش رہ لیے تھے ورنہ یہ سب ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ مجمع پر سکتہ طاری تھا کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ طاہر صاحب کو خاموش کروا سکے سب ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان سے کچھ کہنا اپنی عزت اتروانے کے مترادف تھا اور پھر یہ تو معاملہ بھی خالصتاً ان کے گھر کا تھا۔ کچھ بولا نہ جا رہا تھا اسی لیے خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ اب کیا ہوتا ہے اور وہی ہوا عابد کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ چہرے پر جلال کے اثرات دکھائی دینے لگے جمیلہ بیگم کانپ کر رہ گئیں۔

عابد کے منہ سے آواز آئی۔ ''ہم اب یہاں مزید نہیں رہ سکتے ہم جا رہے ہیں ہاں البتہ ہم عابد کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے جہاں ہماری ضرورت ہو گی ہم عابد کی مدد ضرور کریں گے لیکن کبھی کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہوں گے خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر عابد بے ہوش ہو گیا جب کہ بیگم جو سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں دوڑ کے عابد کے پاس پہنچیں اور طاہر صاحب ہونہہ کہہ کر چلتے بنے۔

اس کے بعد بہت عرصہ بیت گیا لیکن بابا جی کبھی ظاہر نہیں ہوئے۔ جمیلہ بیگم منتظر ہی رہتیں لیکن وہ تو ناراض ہو کر جا چکے تھے ہاں لیکن انہوں نے عابد کا ساتھ دینے کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے۔

عابد کی شادی ہو چکی تھی بچے تھے بیوی تھی اور یہ بچپن کے قصے، قصہ پارینہ بن چکے تھے۔ ایک دن عابد کے دوستوں نے نورانی جانے کا پروگرام بنایا سوزوکی بک کی گئی اور سب روانہ ہو گئے۔ گاڑی بہت خطرناک موڑ سے گزر رہی تھی پہاڑی علاقہ تھا کہ عابد کی چھٹی حس نے کام شروع کر دیا اسے لگا جیسے کوئی اسے خطرے سے آگاہ کر رہا ہے جیسے کوئی حادثہ ہونے والا ہے اس کے دماغ میں الارم بجنے لگے۔ دوست خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ عابد نے تاخیر کیے بنا سب کو خبردار کیا۔

''سنو سب سنبھل کے بیٹھ جاؤ، مضبوطی سے ڈنڈے پکڑ لو کچھ ہونے والا ہے۔'' عابد کی بات سن کر سب ہنسنے لگے۔ ایک دوست جو عابد کو جانتا تھا بچپن سے اس نے سب کو خاموش کروایا۔

''تم لوگ مذاق کرنا بند کرو عابد اگر کہہ رہا ہے تو غلط نہیں ہو سکتا اللہ کو یاد کرو۔'' سب سنجیدہ ہو گئے اس بات کو لمحہ ہی گزرا ہو گا کہ گاڑی اپنا توازن کھو بیٹھی اور گاڑی نے نیچے کی طرف چار پانچ قلابازیاں لگائی اور پہاڑی سے نیچے جا گری۔ سوزوکی کے پیچھے جو گاڑی آ رہی تھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو فوراً پولیس کو اطلاع دی گئی کہ یہاں حادثہ ہو گیا ہے فوراً پہنچیں پولیس پوری تیاری سے پہنچی لیکن یہ دیکھ کر سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سوزوکی میں موجود کسی بھی شخص کو خراش تک نہ آئی تھی۔

پولیس افسر حیران تھا۔

''میں نے ایمبولینس بلوائی ہے لیکن یہاں تو کوئی زخمی نظر نہیں آ رہا۔ کیا تم نے زخمیوں کو اسپتال روانہ کر دیا ہے؟''

عابد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''کوئی زخمی ہے ہی نہیں انسپکٹر صاحب تو ہم کس کو اسپتال بھیجیں گے آپ ایمبولینس کو منع کر دیجیے۔''

انسپکٹر کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ''مجھے حیرت ہے کہ اتنے شدید حادثے کے بعد بھی نہ ہی گاڑی کو کوئی نقصان ہوا اور نہ ہی کسی کو خراش تک آئی۔ میں نے اپنی پوری سروس لائف میں ایسا کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہمیں تو شدید حادثے کی اطلاع ملی تھی جس کی وجہ سے ہم ایمرجنسی میں پہنچے لیکن یہاں تو ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے۔'' انسپکٹر بالکل گنگ ہو چکا تھا حیرت سے۔

''بس انسپکٹر صاحب اللہ کے بعد اللہ ہی جانے شاید ہماری زندگی باقی تھی ابھی اس لیے ہمیں کچھ نہیں ہوا لیکن اس میں حیرانگی کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ اللہ کی قدرت ہے اور اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔'' عابد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''بے شک بے شک اللہ بہت بڑا ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔'' انسپکٹر بے ساختہ بولا۔

اس واقعے کو عابد کے ایک دوست نے سنڈے میگزین میں تحریر بھی کیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے کہ اتنے شدید حادثے کے بعد بھی وہ سب محفوظ رہے تھے۔

اکثر لوگوں نے شاید پڑھا بھی ہو گا عابد کی مدد کس نے کی؟ اس کو وقت سے پہلے ہوشیار کس نے کیا؟ خطرناک حادثے کے بعد بھی سب محفوظ کیوں رہے؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟

بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ کن فرما دے تو کام ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہے تو تنکے میں جان ڈال دے چاہے تو جاندار اور صحت مند پل میں لاچار و بے بس ہو جائے۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔

☆☆☆

میری قبر پہ نہ آنا

حنا بشریٰ

خلق کے لیے اک نقارہ تحریر عبرت سامانی لیے ایک داستان حیرت

حافظ عبید میرا بچپن کا دوست تھا۔ اس کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا۔ اس لیے قرآن حفظ کرنا تو اس پر فرض تھا۔ انتہائی خوب صورت آواز میں تلاوت کرتا تھا کہ مسجدیں اور محافل میلاد سبحان اللہ کی صداؤں سے گونج اٹھتی تھیں۔ 26 سال کی عمر میں ہی امامت اور خطبہ جمعہ کی سعادت اسے نصیب ہوگئی۔ بہت دفعہ اس کی امامت میں جملہ ادا کیا بعد میں دعا اس قدر باکمال انداز میں کرواتا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب نکلوا کے ہی دم لیتا۔ میں اکثر رشک کی نظر سے دیکھتا اسے اور سوچتا کس قدر پاکیزہ جوانی گزار رہا ہے۔ ورنہ آج کل تو ہر نوجوان گناہوں کی عمیق کھائی میں گرا ہوا ہے۔

''حافظ عبید کو ایڈز کا مرض ہوگیا۔'' میرے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ کیونکہ اس بیماری کا نام سنتے ہی جو پہلا لفظ ذہن میں آتا ہے وہ ہے ''غلط کاری''۔ یہ مرض ہوتا ہی غلط کاریوں کی وجہ سے ہے۔ حافظ عبید سات دن سے نزع کی تکلیف بلکہ عذاب میں مبتلا تھا۔ بہت دفعہ تو سانس بالکل بند ہو جاتی کہ گھر والے سمجھتے کہ روح قفسِ عنصری سے آزاد ہوگئی ہے مگر چند لمحوں بعد ہی رکی ہوئی سانسوں کا سلسلہ پھر سے چل پڑتا۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔

لوگ اس کی آسانی کے لیے آیات قرآنی کا ورد کرتے تو وہ پوری آنکھیں کھول کر یوں غضب ناک انداز میں دیکھنے لگتا جیسے انہیں کچا چبا جائے گا۔ وہ اونچی آواز میں گالیاں بکنے لگتا اور پھر بے ہوشی میں چلا جاتا تھا۔ میں خدا سے روز روز کے اس کی آسان موت کے لیے دعائیں مانگتا۔ آخر کار اس کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہوگئی مگر جسم کو اس اذیت سے دوچار ہونا پڑا کہ ہر کوئی کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ میں اپنے جگری یار کو اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دبا آیا۔

اس کے بعد میرا معمول بن گیا جس طرح نماز فرض ہے اسی طرح میں نے حافظ عبید کی قبر پر جانا، فاتحہ خوانی کرنا اپنے اوپر فرض کرلیا۔ آفس سے واپسی پر جانا اور اس کے لیے دعائے مغفرت ضرور کرتا نہ جانے کیوں میرے دل کو صبر نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا یوں اچانک جوانی میں چلے جانا اور پھر اس قدر غلیظ بیماری کی اذیت اور موت بھی اتنی ہی دردناک۔ میرے دل و دماغ میں یہ باتیں بیٹھ گئی تھیں۔

جمعرات کا دن تھا۔ قبرستان میں ہر جگہ گلاب کے پھولوں اور اگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ٹائم کافی تھا میں نے قرآن پاک کھولا اور پڑھنے لگا۔ ابھی چند لمحے گزرے تھے کہ مجھے لگا کہ زمین ہل رہی ہے۔ میں نے اپنا وہم جانا اور توجہ ہٹا کر دوبارہ سے تلاوت کرنے لگا اب کی بار زمین اتنی زور سے ہلی کہ ایک لمحے کے لیے تو میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ میں سنبھل کر ایک جگہ بیٹھ گیا کہ شاید زلزلہ آرہا ہے اور بلند آواز میں کلمہ طیبہ پڑھنے لگا۔ پاس سے گزرتے لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور میں انہیں کہ زلزلہ آرہا ہے بجائے رک کر کلمہ پڑھیں یوں مجھے گھور کے دیکھ رہے ہیں کہ میں جیسے کوئی عجیب کام کر رہا ہوں۔ کافی دیر بعد زمین تھمی۔ میں نے جلدی جلدی سورۃ مکمل کی مگر میں محسوس کرتا رہا کہ زمین وقفے وقفے سے ہلتی جا رہی تھی۔ گھر آکر سب سے زلزلے کے متعلق پوچھا تو سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں حیران ہوا تھا کہ اتنا خوفناک زلزلہ آیا اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ کافی دن مختصر فاتحہ خوانی کا سلسلہ چلتا رہا۔

☆.....☆

ایک دن آفس سے نکلا۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ طوفانی بارش کا واضح اشارہ موجود تھا۔ موسم میں خاصی ٹھنڈک تھی۔ میں جلد از جلد قبرستان جا کر عبید کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہ رہا تھا۔

میں نے قرآن پاک کھولا اور تلاوت شروع کی ہی تھی کہ زمین اس بھیانک انداز میں جھولنے لگی کہ میرا تو دل بیٹھنے لگا۔ میں گھبرا کر اس قبر کے پاس بیٹھ گیا اور ایک نظر زمین پر ڈالتا اور پھر سے قرآن پڑھنے لگتا مگر میرے تلاوت کرتے ہی وہ پھر بھیانک انداز میں پلٹی کہ جیسے پھٹ جائے گی اور میں بھی باقی مُردوں کی طرح اس میں دفن ہو جاؤں گا۔

میں نے ہمت جمع کی اور دوبارہ تلاوت شروع کی تھی کہ کسی کے رونے کی کربناک آواز آنے لگی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ جب کہ وہ آواز میرے بہت قریب سے آرہی تھی۔ زمین پر کوئی بھاری سی چیز اتنے زور سے ٹکرائی، شور بلند ہوا اور ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بے حد وزنی لوہے کی مشین زمین سے ٹکرائی ہو۔ زمین بری طرح سے لرزنے لگی۔ رونے کی آواز میں شدت آنے لگی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ہزاروں مُردے مل کر ماتم کر رہے ہوں۔ مجھے اپنا دل بند ہوتا ہوا لگ رہا تھا۔ اچھے بھلے مضبوط اعصاب کا مالک ہوتے ہوئے بھی میں خوف سے کانپ اٹھا۔ میں نے قرآن پاک جیب میں ڈالا اور دوڑ لگا دی۔ بہت سی قبروں کو پھلانگتا میں دیوانوں کی طرح بھاگتا قبرستان سے نکلا۔

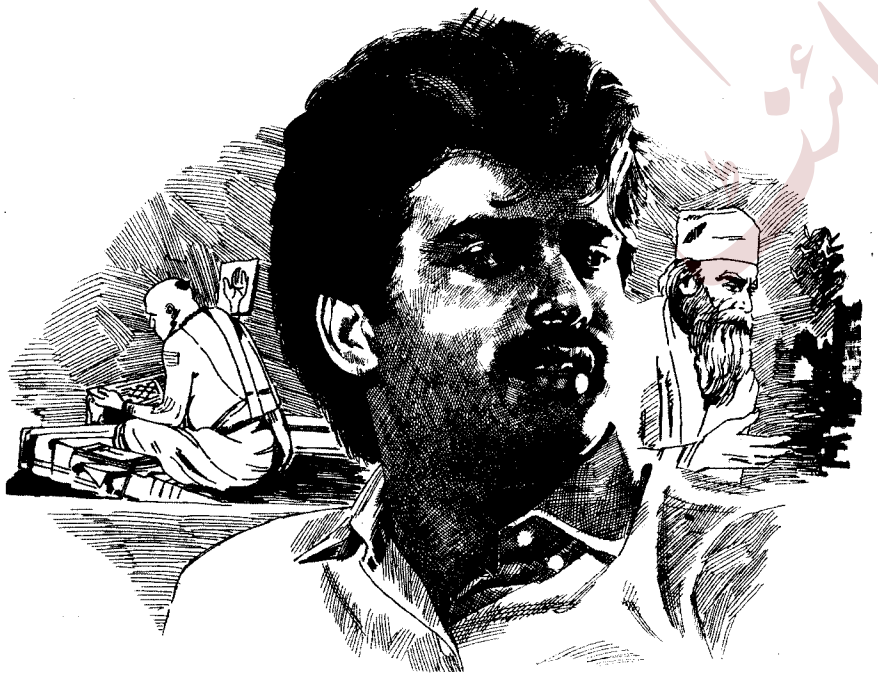

بائیک اسٹارٹ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ زور سے بادل گرجا ہر طرف بجلی کڑک رہی تھی۔ ''یا اللہ میری مدد کر'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور ساتھ ہی بائیک اسٹارٹ ہوگئی۔

میں ہانپتا کانپتا بستر میں گھس گیا۔ دسمبر کی یخ بستہ شام اور میں پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیسے بات کیے بغیر میں سو گیا۔ رات کے آخر پہر انتہائی بھیانک خواب نے مجھے گہری نیند سے جگا دیا۔ بارش طوفانی انداز میں ہو رہی تھی۔ بادل گرجتے تو یوں لگتا کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔

''میں نے خواب میں دیکھا کہ سفید کفن میں لپٹا حافظ عبید خاموشی سے ایک سڑک پر جا رہا ہے۔ میں بھاگ کر اس کے قریب پہنچتا ہوں تو جو منظر دیکھتا ہوں تو میرا کلیجہ منہ تک آ گیا۔ اس کے سر کو آگ کے شعلوں نے پکڑ رکھا تھا۔ آنکھیں پتلیوں سے خالی تھیں صرف گڑھے رہ گئے تھے۔ اس کا کفن اس قدر میلا تھا جیسے کیچڑ میں لت پت ہوا ہو۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل لرزنے لگا۔ مجھے دیکھ کر وہ انتہائی بھیانک انداز میں رونے لگا۔ اس کی آواز گدھے کی آواز سے بھی بدترین تھی۔

اس کے چہرے کا گوشت جگہ جگہ سے لٹکا ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے ایک دم مجھے لگا کہ جیسے میرے قریب درندہ کھڑا غرا رہا ہو۔ اس نے زمین سے عجیب و غریب پتھر اٹھایا۔ ''اگر تو نے آج کے بعد میری قبر پر قرآن پڑھا تو میں.....'' اس نے وہ انتہائی نوکیلا پتھر پوری قوت سے میری طرف پھینک دیا اس سے پہلے کہ وہ مجھے لگتا میری گھبراہٹ سے آنکھ کھل گئی۔

میرا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ کس قدر خوب صورت شخصیت اور سحر انگیز آواز کا مالک حافظ عبید اتنے بھیانک حلیے میں تھا۔ خوف نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ لحاف سے باہر نکلتے ہوئے خوف آ رہا تھا کہ اگر باہر نکلا تو حافظ عبید مجھے گردن سے دبوچ لے گا۔ اسی اثناء میں اذانِ فجر کی صدائیں بلند ہوئیں تو میری جان میں جان آئی۔ قدرتی بات ہے کہ اذان کے وقت انسان ڈر خوف کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ خدا کے نام میں بے حد طاقت ہے۔

میرے دل میں خوف بیٹھ گیا کہ قبرستان جاؤں گا تو حافظ عبید میرے اوپر حملہ کر دے گا۔ قبرستان کا سوچتا تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ گھر والے میری خاموشی پر حیران و پریشان تھے۔ میں انہیں اس عجیب و غریب پریشانی کے بارے میں کیا بتاتا۔ آدھی آدھی رات کو خوف کے مارے اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ حافظ عبید کا بھیانک حلیہ یاد آتا تو دل شدت سے متلانے لگتا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا میری سمجھ سے باہر تھا۔

☆.....☆

اسی خوف و ہراس میں مبتلا ایک مہینہ گزر گیا۔ میں نے قبرستان جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں ہی حافظ عبید کے لیے ایصال ثواب کر دیتا۔ اسی دوران 15 شعبان شب برأت کی مقدس رات آ گئی۔ لوگ دیوانوں کی طرح اپنے پیاروں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے تھے۔ میرے دل میں حافظ عبید کی محبت پھر سے جاگ اٹھی اور دل اس کی قبر پر جانے کے لیے مچلنے لگا۔ سارا ڈر اور خوف غائب ہو گیا۔ میں بھی فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان پہنچ گیا۔

قبر انتہائی گندی ہو رہی تھی۔ ظاہری سی بات ہے میں اتنے دنوں سے صفائی کرنے نہیں گیا۔ میں نے بہت محبت سے صفائی کی گلاب کا پودا جو راستے سے خرید کر لایا تھا وہ قبر کے سرہانے پر لگا دیا۔ ''رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانِ عالی شان کے مطابق جب تک ٹہنی ہری رہتی ہے مُردہ عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے۔''

''یار معاف کر دے بہت دنوں بعد تجھ سے ملنے آیا ہوں۔ میں خوامخواہ کا دل میں خوف بیٹھ گیا تھا۔'' میں نے قبر کے قریب ہو کر انتہائی محبت سے کہا۔

اس لمحے میں خواب کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ میں نے قرآن پاک کھولا اور پڑھنے بیٹھ گیا۔ وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ زمین ہلنے لگی میرا گھبراہٹ کے مارے برا حال ہو گیا۔ اگر میں قرآن کو مضبوطی سے نہ تھامتا تو مجھ سے بے ادبی ہو جاتی۔ آج میرے دل میں خوف کی بجائے ایک اور چیز نے جگہ لی تھی وہ تھا تجسس..... جواب بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ تو میرا دماغ کہہ رہا تھا کہ یہ زلزلہ حقیقی نہیں ہے کیونکہ آس پاس آتے جاتے لوگ بالکل مطمئن ہوتے تھے مگر عبید کی قبر کے پاس ہونے کے باعث میں زلزلے کی زد میں تھا جو بھی تھا اسکا تعلق ضرور قرآن کی

تلاوت سے تھا۔ میں نے تجربے کے طور پر صرف ایک آیت پڑھی تو زمین لرزنے لگی۔ میں نے مزید پڑھا تو رونے کی انتہائی بھیانک آوازیں آنے لگیں۔ بچاؤ بچاؤ کوئی انتہائی بدصورت آواز میں رو رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر کان عبید کی قبر کے قریب کیا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ آواز قبر کے اندر سے آ رہی تھی۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھانے لگا۔

''یا اللہ تُو ہی میری مدد فرما کہ میں اپنے دوست کی کس طرح مدد کروں..... وہ کس مشکل میں ہے تو ہی راستہ دکھا۔''

میں دل سے دعا کر رہا تھا۔

عبادت کی رات تھی۔ میں قبرستان سے ملحقہ دربار میں ٹھہر گیا۔ نوافل و تسبیحات ادا کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی۔ سوئی جاگی کیفیت میں جو منظر دیکھا اس کو دیکھ کر میرا زندہ بچ جانا معجزے سے کم نہ تھا۔

تیز طوفانی ہواؤں نے قبرستان کو گھیر رکھا تھا۔ مضبوط درخت یوں جھوم رہے تھے جیسے چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں ہوں۔ سرخ آسمان ماحول کو مزید خوفناک بنا رہا تھا۔ درختوں پر بسیرا کیے ہوئے پرندے اس اچانک افتاد پر گھبرا کر درختوں سے اڑ گئے۔ پورا قبرستان عجیب و غریب آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ایک نوجوان کفن میں ملبوس دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ وہ حافظ عبید تھا۔ اس کے منہ سے بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ میرے اوپر حملہ آور ہوا۔

''منع بھی کیا تھا کہ میری قبر پر قرآن نہ پڑھنا مگر تم باز نہ آئے۔'' اس نے کہتے ہوئے شدت سے میری گردن پکڑ لی۔ اس کے ہاتھ اس قدر گرم تھے جیسے تندور سے نکالے ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری آنکھیں باہر نکل آئیں گی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ زوردار چیخ میرے منہ سے نکلی اور میری آنکھ کھل گئی۔

بہت سے لوگ میرے اردگرد جمع تھے۔ وہ مجھ سے وجہ پوچھ رہے تھے مگر خوف کے مارے میری زبان تالو سے چپکی ہوئی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ شاید خواب میں ڈر گیا ہے۔

مجھے نہ جانے کیوں لگ رہا تھا کہ حافظ عبید نے مجھ پر حقیقت میں حملہ کیا ہے مگر میں کسی کو بھی یقین نہیں دلا سکتا تھا۔

نمازِ فجر ادا کر کے میں گھر آ کر سو گیا، گردن پر بلن کے احساس نے مجھے گہری نیند سے جگا دیا۔ میں نے اٹھ کر شیشے میں اپنی گردن دیکھی تو وہ سرخ انگارہ ہو رہی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا آخر میرا نیک عمل اسے بجائے یہ کہ فائدہ پہنچاتا بلکہ اسے اذیت ہو رہی تھی۔ ان سب باتوں کا جواب لینے میں اس کے گھر پہنچ گیا۔

اس کا چھوٹا بھائی زبیر مجھ سے بہت محبت سے ملا۔ میں نے اسے تمام صورت حال بتائی۔ اپنے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات بتائے تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے ثبوت کے طور پر اس کو اپنی گردن کے زخم بھی دکھائے۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کر رہا تھا مگر پھر میرے اصرار پر بولا۔ ''اصل میں حسن بھائی بات ایسی ہے جو ذلت و رسوائی کی ہے۔ لوگ عبید بھائی کا ظاہر جانتے تھے مگر ان کا باطن انتہائی گناہ آلود ہو چکا تھا۔ عبید بھائی سے محلے کی ایک لڑکی محبت کرنے لگی۔ پہلے تو عبید بھائی نے اسے سختی سے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کسی طرح باز نہ آئی تھی۔ بعض اوقات وہ بھائی سے گھر ملنے آنے لگی گھر والوں کی غیر موجودگی کے باعث وہ بہت بے باک ہو جاتی۔ عبید بھائی نے اسے بہت سمجھایا بہت طریقوں سے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی مگر وہ راہِ راست پر تو نہ آئی مگر بھائی راہِ راست سے بھٹکا دیا۔ وہ دونوں گناہ کی دلدل میں گر گئے۔ وہ لڑکی تو کچھ عرصے بعد محلّہ چھوڑ چھاڑ کر چلی گئی مگر عبید بھائی کو گناہوں کا عادی بنا گئی۔ وہ راتوں کو گھر دیر سے آنے لگے۔ بلکہ بعض اوقات تو رات کو بھی گھر نہ آتے۔ امی ابو کے پوچھنے پر وہ محفلِ میلاد کا بہانہ بنا دیتے۔ امی ان سے شادی کے حوالے سے بات کرتیں تو وہ ٹال دیتے وہ گناہوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اب وہ کسی رشتے میں بندھ کر نہیں جینا چاہتے تھے۔ مجھے اکثر دوستوں سے خبریں ملنے لگی کہ حافظ عبید کو اکثر ہم نے بازارِ حسن میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ میرے لیے یہ سب کچھ حیران کن تھا۔ اتنا نیک پرہیز گار انسان جو مسجد کا امام بن چکا تھا جو لوگوں کو روشنی میں لاتا وہ خود گناہ کے اندھیروں میں چلا گیا تھا۔ رات کو وہ گناہوں میں مشغول رہتے مگر دن میں اس پاکیزہ حلیے میں ہوتے کہ لوگ تعریف کرتے نہ

تھکتے۔ ان کے ظاہر اور باطن میں تضاد پیدا ہو چکا تھا اور انہیں کوئی خبر نہ تھی۔ میں اکثر اس موضوع پر بات کرتا وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہتے۔ ''کیا مولوی کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ کیا وہ دنیا کی رنگینی سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔'' ان کے کمرے سے رات گئے تک گانوں کی آوازیں آتی رہتی۔ امی ابو بھی ان کی اس تبدیلی پر حیران تھے۔ بے ہودہ اور فحاشی پر مبنی فلموں کے دلدادہ ہو چکے تھے۔

ان کا ایک عمل تو ہم سب گھر والوں کو خوفزدہ کر گیا۔ گھر میں بچے قرآن پڑھنے آتے تھے۔ عبید بھائی ان بچوں کو بلاوجہ چومتے رہتے۔ ان کی کمر اور ٹانگوں پر بار بار ہاتھ پھیرتے رہتے۔ اس عمل کی وجہ سے ملنے والا لطف ان کی نگاہوں سے عیاں ہوتا۔ میں اکثر ان سے الجھ پڑتا، انہیں منع کرتا مگر وہ سمجھنے سے بہت دور چلے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ بچوں کے ساتھ بدفعلی بھی کرنے لگے۔ معصوم بچے ان سے خوفزدہ رہنے لگے کچھ بچے مجھے یا اپنے گھر والوں کو بتاتے تو عبید بھائی شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا انہیں مارتے۔

حفظ کرنے والا حافظ عبید قرآن پاک کا احترام تک بھول گیا تھا کہ قرآن کے کیا احکامات ہیں اور حافظ کو کن کن نزاکتوں کو سمجھنا ہوتا ہے۔ وہ برائیوں کے سمندر میں بری طرح سے ڈوب چکے تھے۔

عبید بھائی کو بخار رہنے لگا۔ چند دن تک ٹھیک رہتے پھر اس قدر بخار چڑھ جاتا کہ بے ہوشی میں چلے جاتے۔ آخر ابو کے اصرار پر ان کا ٹیسٹ کروایا تو ایڈز کا مرض ہم سب کو دہلا گیا وہ بھی آخری اسٹیج تھی اور پھر ان کی کربناک موت تو آپ کے سامنے ہی تھی۔'' زبیر یہ بتا کر خاموش ہو گیا۔

میں پتھر کا بت بنا یہ سارا قصہ سن رہا تھا۔ مجھے تو اندازہ بھی نہیں ہوسکا تھا کہ جس کی جوانی کو میں رشک کی نظر سے دیکھتا تھا اسے اندر اندر ہی گناہوں کی دیمک لگ چکی تھی اور اس کی دیمک زدہ جوانی لوگوں کو رشک میں مبتلا کرتی تھی اس کا انجام بھیانک موت تھی۔ میرا سینہ دکھ سے پھٹ رہا تھا۔

''حسن بھائی کسی عالم یا امام مسجد کے پاس چلتے ہیں وہی اس مسئلے کا حل بتائیں گے۔'' زبیر نے مشورہ دیا۔

☆.....☆

امام صاحب نے پوری توجہ سے ہمارا مسئلہ سنا۔ وہ خواب کی تعبیر کے بھی ماہر تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

''امام صاحب! آخر اسے میرے قرآن پڑھنے سے اذیت کیوں ہوتی ہے۔ وہ مجھے اتنے بھیانک انداز میں نظر آتا ہے اور قرآن پڑھنے سے منع کرتا ہے۔ میں تو نیکی کا کام کرتا ہوں۔''

''یا اللہ تو ہم سب کو معاف فرمادے۔'' رقت آمیز لہجے میں وہ بار بار یہی الفاظ دہرا رہے تھے۔

''بیٹا اصل میں مسئلہ بہت کربناک ہو چکا ہے۔ اللہ نے اسے حافظ قرآن بنایا۔ اتنی بڑی سعادت عطا فرمائی جو ہر مسلمان کے حصے میں نہیں آتی۔ یہ تو خوش نصیبوں کو ہی ملتی ہے مگر وہ اس نعمت کی قدر نہیں کر سکا۔ دوسروں کو نصیحت کرنے والا خود بھٹک گیا۔ حافظ قرآن پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ صرف قرآن کو یاد نہیں کرے گا بلکہ اسے یاد رکھے گا اور اس کے احکامات پر سختی سے عمل پیرا رہے گا۔''

''جب تم اس کی قبر پر تلاوت کرتے ہو تو اس دوران کوئی ایسی آیت آجاتی ہے جس میں اللہ نے نافرمانی پر سخت عذاب دینے کا حکم سنایا ہے، آیت پر اسے عذاب قبر ہونے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے تمہارا عمل اسے فائدہ دینے کی بجائے اذیت دیتا ہے اور وہ خواب میں آکر تمہیں منع کرتا ہے۔'' امام صاحب کہہ کر خاموش ہو گئے۔

امام صاحب کی بات سن کر مجھے اس بات کا مطلب آگیا کہ جب نعمت بڑی ملتی ہے تو اس کا حساب بھی بڑے پیمانے پر دینا پڑتا ہے۔

اس دن کے بعد سے میں نے حافظ قرآن محمد عبید کی قبر پر جانا چھوڑ دیا مگر اس کے ایصال ثواب کے لیے دوسرے طریقے اپنا لیے۔ مسجدوں میں لائٹ، پنکھے لگوانا، غریبوں کو کھانا کھلانا، کسی مستحق بچے کی اسکول کی فیس ادا کرنا اس نیت سے کہ یہ صدقہ جاریہ والے کام حافظ عبید کو عذاب قبر سے بچالیں۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائیں۔ اس کی اندھیری قبر کو روشن کردیں، (آمین)۔

☆☆☆

مالا کو ن تھی؟

نفیسہ سعید

مالا کو بارش کی بوندوں سے بڑا ڈر لگتا تھا اور پھر اک بارش ہی اسے بہا کر لے گئی

اس نے پردہ ہٹا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ملگجی روشنی میں سامنے نظر آنے والے منظر کو دیکھتے ہی اسے جھرجھری سی آگئی۔ چاند کی ہلکی سی روشنی میں رہائشی علاقے میں موجود ایک پلاٹ پر قائم وہ چھوٹا سا قبرستان بہت عجیب لگ رہا تھا۔ رومیعہ نے کھسیا کر کھڑکی کا پردہ چھوڑ دیا۔ وہ بے بی آن نوید کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ ایسے میں گھر کی تنہائی اور کچھ دیر قبل دیکھا گیا منظر اس کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ کر گیا۔

اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا ابھی صرف بارہ بجے

تھے۔ آج مالا واک کرنے اوپر نہ آئی تھی۔ ورنہ اس کا وقت اچھا گزر جاتا ویسے بھی جب سے سرد موسم کی اندھیری راتیں شروع ہوئی تھیں بالا اوپر کم ہی آتی تھی کیونکہ اسے سردیاں کچھ خاص پسند نہ تھیں جب کہ رومیعہ تو اس سرد موسم کی دیوانی تھی۔

تھوڑی دیر بستر پر بیٹھ کر اس کا خوف قدرے کم ہو گیا۔ اس نے کمرے سے نکل کر باہر جھانکا اماں حاجرہ اپنے کمرے میں سونے جا چکی تھیں۔ رومیعہ نے کافی میکر نکالا اور لاؤنج میں رکھا ٹی وی چلا دیا۔ ٹی وی کی آواز نے گھر میں پھیلی خاموشی کو ختم کر دیا اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی کافی بنا کر ٹی وی کے سامنے آن بیٹھی جہاں کوئی ٹاک شو آ رہا تھا۔ پھر ٹی وی دیکھتے دیکھتے اسے ٹائم کا پتا بھی نہ چلا اور وہ وہیں صوفے پر سو گئی۔

☆.....☆

رومیعہ کی چھ ماہ قبل شادی ہوئی تھی اور وہ رخصت ہو کر نوید عالم کے ساتھ اس فلیٹ میں آئی تھی کیونکہ اس کی ساس اپنے بڑے بیٹے کے پاس لندن رہتی تھیں جب کہ نوید محکمہ گورنمنٹ کا ایک اعلیٰ سرکاری افسر تھا جس کے باعث وہ اپنی نوکری چھوڑ کر لندن جا کر رہنے پر آمادہ نہ تھا۔ یہ ہی سبب تھا جو وہ اپنا آبائی گھر کرائے پر دے کر خود یہاں شہر کے ایک مہنگے علاقے کے لگژری فلیٹ میں رہائش پذیر تھا جہاں رومیعہ کو اور تو کوئی مسئلہ نہ تھا سوائے اس خالی پلاٹ کے جو اس کے بیڈروم کی کھڑکی کے عین سامنے تھا جس کے چاروں طرف باؤنڈری وال کے علاوہ ایک بڑا سا گیٹ بھی تھا۔

اس پلاٹ کے اندر چھوٹی چھوٹی قبریں تھیں۔ اماں حاجرہ نے بتایا تھا کہ یہ ہندوؤں کا قدیمی قبرستان ہے چونکہ یہ علاقہ پہلے آباد نہ تھا لہٰذا یہاں قبرستان بنا دیا گیا مگر وقت اور ضرورت کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے قبرستان کے آس پاس کئی منزلہ بلڈنگیں بن گئیں مگر اس پلاٹ پر موجود وہ شمشان گھاٹ آج بھی اپنی جگہ موجود تھا جسے یا تو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی یا پھر وہ پلاٹ ہی ہندو کمیونٹی کا تھا جو اسے بڑھتی آبادی کے باوجود ختم کرنے پر آمادہ نہ تھے جو بھی تھا یہ قبرستان کم از کم رومیعہ کو ضرور پریشان کر رہا تھا جب کہ اماں حاجرہ اور نوید کو اس سے کوئی مسئلہ نہ تھا اور نہ ہی کبھی کسی بلڈنگ والے نے اس کی شکایت کی تھی اس لیے رومیعہ بھی خاموش تھی کیونکہ اسے لگتا کہ شاید یہ پریشانی اس کی اپنی خود ساختہ ہے۔ ورنہ دوسرے لوگوں کو کوئی پرابلم نہ تھی کہ رہائشی علاقے میں یہ قبرستان ہے۔

☆.....☆

''شکر ہے تم آ گئیں ورنہ میں تو چھت پر اکیلے واک کر کے بور ہی ہو چکی تھی۔'' سیڑھیوں سے اوپر آنے والا ہیولہ مالا کا تھا۔

رومیعہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی رومیعہ نے دیکھا کہ اس کی سفید رنگت میں قدرے پیلاہٹ گھلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے چہرے سے ہی بیمار اور تھکی تھکی دکھائی دے رہی تھی۔

''طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' رومیعہ اس کی سمت دیکھتے ہوئے بولی۔

''بہتر ہے۔'' اس کا جواب ہمیشہ اتنا ہی مختصر ہوتا پھر بھی اس کا ساتھ رومیعہ کو اچھا لگتا۔

وہ کافی کم گو سی لڑکی تھی جو شاید فرسٹ فلور کے کسی اپارٹمنٹ کی رہائشی تھی۔ یہاں شفٹ ہونے کے بعد پہلے دن جب رومیعہ اوپر واک کرنے آئی تو مالا پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ دبلی پتلی سی یہ لڑکی رومیعہ کو دوستی کے لیے اچھی لگی مگر ان دونوں کی یہ دوستی صرف چھت تک ہی محدود تھی نہ کبھی مالا نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور نہ کبھی رومیعہ اسے اپنے ساتھ لے کر نیچے گئی وجہ شاید ٹائم تھا جو اوپر واک کے دوران ہی اتنا زیادہ ہو جاتا کہ رومیعہ کو اسے اپنے گھر لے جانا اچھا نہ لگتا۔

''مونگ پھلی کھاؤ گی؟'' واک کے دوران رومیعہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گرم مونگ پھلی کا لفافہ اس کی جانب بڑھایا۔

''سوری میں مونگ پھلی نہیں کھاتی۔''

''عجیب لڑکی ہو تم کچھ بھی نہیں کھاتیں، نہ مونگ پھلی، نہ ریوڑی اور نہ ہی کوئی ڈرائی فروٹ۔ یہاں تک کہ بھنے ہوئے چنے بھی نہیں کھاتی ہو۔''

رومیعہ جب بھی اسے کوئی چیز کھانے کو دیتی وہ ہمیشہ انکار کر دیا کرتی۔ رومیعہ کو احساس ہوا کہ مالا شاید ہندو ہے اس لیے کسی مسلمان کے ہاتھ کا نہیں کھاتی اس نے اتنے ماہ میں آج تک مالا سے کبھی اس کے مذہب کے متعلق نہ پوچھا تھا کیونکہ اسے اچھا نہ لگتا تھا حالانکہ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اس سے اس قبرستان کے بارے میں پوچھے جو اس کے گھر کے قریب ہی تھا۔ پھر یہ سوچ کر کہ کہیں اسے کوئی بات بری

لگ جائے خاموش ہو جاتی۔

اچانک کالے رنگ کا بڑا سا بلا ان کے سامنے آن کھڑا ہوا جو اپنی گہری نیلی آنکھوں سے ان کی جانب ایسے گھور رہا تھا کہ وہ دونوں خوف زدہ ہو گئیں جب کہ مالا تو ویسے بھی بلیوں سے بہت ڈرتی تھی جس کا عملی مظاہرہ کئی بار رومیعہ دیکھ چکی تھی۔

''یہ..... یہ کہاں سے آ گیا؟'' ٹوٹا پھوٹا جملہ ادا کرتی وہ رومیعہ کے پیچھے اس طرح چھپ گئی کہ اسے سامنے موجود بلا بالکل دکھائی نہ دے رہا تھا جو شعلہ برساتی آنکھوں سے رومیعہ کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رومیعہ نے چپل اتار کر بلے کی جانب پھینکی وہ فوراً پیچھے کی طرف واپس بھاگ گیا۔ اس کے بھاگتے ہی مالا نے بھی سیڑھیوں کی جانب دوڑ لگا دی۔ رومیعہ نے پیچھے جا کر اسے روکنا چاہا مگر وہ سیڑھیاں اترتے ہی ایسے غائب ہوئی کہ رومیعہ کو اندھیرے میں نظر نہ آئی۔

مالا کے اس طرح خوف زدہ ہو کر بھاگنے پر وہ دل ہی دل میں ہنس دی اور نیچے اتر آئی۔

☆.....☆

جانے کیوں آج رومیعہ کا دل چاہا وہ مالا سے اس کی ذاتی زندگی کے متعلق کوئی سوال کرے شاید لاشعوری طور پر اس کے اندر یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ وہ جانے مالا کون ہے؟ چار ماہ سے اس کی ملاقات تقریباً روز ہی چھت پر اس سے ہو جاتی تھی مگر وہ یہ نہ جانتی تھی کہ مالا اس بلڈنگ کے کون سے فلور پر رہتی ہے؟ وہ کیا کرتی ہے۔ شادی شدہ تھی یا نہیں یہ سوچ کر اس نے آج اپنی گفتگو کا آغاز مالا کی ذاتی زندگی سے کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

''تمہارے گھر میں اور کون کون ہوتا ہے؟''

''مطلب!'' چلتے چلتے رک کر مالا نے حیرت سے کچھ اس طرح رومیعہ کو دیکھا کہ وہ بھی تھوڑا سا گڑبڑا گئی۔

''مطلب یہ کہ تم اکیلی رہتی ہو آئی مین تمہاری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟''

اس کے سارے جملے کا ایک لفظ میں جواب دے کر وہ اس طرح آگے کی طرف بڑھی کہ اس سے مزید کچھ پوچھنے کی خواہش رومیعہ کے اندر ہی دم توڑ گئی۔

''میں فرسٹ فلور فلیٹ نمبر 103 میں رہتی ہوں۔''

رومیعہ کے خاموش ہوتے ہی شاید مالا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اسی لیے وہ پلٹ کر اس کی جانب آتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ اسی ٹائم آسمان پر زور سے بجلی چمکی ساتھ ہی بادل کے گڑگڑانے کی آواز جسے سنتے ہی مالا بچوں کی طرح گھبرا اٹھی۔ رومیعہ نے دیکھا خوف سے اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

''مجھے بارش بالکل اچھی نہیں لگتی۔ بہت ڈر لگتا ہے۔ بارش میں بھیگنا ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میرا سارا جسم جل رہا ہو۔ پانی کی بوندیں مجھے آگ کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ آپ کو پتا ہے آگ میں جلنا کتنا ہولناک ہوتا ہے۔ اس کا تصور ہی میرے سارے جسم میں کپکپی طاری کر دیتا ہے۔''

آج پہلی بار رومیعہ نے اس کو اتنا بولتے سنا تھا مگر وہ کیا کہہ رہی تھی رومیعہ بالکل سمجھ نہ پائی اس کی زبان سے نکلنے والے بے ربط جملے، کبھی کبھی تو رومیعہ کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ پاگل ہے۔ جیتے جی خود کو آگ میں جلتے دیکھنا۔ خوب صورت جسم کا آگ کے شعلوں کی نذر ہو جانا کبھی دیکھا ہے آپ نے۔''

سی پل بادل ایک بار پھر سے گرجے، مالا اس کا جواب سنے بنا ہی سیڑھیوں کی جانب بھاگ گئی جب کہ پیچھے کھڑی رومیعہ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ آواز دے کر اس کو روک سکے۔

☆.....☆

ایک ہفتے سے اوپر ہو گیا تھا مالا چھت پر نہ آئی تھی۔ ویسے بھی پچھلے پورے ہفتے سے ہی بارشیں ہو رہی تھیں چونکہ وہ اور بہت ساری چیزوں کی طرح بارش سے بھی ڈرتی تھی۔ اس لیے اوپر نہ آئی تھی مگر اب دو دن سے بارش بالکل ختم ہو گئی تھی پھر بھی وہ اوپر نہ آئی جب شام میں نوید کے ساتھ باہر جاتے ہوئے اس نے بے اختیار رک کر فلیٹ نمبر 103 پر نظر ڈالی جہاں بڑا سا تالا اندھیرے میں بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔ یہ سوچ کر وہ نیچے اتر گئی اور پھر گاڑی میں بیٹھتے ہی پہلی بار اس نے نوید سے مالا کا ذکر کر دیا۔

''کیا وہ لڑکی ہندو ہے کیونکہ نام سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

پتا نہیں میں نے کبھی پوچھا نہیں مگر شاید وہ فلیٹ نمبر 103 میں رہتی ہے اور کافی دنوں سے اوپر نہیں آئی۔''

''فلیٹ نمبر 103۔'' نوید نے حیرت سے دہرایا۔

"تمہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ وہاں تو شاید کوئی بھی نہیں رہتا، وہ فلیٹ ایک عرصے سے خالی ہے۔"

"اچھا! پھر ہوسکتا ہے مجھے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔"

نوید وہاں پچھلے ایک سال سے رہ رہا تھا اس لیے وہ رومیعہ کے مقابلے میں بہتر جانتا تھا کہ آس پڑوس میں کون کون رہتا ہے اور پھر گھر واپس آتے ہی وہ اماں حاجرہ سے مالا کے متعلق پوچھ بیٹھی۔

"پتا نہیں بیٹا میں تو گھر سے صرف سودا سلف لینے ہی باہر جاتی ہوں اور آس پڑوس میں میری کسی سے ایسی دوستی کہاں جو میں کسی کے بارے میں کچھ جان سکوں۔"

ان کا جواب بالکل درست تھا وہ تو سارا دن گھر میں ہی رہتی تھیں۔ رومیعہ کی سمجھ میں نہ آیا وہ مالا سے متعلق کس سے پوچھے۔ پھر سوچا ہوسکتا ہے ایک دو دن تک وہ خود ہی اوپر آجائے مگر ایسا بھی نہ ہوا اور یہ ہی سوچ کر ایک دن وہ اماں حاجرہ کو لیے نیچے فرسٹ فلور پر آگئی جہاں آمنے سامنے کئی فلیٹ بنے تھے۔ یہاں ہر فلور پر دس فلیٹ تھے۔ فرسٹ فلور کے 103 فلیٹ کے علاوہ تقریباً سب میں ہی لوگ آباد تھے اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس کا دروازہ بجا کر مالا کے متعلق سوال کرے کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی اور پھر نیچے اتر کر مین گیٹ کی جانب آگئی جہاں موجود سیکورٹی گارڈ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔

جیسے ہی رومیعہ اس کے پاس جا کر کھڑی ہوئی وہ جلدی سے اٹھتا ہوا بولا۔

"السلام علیکم باجی خیریت ہے۔"

"وہ دراصل مجھے ایک لڑکی کے بارے میں جاننا تھا۔" رومیعہ نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"لڑکی کے بارے میں.....!" عبدل نے حیرت سے پہلے اسے اور پھر حاجرہ کو دیکھا۔

"ہاں عبدل بھائی فرسٹ فلور پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی رہتی ہے جو روزانہ اوپر چھت پر میرے ساتھ واک کرنے بھی آتی ہے مگر پچھلے کافی دنوں سے وہ نہیں آرہی۔"

"آپ اس کا نام جانتی ہیں؟"

"مالا نام ہے اس کا، گوری سی ہے، بہت لمبے بال ہیں۔"

"بہت لمبے بالوں والی لڑکی تو میں نے یہاں کبھی نہیں دیکھی، ہاں فیصل صاحب کی بیٹی ہے فلیٹ نمبر 107 میں۔ نام تو مجھے اس کا نہیں پتا۔ بال کافی لمبے ہیں۔ ایک دفعہ ایسے ہی میری نظر پڑ گئی تھی۔ آپ وہاں جا کر پوچھ لیں شاید وہ آپ کی مشکل حل کردیں۔"

عبدل کی بات سنتے ہی وہ وہاں رکی نہیں بلکہ تیز تیز چلتی فرسٹ فلور کے فلیٹ نمبر 107 کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور بنا سوچے سمجھے ہی بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کون؟"

دوسری طرف دروازہ کھول کر باہر آنے والی ایک چالیس سے پینتالیس سالہ عورت تھی جو رومیعہ کو اپنے سامنے دیکھ کر تھوڑا سا حیران ہوئی۔

"السلام علیکم جی۔ میں مسز نوید عالم ہوں اسی بلڈنگ کے تھرڈ فلور پر میری رہائش ہے مجھے دراصل مالا سے ملنا ہے۔" تیز تیز بولتے ہوئے اس نے جلدی سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اگلے ہی پل اس کی خواہش کے عین مطابق مالا اس کے سامنے آجائے گی۔

"مالا.....کون مالا.....؟"

جواب اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اب رومیعہ کی سمجھ میں نہ آیا مزید کیا کہے۔

ایک سولہ سترہ سالہ لڑکی اس عورت کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ رومیعہ نے دیکھا اس کے لمبے سیاہ بال کمر سے نیچے جھول رہے تھے مگر ظاہر ہے وہ مالا نہ تھی۔ مایوسی کے ساتھ ساتھ رومیعہ کو شرمندگی نے بھی گھیر لیا۔

"سوری دراصل مجھے لگا شاید مالا اسی فلیٹ میں رہتی ہے۔"

"نہیں اس فلیٹ میں تو نہیں، یہاں تو میں اور میری یہ اکلوتی بیٹی رہتی ہے۔ جب کہ میرا خیال ہے کہ ہمارے پورے فلور پر مالا نامی کوئی لڑکی نہیں رہتی۔"

"دراصل اس نے مجھے اپنے فلیٹ کا نمبر 103 بتایا تھا جب کہ....."

"103 تو پچھلے کئی سالوں سے خالی پڑا ہے۔"

رومیعہ کا جملہ کاٹ کر خاتون نے نوید عالم کی بات کی تصدیق کردی۔

"بہت سال پہلے یہاں ایک فیملی آباد تھی پھر ان کے ساتھ ایک ایسا حادثہ ہوا کہ وہ لوگ یہ گھر چھوڑ کر چلے گئے اور دوبارہ یہاں کوئی نہ آیا۔"

دروازے پر کھڑے کھڑے ہی اس خاتون نے رومیعہ

کو تفصیل فراہم کرنا شروع کردی۔

"کون سا حادثہ؟" نہ چاہتے ہوئے بھی رومیعہ پوچھ بیٹھی۔

"سنا ہے ان کی جوان بیٹی کہیں اچانک غائب ہوگئی تھی۔ بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملی شاید بدنامی سے بچنے کے لیے اس کے ماں باپ یہ گھر بھی چھوڑ کر چلے گئے لیکن ان کے جانے کے کچھ دنوں بعد فلیٹ سے اٹھنے والی بدبو نے سب کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ جب پولیس تالا توڑ کر اندر داخل ہوئی تو وہاں اس نوجوان لڑکی کی تعفن شدہ لاش پڑی تھی جس کی بدبو پورے محلے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔" بولتے بولتے خاتون ایک پل کے لیے خاموش ہوگئی۔

رومیعہ نے پلٹ کر فلیٹ نمبر ایک سو تین کے دروازے پر نظر ڈالی۔

"مگر لڑکی تو غائب ہوئی تھی پھر لاش گھر سے کیسے ملی؟" رومیعہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہ ہی بات تو آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ آخر وہ مرد و عورت کون تھے کیا واقعی وہ اس لڑکی کے والدین تھے۔ جو اپنی بیٹی کی لاش کو اس طرح فلیٹ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پولیس کا خیال تھا شاید وہ لڑکی واپس آگئی تھی جسے اس کے باپ نے غیرت کے نام پر قتل کردیا اور لاش گھر میں ہی چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

"اوہ.....اس قدر سفاکی۔" رومیعہ نے خوف سے جھرجھری لی۔

"ہاں یہ ہی وجہ ہے کہ یہ فلیٹ دوبارہ کبھی آباد نہ ہوا۔ قاتل اسے ویران کر کے نکل گئے اور پھر چاہنے کے باوجود کوئی اسے آباد نہ کرسکا۔ ایک ڈر و خوف اس فلیٹ کے حوالے سے ایسا لوگوں کے دلوں میں اجاگر ہوا کہ شاید ابھی تک دور نہیں ہوسکا.....! ارے میں یہاں کھڑے کھڑے ہی سب باتیں کر رہی ہوں آپ اندر تو آئیں۔"

شاید عورت کو احساس ہوگیا تھا کہ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ رومیعہ کے ساتھ دروازے پر ہی کھڑی ہے۔

"نہیں شکریہ میں اب جاؤں گی، میرے میاں کے گھر آنے کا وقت ہوگیا ہے۔"

معذرت کرتی رومیعہ اوپر آگئی اور پھر کئی دن لگ گئے رومیعہ کو وہ کہانی بھلانے میں جس کے مطابق فلیٹ سے جوان لڑکی کی تعفن شدہ لاش ملی تھی اور شاید جسے اس طرح مارنے میں اس کے اپنے سگے باپ کا بھی ہاتھ تھا۔ دنیا اتنی ظالم ہوتی ہے؟ یہ بات اسے چند گھنٹے پہلے ہی پتا چلی تھی اور جسے وہ آنے والے کئی دنوں تک سوچ سوچ کر بے حال ہوتی رہی۔

☆.....☆

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیگر صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑی اچھی صلاحیت سے نوازا ہے اور وہ صلاحیت ہے بھول جانے کی۔ بڑی سے بڑی بات اور نہ بھلانے والا حادثہ، بھولنے میں محض چند دن یا شاید کچھ سال درکار ہوتے ہیں اور پھر ہم سب کچھ بھول کر اپنی موجودہ زندگی میں گم ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی رومیعہ کے ساتھ بھی ہوا۔ فلیٹ نمبر 103 کا حادثہ وہ چند ہی دنوں میں بالکل فراموش کر بیٹھی مگر مالا کی تلاش اس کے وجود کے اندر کہیں بیٹھی انتظار کرتی رہی کہ شاید کبھی زندگی میں اسے مالا دوبارہ مل جائے۔ یہ ہی وجہ تھی جو وہ بلڈنگ میں آنے، جانے والی ہر لڑکی کو غور سے دیکھتی، کبھی جو کسی ڈپارٹمنٹ اسٹور پر جانا ہوتا تو اس کی متلاشی نگاہیں مالا کو کھوجتی رہتیں، سڑک سے گزرنے والی ہر لڑکی میں وہ مالا تلاشتی مگر مالا جانے کہاں گم ہوگئی تھی جو ہر بار رومیعہ کی تلاش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اس کی مالا کو تلاشنے کی لگن اتنی سچی تھی کہ ایک دن وہ اس میں کامیاب بھی ہوگئی مگر ایسی کامیابی جس کے بعد کئی سال تک رومیعہ کا دل یہ ہی سوچ کر کانپتا رہا کہ اس نے مالا کی تلاش کی اتنی کوشش ہی کیوں کی تھی۔

☆.....☆

وہ جاتی سردیوں کی ایک شام تھی۔ اماں حاجرہ کو صبح سے ہی نزلہ زکام نے جکڑ رکھا تھا جس کے باعث وہ اپنی چارپائی پر رضائی اوڑھے دبکی پڑی تھی۔ نوید عالم آفس کے کسی کام کے سلسلے میں کل ہی کوئٹہ گیا تھا اور اس تنہائی میں رومیعہ کا دل بے حد گھبرا رہا تھا دو گھنٹے اس نے لاہور اپنی ماں اور بہن سے بات کی اور پھر جیسے ہی فون بند کیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بیرونی دروازے کے پاس سے گزر کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھا ہے اس کا اندرونی لکڑی کا دروازہ کھلا تھا جب کہ اس کے باہر موجود گرل کو وہ ہمیشہ اندر سے لاک رکھتی۔ تنہائی میں ابھرنے والے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے گرل کے پار جھانکا۔ ایک بہت لمبے بالوں والی لڑکی تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی اوپر جا رہی تھی۔ رومیعہ کو لگا

وہ مالا ہے وہ جلدی سے اپنا دوپٹہ اوڑھ کر اس لڑکی کے پیچھے لپکی جو اوپر چھت پر جا کر غائب ہو چکی تھی۔ رومیعہ بھی تیزی سے چڑھتی اوپر آئی۔ سرشام ہی چھت پر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر رومیعہ نے جیسے ہی سیڑھیوں کے قریب موجود بلب آن کیا ملگجی کی پیلی روشنی پوری چھت پر پھیل گئی۔

''مالا..... مالا.....!'' اوپر چڑھتے ہی اس نے آواز لگائی۔ اس کی آواز کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ رومیعہ نے تھوڑا مزید آگے بڑھ کر دیکھا۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا اور چھت بالکل خالی پڑی تھی۔ وہ ایک دم گھبرا کر واپس پلٹی جب اس کا پاؤں اس کالے بلے سے ٹکرا گیا جو ہمیشہ مالا کو خوف زدہ کر دیتا تھا۔ بلے نے بلبلا کر رومیعہ کی جانب دیکھا اس کی چمکتی موٹی کانچ جیسی آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ رومیعہ یک دم خوف زدہ ہو کر نیچے بھاگی۔ کانپتے ہاتھوں سے گرل کا لاک کھولا تو سامنے ہی اماں حاجرہ کھڑی تھیں۔

''اے بیٹا تم کہاں چلی گئی تھیں۔ نوید صاحب کا فون آیا تھا تمہیں پوچھ رہے تھے۔ انہیں فون کر کے اپنی خیریت کا بتا دو۔'' بات کرتے کرتے انہیں احساس ہوا رومیعہ کچھ گھبرائی ہوئی ہے۔

''کیا بات ہے بیٹا۔ سب خیر تو ہے؟''

جواباً رومیعہ نے انہیں کچھ دیر قبل والا سارا واقعہ من وعن سنا دیا جسے سنتے ہی اماں حاجرہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری بات مانو تو بیٹا اس لڑکی کو بھول جاؤ کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تم نے اسے اپنے حواسوں پر اس بری طرح سوار کر لیا ہے کہ وہ تمہارے خیالوں سے نکل کر ایک شکل میں ڈھل گئی ہے جو تمہیں ہر وقت یہاں وہاں دکھائی دے رہی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ درست کہہ رہی ہیں۔'' رومیعہ نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے شاید وہم ہوا تھا کہ کوئی اوپر گیا ہے بلاوجہ ہی اس کے پیچھے اوپر بھاگی میرا شاید دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

اور رات کے کھانے تک وہ شام کا واقعہ بالکل بھول چکی تھی۔ کھانا کھا کر اس نے نوید سے فون پر بات کی پھر کافی بنا کر ٹی وی کے سامنے آن بیٹھی جب اسی پل باہر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ رومیعہ کافی کا کپ لے کر اپنے کمرے میں موجود کھڑکی کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ابھی اس نے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا ہی تھا کہ اسے محسوس ہوا سامنے قبرستان کے بیچوں بیچ کوئی کھڑا ہے۔ وہ جلدی ہی کھڑکی کی آڑ میں ہو گئی۔ شاید وہ کوئی چور یا ڈاکو تھا یا پھر کوئی غریب کچرا چننے والا بچہ جو شاید بارش سے پناہ لینے کے لیے رات کے اس پل قبرستان میں داخل ہوا تھا ایسے ہی وقت گزاری کے طور پر رومیعہ اسے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ سایہ آہستہ آہستہ چلتا قبرستان سے باہر نکل آیا۔

رومیعہ نے دیکھا وہ ایک لڑکی تھی جو دھیرے دھیرے چلتی روڈ پر لگے پیلے بلب کے نیچے آن کھڑی ہوئی۔ لمبے سیاہ بال اس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً مالا تھی جو رومیعہ کا وہم ہرگز نہ تھا اس نے جلدی سے کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا تاکہ مالا کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کر سکے لیکن اس کے آواز دینے سے قبل ہی مالا نے بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑے ہو کر اوپر دیکھا۔ اتنی دور سے بھی رومیعہ کو لگا وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کی مسکراہٹ میں جانے ایسا کیا تھا کہ رومیعہ خوف زدہ ہو کر تھوڑا پیچھے ہو گئی جب اسی پل مالا پٹی اور سست قدمی سے چلتی قبرستان کے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی فضا میں پھیلا اندھیرا مزید گہرا ہو گیا۔ رومیعہ نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا قبرستان بالکل خالی تھا۔

''اوہ میرے خدا۔'' خوف کی ایک جھرجھری نے اسے اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا کہ وہ کھڑے کھڑے زمین پر گر گئی۔ زمین پر گرتے وقت مالا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''بارش کی بوندیں میرے جسم پر آگ کی طرح برستی ہیں۔ تم نے کبھی کسی کو جلتے دیکھا ہے جلنے کی تکلیف.....! اور اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گئی جب اسے ہوش آیا تو اس کی امی اور نوید عالم دونوں اسپتال میں اس کے پاس تھے۔ بقول نوید کے رومیعہ ایک ہفتے بعد ہوش میں آئی تھی۔ وہ کیوں بے ہوش ہوئی تھی چاہ کر بھی کسی کو نہ بتا سکی اگر اس کی حالت کے پیش نظر نوید نے بنا اس کے کہے اپنا گھر تبدیل کر لیا اور زندگی میں دوبارہ کبھی اس طرف نہ گئی جہاں آخری بار اس نے مالا کو دیکھا تھا۔ مالا کون تھی؟ کہاں رہتی تھی؟ یہ سب جاننے کی اس کی خواہش دم توڑ گئی یا شاید وہ جان گئی تھی کہ مالا کی اصل حقیقت کیا ہے۔

☆☆☆

مالا ان چھتری

الماس فاطمہ ارمان

اُس آتما کی کہانی جو ایک لال چھتری میں قید تھی

میرے کزن کو گاؤں قصبے گھومنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کرائم رپورٹر ہیں۔ اس لیے وہ گاؤں گھوم پھر بھی آتے اور کوئی نہ کوئی کہانی یا جرائم پیشہ لوگوں کا بھی پتا لگا لیتے ہیں۔ میں نے اس کہانی میں ان کا اصل نام نہیں لکھا بلکہ انہیں عارف لکھا ہے۔

عارف ہر گاؤں میں دس دن سے کم ہی گزارتے ان تھوڑے سے دن میں وہ سب مشاہدہ کر لیتے۔ گاؤں کے اکثر وڈیرے انہیں جانتے تھے۔

کچھ عرصہ پہلے وہ خیر پور کے ایک گاؤں مورو جا پہنچے۔ وہاں کے وڈیرے نے ان کی کافی آؤ بھگت کی۔ رات کو سونے کے لیے وڈیرہ سائیں بچل کے بیٹھک میں بستر لگوایا مگر وہاں بہت گرمی تھی۔ عارف نے کہا۔ ”کیا یہاں ایسی جگہ جہاں تازہ ہوا اور ٹھنڈ نہ ہو۔“

سائیں بچل نے ملازم سے کہا۔ ”ان کو راجو کے گھر لے جاؤ۔ کہنا سائیں کا آدمی ہے۔“

راجو نے بڑی خوش اخلاقی سے استقبال کیا راجو کا گھر کافی بڑا تھا۔ آنگن میں چیکو، شہتوت اور آم وغیرہ کے درخت لگے تھے۔ ایک طرف گلاب، چنبیلی، موتیا کے پودے لگے ہوئے تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو اچھی لگ رہی تھی۔

راجو نے وہیں پلنگ پر بستر لگا دیا اور پلنگ کے ساتھ پنکھا چلا دیا۔ ”صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟“

”نہیں۔“

”تم اکیلے رہتے ہو؟“

”جی۔“

وہ میری بات سن کر کمرے سے چلا گیا۔ میں لیٹ گیا درختوں اور پنکھے کی ٹھنڈی ہوا سے مجھے نیند آنے لگی۔ سفر کی تھکان الگ تھی۔ میری آنکھ لگ گئی۔ میں گہری نیند میں تھا کہ مجھے ایسا لگا کہ میرے پلنگ کے پاس کوئی لڑکی سسک کر رو رہی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف نظر ڈالی کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے واش روم کی حاجت محسوس ہوئی۔ میں اٹھا پورے آنگن کا چکر لگایا مگر واش روم نظر نہ آیا۔ میں نے راجو کے کمرے کی طرف نظر ماری تو اس کے کمرے سے کچھ بڑبڑانے کی آوازیں آئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں آگے بڑھا میں نے کھڑکی سے کمرے کی طرف جھانکا تو دیکھا کہ وہ نیچے زمین پر بیٹھا زور زور سے کسی سے لڑ رہا ہے۔

عارف حیران ہو گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے تو وہ کس سے لڑ رہا ہے، عارف نے راجو کو آواز دی۔ ”راجو بھائی۔“ راجو تیزی سے باہر آیا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ لال انگارہ ہو رہا تھا۔ عارف اس کو دیکھ کر سہم گیا۔

”ہاں صاحب کیا ہے کچھ چاہیے؟“

”نہیں، مجھے واش روم جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

کمرے کے پیچھے واش روم تھا۔ واش روم سے فارغ ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔ نیند اڑ چکی تھی۔ راجو پھر سے کمرے میں چلا گیا۔ پھر عارف بھی نیند کی وادیوں چلا گیا۔

اسے پھر یہی محسوس ہوا کہ کوئی آس پاس رو رہا ہے۔ اس موبائل کی روشنی میں چاروں طرف دیکھا کوئی نظر نہ آیا۔ وہم سمجھا شاید آس پاس کوئی بچہ یا بچی رو رہی ہے۔ وہ پھر لیٹ گیا پھر اسے محسوس ہوا کوئی پلنگ کے پاس بیٹھا ہے اور کہہ رہی ہے مجھے بچا لو مجھے قید سے رہا کر دو۔ میں راجو کی قید میں ہوں۔ اس سے میرا لال دوپٹہ دلا دو۔ میری چڑی دلا دو۔“

عارف جھٹکے سے اٹھ گیا۔ موبائل کی ٹارچ کو جلایا۔ کوئی نظر نہ آیا اس نے موبائل میں ٹائم دیکھا رات کا آدھا پہر یعنی تین بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر موبائل پر گیم کھیلنے لگا۔ اس نے راجو کے کمرے کی طرف دیکھا وہ شاید سو چکا تھا کیونکہ اس کے کمرے میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے اوپر آیۃ الکرسی کا ورد کیا۔ چاروں قل پڑھ کر پھونکے اسے ڈر تو لگ رہا تھا وہ سمجھ بھی رہا تھا۔ ضرور یہاں کوئی آسیبی معاملہ ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور یوں گھر کا جائزہ لینے لگا۔ اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ البتہ اسے محسوس ہو رہا تھا کوئی اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ جب اس نے پورے گھر میں گھوم پھر کر دیکھ لیا تو اس نے سوچا ایک دفعہ راجو کے کمرے کی طرف نظر مار لوں۔ وہ راجو کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ راجو بے خبر سو رہا تھا مگر ایک لال گوٹے کنارے والا دوپٹہ اس کے اردگرد لپٹا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کی محبوبہ اس کے سینے پر دنیا سے بے خبر سو رہی ہو۔ عارف عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ وہ پھر سے اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر میں اذان ہونے والی ہے اب میں نماز پڑھ کر ہی لیٹوں گا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ سو گیا۔ صبح چڑیوں کے چہچہانے اور کوئل کی کوک کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح کا منظر خوب صورت لگ رہا تھا۔ چاروں طرف پرندوں کی آوازیں، گلاب چنبیلی موتیا کی بھینی بھینی خوشبو آس پاس سے پراٹھوں کی خوشبو سے اور بھوک محسوس ہونے لگے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اتنے میں راجو بھی اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

”ارے صاحب جی آپ اٹھ گئے۔“

”راجو تم نے کیا صاحب صاحب لگا رکھا ہے تم میرے ہم عمر ہو تم آج سے میرے دوست اور بھائی ہو۔“

بھائی راجو نے ایک سرد آہ بھری۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، آپ نہا دھو کر فارغ ہو جائیں، میں آپ کے لیے اچھا سا ناشتا بناتا ہوں۔“

”ارے یار باہر کسی ہوٹل پر چل کر ناشتا کرتے ہیں۔“

”نہیں نہیں بدمزہ ناشتا ملے گا۔“ اس نے برا سا منہ بنایا۔ ”میں خود بناؤں گا۔“

عارف فریش ہو کر آیا تو راجو ناشتا بنا رہا تھا۔ اس نے دیسی گھی سے پراٹھے اور آملیٹ تیار کیا اور پھر چائے بنائی۔

ناشتا بڑا مزے دار تھا۔ کچھ دیر بعد عارف نے راجو سے پوچھا۔ ”یہ گھر تمہارا ہے یا کسی اور کا۔“

”نہیں عارف یہ گھر میرا ہے میرے والد فوج میں تھے۔ اسی گاؤں کے رہنے والے اسی لیے انہوں نے یہاں مکان خرید کر نئے سرے سے بنوایا۔ میری والدہ صاحبہ کو باغبانی کا بڑا شوق تھا۔ ابو نے ان کا شوق پورا کرنے کے لیے اتنا بڑا گھر بنایا۔“ پھر وہ خیالوں میں کھو گیا۔

”مگر راجو کیا تمہارے امی ابو مر گئے؟“

”سب مر گئے، بھائی بہن بھی۔“

وہ غمگین سا ہو گیا۔ عارف نے اسے تسلی دی اور مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ بہت دکھی ہو گیا تھا۔ اس نے راجو سے کہا۔

”میں بچل سائیں کے پاس جا رہا ہوں، مجھے ان سے کچھ کام بھی ہے اور گاؤں کی سیر بھی کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اگر کہیں تو دوپہر کا کھانا بنا دوں۔“

”ارے نہیں مت بنانا، تم نے ناشتا ہی اتنا اچھا کرا دیا ہے۔ میں شام تک ہی آؤں گا۔“

شام تک وہ بچل سائیں کے ملازم کے ساتھ رہا۔ جب تھک گیا تو اس نے کہا۔ ”اب چلتا ہے۔“

”کہاں چلنا ہے صاحب؟“

”بچل سائیں کے گھر نہیں تم مجھے راجو کے گھر ہی لے چلو۔“ وہ راجو کے گھر گیا۔

راجو نے اپنے گھر کو صاف ستھرا کیا ہوا تھا۔ آنگن میں چھڑکاؤ کر رکھا تھا جس کی وجہ سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو دل اور دماغ کو اچھی لگ رہی تھی۔ راجو نے عارف کے لیے جلد ہی چارپائی بچھائی۔

”عارف بھائی چائے چلے گی۔“

”بالکل، میں بھی کہنے والا تھا۔“

راجو تھوڑی دیر میں چائے لے آیا۔ چائے کے ساتھ بسکٹ اور سموسے بھی۔“

”یار یہ تکلیف کیوں؟“

”ارے نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں۔“ دونوں نے مل کر چائے پی۔

”اچھا تھک چکے ہیں آپ..... آرام کریں۔ مغرب کے بعد کھانا میرے ساتھ نوش فرمائیے گا۔“

”ارے تم تو بڑی اچھی اردو بولتے ہو۔“

”جی ہاں میں نے بی اے کیا ہوا ہے اور میں اس کے علاوہ گاؤں کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوں۔“

”واہ بھئی گڈ۔“ عارف لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں نیند آ گئی۔ ویسے ہی وہ رات بھر بے چین رہا۔ بے خبر سو گیا مگر وقفہ وقفہ سے اسے وہی آواز آتی محسوس ہوتی رہی مگر وہ تھکن سے چور تھا۔ مغرب کی اذان سے پہلے راجو نے اسے اٹھایا۔

”نماز پڑھ لیجیے۔“

وہ دونوں مسجد سے نماز پڑھ کر واپس آئے۔ راجو نے کھانے کے لیے پوچھا۔ عارف نے کہا۔ لے آؤ۔ کھانا بڑا مزے دار تھا۔ چکن کا بھنا ہوا گوشت، وہی کا رائتہ، سلاد اور ہاتھ کی گرم گرم روٹی۔

”ارے کیا تم نے یہ سب کھانا خود بنایا ہے؟“

وہ مسکرایا۔ ”بالکل! اور تو کوئی اس گھر میں نہیں۔“

عارف نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ عارف سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا اور باہر واک کرنے چلے گئے۔ کافی ٹائم واک کرتے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے دوبارہ گھر آ گئے۔ عارف آنگن میں لیٹ کر کتاب پڑھنے لگا اور راجو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عارف نے اس سے کہا۔ ”تم باہر تازہ ہوا میں کیوں نہیں سوتے؟“

”مجھے اپنے کمرے میں ہی نیند آتی ہے۔“

عارف کافی رات تک کتاب پڑھتا رہا۔ اچانک پھر اسے ایسا لگا کہ اس کے پلنگ کے پاس کوئی لڑکی بیٹھی رو رہی ہے۔

”مجھے بچا لو، اس نے مجھے قیدی بنایا ہوا ہے۔ میری روح بے چین ہے۔ مجھے بچا لو۔“

وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔ کان لگا کر سننے لگا کہ یہ آواز کس طرف سے آرہی ہے۔ اسے محسوس ہوا جہاں پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی ہیں وہاں سے آوازیں آرہی ہیں۔

وہ اٹھ کر کیاریوں کی طرف گیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا مگر آواز تھوڑے تھوڑے وقفے سے محسوس ہورہی تھی۔ آخر وہ بھی کرائم رپورٹر تھا۔ اس نے بھی طے کرلیا وہ ضرور پتا لگا کر ہی رہے گا۔

وہ راجو کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر کمرے کا جائزہ لیا۔ راجو ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ لال چنری اس نے اوڑھ رکھی تھی، جیسے کوئی دلہن لال دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھی ہو۔ وہ کسی سے لڑ رہا تھا۔

''تو نے میرا سب کچھ برباد کردیا۔ بہن، بھائی، ماں، باپ میں تجھے کبھی آزاد نہیں کروں گا۔ تُو کتنی بھی معافی مانگ لے، میں ہرگز چھوڑنے والا نہیں۔ ویسے اب تو میری محبوبہ ہے۔ میں تجھ سے محبت کر بیٹھا ہوں۔ تجھے آزاد کر کے کیسے جی پاؤں گا۔''

عارف یہ منظر دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے راجو کو بے دھڑک آواز دے ڈالی۔ ''یار راجو، ر۔ و۔ جی۔''

''عارف صاحب کیا بات ہے۔'' وہ کمرے سے دوڑتا ہوا آیا۔

عارف نے اسے غور سے دیکھا۔ آنکھیں اس کی لال انگارے کی طرح ہورہی تھیں اور چہرہ لال بھبھوکا سا۔ تھوڑی دیر کے لیے عارف ڈر سا گیا مگر فوری سنبھل گیا۔

''ارے راجو یار! میں اکیلا پن محسوس کررہا تھا۔ نیند بھی نہیں آرہی ہے۔ میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں۔''

عارف نے راجو کی طرف دیکھا جو بیزاری سی محسوس کررہا تھا۔

وہ آکر بیٹھ گیا۔

''ارے راجو آج تو گرمی بہت ہے۔''

''ہاں مجھے بھی محسوس ہورہی ہے۔ ہوا بھی نہیں چل رہی۔''

''کچھ ٹھنڈا ہے تمہارے فریج میں؟''

''شاید کولڈ ڈرنک ہے۔''

''اگر نہیں ہے تو روح افزا بھی چلے گا مگر ہو ٹھنڈا ٹھار۔ چلو میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔''

وہ کچن میں گئے۔ فریج میں کولڈ ڈرنک بہت تھوڑی تھی۔ انہوں نے روح افزا نکالا اور بہت سا برف بھی۔ عارف نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ راجو واش روم کی طرف جارہا تھا۔ ''میں آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اسی وقت عارف کو ایک دم ترکیب سمجھ میں آئی اس نے سوچا میں اگر راجو کو نشے آور گولی شربت میں ملا کردے دوں تو شاید کچھ راز کا پتا چل جائے گا۔ اس نے دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور بیگ سے گولی نکالی اور ایک گلاس میں ملا دی۔ تھوڑی دیر میں راجو آگیا اور کہا۔ ''یار راجو لگتا ہے آج بارش ہونے والی ہے۔ کافی حبس ہورہا ہے۔ لو یہ شربت پی لو اور ہاں تم بھی یہیں لیٹ جاؤ پنکھا چل رہا ہے تو گرمی کم لگے گی۔''

''اچھا یار آج میں بھی یہیں لیٹ جاتا ہوں۔'' وہ کمرے سے چارپائی لے آیا۔

شاید راجو کو نشہ چڑھ چکا تھا۔ ''یار بارش ہورہی ہے یا نہیں۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے میں اور نازلی بارش میں نہا رہے ہیں۔''

''نازلی کون؟''

''وہ ڈائن بدروح جس نے میری بہن، امی، ابو کی جان لے لی۔''

''کیوں؟''

''یہ بہت بڑی داستان ہے۔ کیا کرو گے سن کر۔ سو جاؤ۔''

''نہیں راجو مجھے نیند نہیں آرہی۔ مجھے بتاؤ۔''

''میں نے بتایا تھا ناں میرے ابو فوجی تھے۔ انہوں نے ہمیں بڑی محنت سے پڑھایا۔ انہیں ارمان تھا میں بھی فوج میں جاؤں۔ ابو کبھی کہیں بھی نہیں ہوتے اس لیے امی نے کہا کہ ایک جگہ مکان بنالو تاکہ بچے ایک اسکول میں پڑھ سکیں۔ ابو نے یہ مکان لے لیا۔ یہ مکان کافی بڑا تھا مگر ٹوٹا پھوٹا تھا۔ ابو نے اس کو نئے سرے سے بنایا۔ میری امی نے اس کو پھولوں اور پھلوں سے سجایا۔ یعنی پھولوں اور پھلوں کے پودے لگائے اور ہر طرح سے اس گھر کو سجایا۔ چند دن بعد امی بیمار رہنے لگیں۔ چھوٹی بہن کو دورے پڑنے لگے۔ ابو پریشان ہوگئے۔ امی دن بدن کمزوری کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ بہن الگ بیمار۔ پھر اچانک بہن کو دورہ پڑا اور اس کی کیفیت عجیب سی ہوگئی۔ ہاتھ پیر مڑ گئے۔ گردن ڈھلک گئی اور ایک ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ ابو کی لاڈلی بیٹی ان سے جدا ہوگئی میری امی اس غم میں نیم پاگل ہوگئیں۔ نہ وہ روتی تھیں اور نہ وہ کسی سے بات کرتیں۔ بس ان پھولوں کی

کیاری کے پاس بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی۔ محلے کے چند بزرگوں نے بتایا کہ اس گھر میں آسیبی بلا ہے۔ پہلے بھی اسی وجہ سے لوگ بیچ کر چلے گئے ہیں۔ میرے ابو ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے مگر مجھے شک تھا اس لیے میں نے قریبی گاؤں کے ایک مولوی قطب سے رابطہ کیا۔ تمام حقیقت بیان کی۔ انہوں نے کہا۔ تم مجھے گھر لے چلو مگر اس کے لیے ابو کی اجازت ضروری تھی۔ بڑی مشکل سے ابو کو آمادہ کیا۔ مولانا صاحب گھر میں آئے انہوں نے گھر کے ہر کونے کا جائزہ لیا۔ وہ پھولوں کی کیاری کے پاس جا کر رک گئے اور زور زور سے اس جگہ کو سونگھنے لگے۔ میری امی ان کو دیکھ کر زور زور سے رونے لگیں۔ میری بیٹی ان پھولوں میں دفن ہے۔ اس کی مرقد یہاں ہے۔ وہ مجھے روز ملتی ہے۔ میری بیٹی پھولوں کی شہزادی ہے۔ میں نے امی کو خاموش کرنے کی کوشش کی مگر قطب صاحب نے اشارے سے منع کیا ان کو رونے دو اس جگہ ضرور ایسا کچھ ہے جو انہوں نے محسوس کیا اور کرتی ہیں یہ میرے بس کا نہیں یہاں ضرور گندی آتما ہے۔ میں ایک ہندو سادھو جی کا پتا تمہیں دیتا ہوں۔ وہ پیسے تو لے گا مگر اس کا کام صحیح ہوتا ہے۔ میں ابو سے پوچھ کر ان کے پاس گیا۔ انہوں نے تمام باتیں سننے کے بعد مجھ سے کہا۔ میں بدھ کو گھر میں جا کر پڑھائی کروں گا۔ پھر ہی معلوم ہوگا کیا ماجرا ہے۔ ویسے مجھے قطب صاحب پر بھروسا ہے۔ انہوں نے ٹھیک ہی کہا ہے تم یہ چیزیں مجھے بدھ والے دن لادو۔ میرے آنے سے پہلے یہ چیزیں گھر میں نہیں لے کر جانا۔ جب میں گھر آؤں تو مجھے دینا جب تک تم کہیں رکھ سکتے ہو۔ بارہ عدد دیسی انڈے، دس لیموں، لال تازہ ہری مرچ، لوبان، کوئلہ کا فور اور لال سندور بدھ والے دن میں صبح یہ چیزیں شہر سے لینے چلا گیا۔ بڑی مشکل سے سندور وغیرہ ملا۔ گھر کے راستے میں میرے دوست کی دکان تھی۔ وہاں چیزیں رکھ کر گھر آگیا۔ شام ہونے سے پہلے میں سادھو جی کو لینے چلا گیا۔ وہ میرے ساتھ آئے۔ انہوں نے تمام چیزیں مجھ سے لے لیں اور پڑھائی شروع کردی۔ ابھی وہ پڑھائی کررہے تھے۔ میری امی نے چیخنا شروع کردیا۔ میری بیٹی کو مت مارو۔ وہ مر جائے گی۔ یہ کہتے کہتے امی بے ہوش ہوگئیں اور وہ بھی دنیا سے چلی گئیں۔ ابو ابھی بیٹی کو نہیں بھول پائے تھے کہ یہ غم بھی مل گیا۔ ابو کو بھی چپ سی لگ گئی۔ میں اکیلا تھا مگر میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ضرور اپنے ابو چھوٹے بھائی اور گھر کو بچاؤں گا۔ میں نے یہ حالات دیکھتے ہوئے چھوٹے بھائی کو کراچی پھوپی کے گھر بھیج دیا تاکہ اسے کچھ نہ ہوجائے۔ سادھو جی نے بھی مجھ سے وعدہ کیا میں تمہارے گھر کو بچانے اور اس آتما کو قابو کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ بہرحال وہ اپنے ساتھ دو شاگردوں کو بھی لیتے آئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ یہ چلہ تین دن کا ہے میں اس کو قابو کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں۔ تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہے تم چاہو تو ابو کو بھی گھر سے دور بھیج دو۔ میں نے ابو کی بہت خوشامد کی مگر وہ نہ مانے چلہ شروع کیا گیا۔ پہلے دن ہی آتما سامنے آگئی۔ یہ سب جو تم لوگ کررہے ہو نقصان اٹھاؤ گے۔ اس کیاری کے بیچ میں میری لاش دفن ہے میں چاہتی ہوں یہ زمین کھود کر مجھے آزاد کردو۔ میں سکون میں تھی یہاں کی زمین کو مسمار کر کے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ سادھو نے کہا تو نے جس طرح انتقام لیا ہے تیری سزا اس سے بڑی ہے۔ ان کی والدہ اور بہن کا کیا قصور تھا۔ ان کو نہیں معلوم تھا تو یہاں ہے۔ انہوں نے تو گلاب اور چنبیلی موتیا کے پھول ہی لگائے تھے۔ کاٹنے تو نہیں بوئے تھے۔ ہم تجھے ایسے نہیں ایسے چھوڑیں گے۔ صبح فجر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں نے نماز پڑھی ابو کمرے سے باہر نہیں آئے تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں کمرے میں گیا تو یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی ابو کی لاش ٹھنڈی پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کافی اذیت سے گزرے ہیں۔ میری آواز پر محلے والے بھی جاگ گئے۔ سائیں بچل وغیرہ نے میرا ابو کا ساتھ دیا۔ میں نے ابو کو بھی کھو دیا۔ اب میرا مقصد صرف انتقام تھا۔ مجھے اس روح سے انتقام لینا تھا۔ میں نے سادھو جی سے کہا۔ میں صرف اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا جو میں کروں گا۔ ٹھیک میں تمہارا ساتھ دوں گا ہر طرح سے۔ تم مجھے ایک لاکھ دو گے۔ میں نے ہاں کردی مگر کچھ رقم ابھی، کچھ کام ہونے پر مگر میں یہ بتادوں اس میں جان کا خطرہ بھی ہے۔ مجھے اپنی جان کی اب پروا نہیں ہے۔ سب کچھ میرا ختم ہو چکا ہے۔ سادھو جی نے دوبارہ سے پڑھائی وغیرہ شروع کردی۔ دوسرے دن روح ہمارے سامنے تھی۔ میں دور بیٹھا تھا۔ سادھو جی نے مجھے اشارے سے بلایا بتایا۔ سامنے دیکھو وہ گلاب کے لال لال پھولوں کی طرف میں نے دیکھا ایک خوب صورت لڑکی جس نے لال ستاروں گوٹے والا لباس اور لال بڑا سا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے۔ وہ بہت ہی حسین لڑکی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں گم صم ہوگیا۔ سادھو جی نے اس سے پوچھا تم یہاں کس طرح آئیں۔ میں یہ اسی گھر میں رہتی تھی۔ کچھ عرصے پہلے سائیں بچل سے پہلے یہاں ایک ہندو دہڑا موہن جو کہ اپنے آپ کو

یہاں کا وڈیرہ کہتا تھا۔ وہ بہت عیاش اور ظالم تھا۔ وہ ہر لڑکی پر نظر رکھتا تھا۔ میرے ابو سیدھے سادھے آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے باہر جانے سے منع کیا تھا۔ وہڑا کی وجہ سے ابا جب کھیتوں پر چلے جاتے میں چپکے سے باہر نکل جاتی۔ وہڑا موہن نے مجھے دیکھا تو وہ میرا دیوانہ ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ میں اور لڑکیوں کی طرح ڈرپوک نہیں تھی۔ بہت منہ زوری کی عدت میری اس سے کافی دفعہ لڑائی ہوئی۔ ایک دفعہ تو میں نے اس کا پتھر مار کر سر پھوڑ دیا۔ اس نے اپنے آدمی میرے پیچھے لگا دیئے۔ میرے ابا کو خطرہ محسوس ہوا۔ انہوں نے مجھے شہر بھیجنے کا ارادہ کر لیا۔ میرا ماموں وہاں تھا۔ پتا نہیں وہڑا موہن کو کیسے پتا چل گیا۔ اس نے کھیتوں میں ہی میرے ابو کا خاتمہ کر دیا اور یہ افواہ پھیلا دی کہ ڈاکوؤں نے مار دیا ہے میری والدہ پہلے ہی دمہ کی مریض تھیں وہ چند دن سے بہت بیمار تھیں۔ میں ہی ان کا سہارا تھی۔ موقع پا کر وہڑا موہن ہمارے گھر میں کود گیا اور پوری رات میری عزت کی دھجیاں بکھیرتا رہا۔ میری ماں یہ منظر دیکھ کر موت کی آغوش میں چلی گئی۔ میں نے وہڑا سے کہا میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے ڈر کے مارے مجھ کو بے ہوشی کی دوا پلا کر زندہ دفن کر دیا اور اوپر سے جھاڑیاں اور کچرا ڈال دیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو میری ماں کو بھی اس طرح دفنا دیا۔ صبح ہونے سے پہلے گھر سے نکل گیا۔ سانس گھوٹنے کی وجہ سے میرا سانس رک گیا۔ میں جیتے جی مر چکی تھی مگر میری روح زندہ تھیں۔ اسی گھر میں پھر وہڑا نے گاؤں والوں سے کہا ماں بیٹی یہ گھر وہڑا کو بیچ کر شہر چلی گئی ہیں۔ وہڑا نے ان کے والد کو بیچ دیا۔ میں خوش تھی کوئی تو اچھا اس گھر میں بسا اللہ نے وہڑا موہن کو سزا دی اسے کینسر ہو گیا اور وہ کتے کی موت مر گیا۔ اس کے بچے لاہور میں رہتے ہیں مگر ان کی والدہ نے میرا سکون چھین لیا۔ میں سکون سے گڑھے میں سو رہی تھی۔ انہوں نے اس جگہ کو گوبر اور مٹی اور گلاب چنبیلی اور موتیا اور دیگر پودوں سے بھر دیا۔ میرا سانس لینا مشکل ہو گیا اور میری روح بے چین ہو گئی میں کیا کرتی۔ میں نے غصے میں یہ سب کیا ہے۔ سادھو نے مجھ سے پوچھا۔ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو اسے آزاد کرنا ہے تو تم پودے وہاں سے اکھاڑ پھینکو اور اس زمین کو دوبارہ سے صاف ستھرا کرنا ہے نہیں میں ہرگز یہ سب نہیں کروں گا مجھے اسے قید رکھنا ہے۔ سادھو جی نے کہا کل آخری چلہ کاٹنا ہے۔ اس تمہیں اسے حاصل کرنا اس طرح میں بتاتا ہوں۔ یہ جو لال دوپٹہ اڑتا ہے یہ دوپٹہ ہوا میں لہراتا ہے میں تمہیں ایک تعویذ دوں گا۔ وہ تمہیں نظر آئے گی، تم نہیں۔ اسے تم ان درختوں کے پیچھے چھپ جانا جیسے ہی وہ سامنے آئے وہ لہراتی ہوئی چنری کھینچ لینا بس وہ تمہارے قبضے میں ہو جائے گی۔ ساری عمر تمہاری غلام بن چکی جب تک تمہارے پاس اس کی چنری ہے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پھر میں تمہیں یہ مردے کی ہڈی ہے اور یہ انگوٹھی پہن کر رکھنا۔ تعویذ کبھی نہیں اتارنا یہ ہڈی اس جگہ رکھنا جہاں یہ چنری کو رکھنا وہ اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتی اگر جب تمہیں اس پر رحم آجائے تو اس چنری کو اسی مقام پر دفن کر دینا وہ آزاد ہو جائے گی مگر مجھے نازلی سے پیار ہو گیا ہے۔ وہ میرے وجود میں بس گئی ہے۔ وہ میرے گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ یہ کھانا بھی اس نے پکایا ہے۔ وہ ایک بیوی کی طرح میری خدمت کرتی ہے۔ وہ اس نے آنکھ دبا کر کہا سوی بھی میرے ساتھ ہے۔"

عارف کو تو پسینے آنے لگے۔ راجو بولتے بولتے چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ یعنی بے خبر سو گیا مگر ڈر کی وجہ سے میری نیند غائب تھی۔ میں صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا جیسے ہی صبح ہوئی میں نے یہاں سے نکلنا بہتر سمجھا مگر راجو اٹھ کر بیٹھ گیا وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے کوئی شک نہ ہو۔

"ارے یار تم اور میں تو خوب سوئے۔ یار میرے آفس سے فون آیا ہے۔ مجھے آج جانا ہے تم چائے ہی پلا دو۔ وہ چائے بنا کر لایا مگر وہ مجھے غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ شاید وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا فون نمبر آفس کا پتا دیا کہ تم کراچی بھائی کے پاس آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔ میں نے بہت اصرار کیا آنا ضرور اس نے بھائی کا پتا مجھے دیا کہ آپ میرے بھائی سے ضرور ملنا۔"

میں کراچی واپس آ گیا اس واقعے کو دس سال گزر چکے ہیں۔ میں بھول نہیں پایا۔ میں انتظار کرتا رہا شاید راجو جس کا نام راجہ سلطان تھا وہ مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے اس کے بھائی کے پاس گیا۔ بھائی جان سے مل کر خوش ہوا۔ جب میں نے راجو کا پوچھا تو وہ رنجیدہ ہو گیا۔

"ان کا انتقال ہو گیا۔" میں اچھل گیا۔

"کیسے؟"

"پتا نہیں۔"

میں نے سوچا ضرور اس سے کوئی ایسا کام ہوا کہ اس آتما نے اسے مار ڈالا وہ مکان خالی پڑا ہے سانپ بچھو نے اپنے جانور وہاں رکھے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

یہ ہماری ہے

عطیہ ہدایت اللہ

اُس پُراسرار مخلوق کی کہانی، جس کی سچائی اک گھر میں آج بھی بکھری پڑی ہے

ادریس خان، یعنی میرے شوہر ایک بہت اچھے اور اپنے پیشے کے لحاظ سے لائق ترین ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے باہر کی ہائیر ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں۔ لیکن میری مسلسل اور طویل بحث و مباحثہ کے باوجود بھی وہ اس بات پر تیار نہیں ہوئے کہ وہ گورنمنٹ سروس جائن کر لیں، وہ اپنے والد کی اس وصیت کو نہیں بھول سکے کہ اسے اپنے اس نسبتاً

بڑے سے اوراس پاس کے گاؤں، قصبوں اور دیہاتوں پر مشتمل دکھی، بیمار لوگوں کی خدمت کرتی ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی زمینوں پر ہی بڑا سا ہسپتال، لیبارٹری وغیرہ بنا لیے تھے۔

ان کے پاس امراض خواتین، بچوں کے ڈاکٹر اور سرجن بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے مجھے تین نہایت ہی خوبصورت، صحت مند اور لائق بچوں سے نوازا تھا۔ دو بڑوں کو میں نے کیڈٹ کالج میں ڈال دیا تھا، ایک وہیں کے مقامی انگلش میڈیم سکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے بیٹی کی خواہش دیوانگی کی حد تک تھی۔ بازاروں میں رنگ برنگے فراک، گڑیاں، چھوٹی چھوٹی چوڑیاں اور کلپس وغیرہ دیکھتی تو سوچتی بیٹی ہوتی تو یوں سنوراتی، یہ پہناتی، ایسے سجاتی۔ لیکن قدرت کے آگے کس کی چلتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں میں یہ بات تو تھی کہ عزت اور محبت سے پیش آتے، اپنے کھیتوں کی سوغاتیں بھیجتے نہ تھکتے، جو کا آٹا، مسالے دار اور مکھن لگا گڑ، دودھ، دہی، کھیتوں کی تروتازہ سبزی، میں اکثر چیزوں کو ہسپتال کے عملے میں بانٹ دیتی۔ اب تو اس بات کو بائیس سال گزر گئے۔

لیکن کیا ماضی بھی کوئی بھول سکتا ہے۔ ان دنوں میں چوتھی بار ماں بننے جا رہی تھی۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا لیکن مجھے پورے نو ماہ عجیب وغریب احساسات بلکہ واقعات سے گزرنا پڑا تھا، کبھی میں ڈر جاتی، کبھی الجھن میں پڑ جاتی اور کبھی اتفاقات سمجھ کر بھول جاتی۔ یہ بات تو ساری ماں بننے والی خواتین کو معلوم ہی ہوگی کہ حمل کے دوران بعض وقت اچھی بھلی چیز کھانے سے کراہیت سی ہونے لگتی ہے۔ اور بعض اشیاء جو عام حالت میں اتنی قابل توجہ نہیں بھی ہوتیں، انہیں کھانے کی ہوک بڑھ جاتی ہے۔ میری ساس کہا کرتی تھیں۔ حاملہ عورت کو کسی چیز کی چاہ ہو اور اسے مہیا نہ کی جائے تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ بچے کو نقصان پہنچتا ہے۔ میں اس فلسفے یا حقیقت سے فائدہ اٹھاتی۔

''اماں جی سالن نہیں کھانا۔ پتا نہیں کیوں، سرخ پکے ٹماٹروں کی چٹنی بہت سی سبز مرچوں کے ساتھ، دل چاہتا ہے۔ اماں جی سرخ پکے ہوئے آلو بخارے کھاؤں گی۔'' اور اس طرح کی اکٹی سیدھی فرمائشیں، پر اب تو اللہ جنت نصیب کرے ان کا مہربان سایہ تو چھین چکا ہے پر نہ جانے کیا بات تھی۔ کبھی سبزی، چکن کڑاہی، چپلی کباب یا چٹنی ہی کو دل چاہتا، وہی چیز کچن والا لڑکا بنا دیتا۔

''ارے بھئی نوشاد میں تو تمہیں یہی بنانے کو کہنے والی تھی۔ میں تھوڑا خوش تھوڑی سی حیرت زدہ ہو کر کہتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ جب ایسی چیز کی طلب ہوتی، جو گھر میں موجود نہ ہوتی تو کوئی مریض، جاننے والا یا ادریس کا کوئی دوست دروازہ کھٹکھٹا کر دے جاتا۔ میں سوچتی یہ دنیا میں آنے والا بچہ تو بڑا ہی درجوں والا ہے، جو میری چاہت ٹلتی ہی نہیں، ایک دن ادریس اپنے بچوں سے ملنے کیڈٹ کالج گئے تھے۔ واپسی پر بڑے رس بھرے لال، لال سیب اور دوسرا پھل لائے، سیب دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا دل چاہا، کاش اس کی جگہ کہیں سے آم آ جاتے، اپنی حماقت پر مجھے خود ہی ہنسی آ گئی۔ اکتوبر کا آخری ہفتہ اور آم کی خواہش، تھوڑی دیر بعد میں کچن میں آ گئی۔ ملازم سنک میں برتن دھو رہا تھا۔''

''نوشاد تم نے تو ڈنر کے لیے سبزی کاٹ دی۔''

''جی بی بی جی سب کچھ علیحدہ علیحدہ رکھ دیا۔ چکن بھی ابال دیا ہے۔ اور ہاں بی بی جی ڈاکٹر صاحب کا ایک بوڑھا مریض بنگلے پر آم دے گیا ہے۔ میں نے دھو کر فریج میں رکھ دیے ہیں۔''

''کیا؟'' میں حیرت زدہ سی چونک اٹھی۔

''آ.... آ.... آم!! یہاں اس موسم میں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ مجھے لہسن چھیل دو۔''

میں نے فوراً اپنی حیرت پر قابو پا لیا۔ فریج میں جھانکا۔ تو یہ موٹے موٹے، تروتازہ آم پڑے تھے۔ اس انہونی نے مجھے پہلی بار ڈسٹرب، بلکہ کچھ حد تک خوفزدہ سا کر دیا۔

''ادریس ... مجھے تو عجیب سے خیالات آ رہے ہیں بلکہ میں ڈرنے لگی ہوں، جب سے میں حمل سے ہوئی ہوں۔ جس چیز کو دل چاہے وہ اسی دن یا ایک دن بعد مل جاتی ہے۔ اب دیکھو اس موسم میں یہ پاگل دل آم کی خواہش کر بیٹھا اور آپ کا کوئی مریض شام کو یہ اس لیے آم دے گیا۔''

''وہی ہوگی ہوسندھ وغیرہ کے علاقے گرم ہیں وہاں سے کسی کے پاس آئے ہوں گے۔ اللہ کا شکر ادا

نہیں کرتیں۔ یہ جو آنے والا بچہ ہے یہ پہلے ہی سے اپنی ماں کی خاطر داری کر رہا ہے خوش بخت ہوگا ہمارے لیے۔'' ادریس نے اکتا کر بات ختم کر دی۔

☆.....☆

کچھ عرصہ بعد ہماری دعائیں عرش باری تعالیٰ میں سن لی گئیں۔ ہمارے گھر چاند سی صحت مند اور نہایت خوبصورت سی بیٹی نے جنم لیا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، بے حد گھنے سیاہ ہی بال۔ سفید بے داغ رنگ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرصت میں بنا ڈالی ہو۔ رشتہ داروں، اپنے پرایوں نے تحائف کے ڈھیر لگا دیئے۔ اس کی پیدائش گھر میں ہسپتال کی ڈاکٹر کے ہاتھوں ہوئی تھی، میں رات کو ہی اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ صبح میں بچی کو فیڈ کر کے بڑے سے کپڑے میں لپیٹ کر سلا آئی اور آہستہ آہستہ قدموں سے باہر آ کر برآمدے میں بیٹھ گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ساتھ پڑی میز پر سرخ، سبز پتیوں، پھولوں سے سجی بڑی سے ٹوکری پڑی تھی۔ میں نے قریب جا کر کاغذ، پنپاں ہٹائیں۔ تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنے خوبصورت چھوٹے چھوٹے فراک، کہ اس ایمبرائیڈری اور گل بوٹے میں نے کہیں دیکھے نہ سنے۔ پاؤں کے لیے چاندی کے چھنچھناتے جھانجھر، ہاتھوں کے منے منے گھنگرو نگے لگے کڑے۔ اسی کے ساتھ زنجیریں لگی سونے کی انگوٹھی۔ نرم گرم سے کمبل اور ایسی مٹھائی کے ڈبے جو میں نے زندگی میں نہ کھائی ہو۔

''نوشاد'' میں نے زور سے آواز لگائی۔

''یہ.... سب تحائف۔ کون لایا ہے۔''

''جی وہ آم لانے والا بابا اور اس کے ساتھ ایک خاتون تھی۔ اس نے نقاب پہنا تھا۔ عورت سے میں یہ چیزیں لینے لگا تو کہنے لگا تو کہنے لگی، بی بی جی مجھے پہچانتی ہیں میں خود اندر جا کر دے آؤں گی۔ اور بچی کی مبارک باد بھی دے آؤں گی۔ تو کیا وہ آپ سے نہیں ملی؟''

نوشاد نے حیرت زدہ سا مجھے اور پھر تحائف کو دیکھا۔

''اچھا تم جا کر مجھے ایک پیالی قہوہ بنا کر پلواؤ۔''

اسے ٹال کر میں بہت دیر تک چیزوں کو الٹتی پلٹتی رہ۔ جب میں بچی کو ہنگ پر ڈال کر ڈھانپنے کی تیاری کر رہی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے قریب کوئی کھڑا ہے مجھے بار، بار یہ احساس ہوتا تھا۔ حسب معمول ادریس نے اس بات کو قابل توجہ نہ جانا۔ میری ماں بہت بیمار تھیں۔ انہوں نے ملازم اور اس کی بیوی کے ہاتھ، بچی کے لیے چھوٹا سا کاٹ (پلنگ) پرام۔ جھولا اور بہت کچھ بھیج دیا تھا۔ میں نے سجے سجائے کاٹ میں بچی کو لٹا دیا۔ دن کے وقت جھولے میں پڑی جھولتی رہتی۔ ایک دن رات کو بچی کے رونے کی آواز سے میں چونک کر اٹھی۔ اس کے کاٹ کے پاس ایک عورت کھلے بال.... سیاہ جوڑے میں ملبوس بچی پر جھکی اسے تھپتھپا رہی تھی۔ ننھی بچی ہاتھ کا لمس پا کر خاموش ہوگئی۔ ڈر کے مارے میری گھگھی بندگئی۔ نہ میری آواز نکلے نہ حرکت کر سکتی تھی۔ زیرو والٹ کے بلب کی روشنی میں خاتون نے سر اٹھایا۔ اف..... میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ وہ انسانی شکل تو ہرگز لگ نہیں رہی تھی۔ عجیب وغریب پھر مجھے جاگتا دیکھ کر وہ سایہ یا انسان پلک جھپکتے غائب ہوگیا۔ میں نے جھپٹ کر بچی کو اٹھایا اور اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ صبح میں نے ادریس کو بتایا تو وہ اخبار پڑھتے پڑھتے ہنس پڑا۔

''ڈیلیوری کے بعد تمہارے اعصاب اور وجود کمزور پڑ چکے ہیں۔ اکثر خواتین کو یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ آرام کرو، حلوے، چیجیری اور چکنائی کی جگہ سبزیوں، چکن سوپ اور پھل کھانے کو ترجیح دو۔ تم نارمل ہو جاؤ گی تو یہ سارے واہمے، وسوسے بھی ختم ہو جائیں گے۔''

☆.....☆

ہمارا چوکیدار اچانک گاؤں میں فوتگی کی وجہ سے جانے لگا تو دو تین دن کے لیے اپنی دس سالہ بیٹی کو میرے پاس چھوڑ گیا۔ وہ ویسے بھی آ کر بچی کے چھوٹے موٹے کام کر جاتی، پالنے میں پڑی بچی کو جھلاتی رہتی۔ رات کو میں اسے علیحدہ کمرے میں سلانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اس لیے ادریس کی اجازت سے اسے اپنے بیڈروم میں بچی کے پلنگ کے ساتھ نیچے قالین پر لٹا دیا۔

دوسرے دن وہ آدھی رات کو کانپتی، سسکتی اٹھ بیٹھی۔

''بی بی جی، بی بی جی۔''

''ارے نگینہ بیٹی کیا بات ہے کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے۔'' ادریس بھی سائیڈ پر رکھے لیمپ کو جلا کر اٹھ بیٹھے۔

''بی بی جی کسی کا پاؤں میرے پاؤں پر پڑا میں جاگ گئی تو ایک عورت تھی۔ بال کھلے کالے کپڑے اس نے

دونوں پاؤں سے کھینچ کر مجھے کونے میں ڈال دیا اور خود چھوٹی کے پلنگ پر جھک گئی۔ بی بی جی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' نگینہ رونے لگی۔

''لاحول ولا.....'' ادریس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''یک نہ شد..دو شد۔تم کیا کم تھیں جواب ان محترمہ کو بھی ڈر لگنے لگا ہے۔کیا ہو گیا ہے تم خواتین کو۔''

میں نے نگینہ کو اپنے پلنگ کے ساتھ نیچے کر کے لٹایا۔ آیت الکرسی، چاروں قل پڑھ کر پھونکے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلاتی رہی۔ تب وہ دوبارہ آرام کی نیند سوئی۔ دوسری رات کو نگینہ ڈرتی، جھجکتی پلنگڑی کے پاس آ کر سوئی۔ آدھی رات کو وہ چیخنے چلانے اور رونے لگی۔

''بی بی جی.....منی کے پلنگ کے پاس وہ کل والی عورت پھر کھڑی اسے تھپتھپا رہی تھی۔ میری آنکھ کھلی۔ تو اس نے مجھے تھپڑ بھی مارا۔'' ادریس بھی جاگ گیا۔ وہ اپنا تکیہ اٹھا کر مارے غصہ کے ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔

''ہونہہ سارا دن مریضوں کے ساتھ چخ چخ اور راتوں کو جنوں بھوتوں کے قصے۔کیا مصیبت ہے۔''

میں نے دوبارہ نگینہ کو نزدیک لٹایا۔

☆.....☆

کچن میں نوشاد کی مدد کے لیے میں نے ایک بارہ تیرہ سالہ مقامی لڑکا رکھا تھا۔ جو صفائی وغیرہ کرتا۔ سروس کرتا اور گیٹ بھی کھولتا بند کرتا۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ میری بچی حوریہ دو سال کی ہو گئی تھی۔ باہر صحن میں چٹائی بچھا کر اس کے کھلونے سامنے رکھے اور چھوٹے سے کہا کہ اس کا خیال رکھے کہیں گیٹ تک نہ چلی جائے۔ میں اندر اپنے غسل خانے میں نماز کی تیاری کرنے چلی گئی۔ میں واش بیسن میں کہنیوں تک ہاتھ دھو رہی تھی۔ کہ باتھ روم کی کھڑکی سے بالکل واضح اور غصہ میں بھری ہوئی کسی شخص کی تیز آواز سنائی دی۔

''وضو بعد میں کرنا۔ جاؤ اپنی بیٹی کو بچا لو.....جاؤ.....جاؤ۔''

میں چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''تم نے سنا نہیں۔ بھاگو.....ورنہ مار ڈالیں گے لڑکی کو۔''

اب تو میں کانپی اور ننگے پاؤں صحن کی طرف بھاگی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میں چند سیکنڈ تک ساکت کھڑی رہ گئی۔

چھوٹے نے بچی کو لٹا کر اپنے صحت مند پاؤں اس کے پیٹ پر رکھے تھے اور اس کی نیپی کا سیفٹی پن جو ایک کنڈے سے آٹومیٹک لاک ہو جاتا تھا۔ اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ روتی تو تھپڑوں کی بارش کر دیتا۔

''یہ کیا کر رہے ہو کمبخت۔''

میں اچانک ہوش میں آ گئی۔ میرے زور دار دھکے سے وہ گھاس پر لڑھک گیا۔ میں نے سسکتی بچی کو گلے لگایا۔ یا اللہ تیرا شکر یا اللہ تیرا شکر۔ میں اسے چومتی جاتی اور شکر ادا کرتی جاتی۔ چھوٹے نے اپنی پیٹھ سہلاتے اٹھنے کی کوشش کی۔ تو وہ لڑھکنیاں کھاتا دور جا گرا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا تو کوئی اسے پٹخ دیتا۔ اب تو وہ ڈر کے مارے چیخ چیخ کر رونے لگا۔

''میری توبہ بی بی جی۔ بس کریں۔ مجھے نہ ماریں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ قسم لے لیں میں نے کچھ نہیں کیا۔''

میں حیران پریشان اسے پٹتا دیکھتی رہی۔

''لیکن میں نے کیا کیا، میں تو تم سے دور کھڑی ہوں اور دونوں ہاتھوں سے بچی کو پکڑا ہوا ہے۔''

''بس کرو.....مت مارو..... ہائے اماں مار دیا میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کی نیپی گیلی تھی اسے اتار رہا تھا۔''

وہ تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا تھا۔ میں نے ہوش میں آ کر بچی کو نیچے گھاس پر بٹھایا۔ نوشاد بھی پہنچ چکا تھا۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ بلکہ اب تو مجھے چھوٹے کی جان بچانے کی فکر لگ گئی تھی۔ میں نے سوچا اسے تو کوئی جان سے مار رہا ہے۔ ہمارے اوپر الزام آئے گا۔ میں نے بھاگ کر اسے اٹھایا اور لاؤنج میں دھکیل کر لے گئی۔

''تمہیں کون مار رہا تھا۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے نرم آواز میں پوچھا۔ بڈھا بابا اور ایک خوفناک شکل والی عورت۔ آپ کے سامنے ہی تو مجھے مار رہے تھے۔ آپ نزدیک آئیں تو غائب۔''

اپنے خون آلود ماتھے اور ہونٹوں سے رستے خون کو بوندیں قمیض کے دامن سے صاف کرتے ہوئے وہ بولا۔

''مگر.....مگر.....میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔''

''سامنے ہی تو کھڑے مار رہے تھے۔ کیوں نہیں دیکھا۔''

روتے، روتے اس نے چیخ کر کہا۔ وہ دیکھیں۔ وہ پھر میری طرف آ رہے ہیں، مجھے بچائیں۔ میں نے کوئی

غلطی نہیں کی۔''

وہ میرے پیچھے بھاگ کر آ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے کھینچ کر لاؤنج سے باہر نکال دیا۔

''جاؤ بھاگو مسجد میں مولوی صاحب کے پاس بیٹھ جاؤ۔ پھر یہاں مت آنا۔'' سخت ٹینشن کی وجہ سے میری سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ نہ جانے مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی۔

''آپ لوگ آخر کون ہیں۔ ہمیں مسلسل ڈرا رہے ہیں۔ ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ پھر میری آنکھوں سے بے بسی کے آنسو بہنے لگے اور میں سر جھکا کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میری سانسیں جیسے رکنے لگیں۔ سامنے کارنس کے پاس ایک سیاہ پوش بابا ہاتھ میں تسبیح لیے کھڑا تھا۔

''بیٹی تم ناراض نہ ہونا اور ڈرو بھی مت۔ میں تمہارے باپ کی طرح ہوں۔ ہمارا اس دنیا سے تعلق ہے۔ ہزاروں سال سے یہی رہتے آئے ہیں لیکن بس ہم تمہاری طرح انسان نہیں ہیں۔ تم نے اگر اپنی آسمانی کتاب قرآن شریف فرقان حمید ترجمے سے پڑھی ہو۔ تو اللہ پاک نے ہماری مخلوق کا ذکر کیا ہے۔ ہم کسی کو تنگ نہیں کرتے۔ جب تک ہمیں نہ چھیڑا جائے۔''

''پر.....آپ.....م.....میری بیٹی کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔'' میں نے اکھڑ کر بات کی۔

''ہم اس زمین پر برسوں سے آباد ہیں۔ آپ نے یہاں گھر بنایا، اسے بسایا، بیٹے ہوئے، یہاں ہندو، سکھ اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے، ہماری برادری میں بھی ہر مذہب کے لوگ تھے۔ پھر اچانک ہنگامے پھوٹ پڑے۔ ہندو سکھ سب کہیں چلے گئے۔ ہماری برادری میں کچھ ہندو رہ گئے۔ وہ مسلمانوں کو اکثر تنگ کرتے اور شرارتیں کرتے ہیں۔ ہم انہیں روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے بہت سے لوگ ہنگاموں میں پاؤں تلے روندے گئے۔ کچھ کرپانوں، تلواروں اور چاقوؤں کی زد میں آ گئے۔ میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ ہمارے گھر چاندی پوتی آئی ہم سب کی جان اس میں اٹکی رہتی۔ پھر آپ کے صحن میں گھاس میں سے خودرو جڑی بوٹیاں تلف کرنے کے لیے بڑی زہریلی دوائی کا اسپرے ہو رہا تھا۔ میری پوتی یہاں تتلیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ اسپرے بالکل اسکے چہرے پر کیا گیا۔ اس کی سانسیں اکھڑ گئیں اور وہ مر گئی۔ یہ سال پہلے کی بات ہے جب تمہارے ہاں بیٹی پیدا ہونے لگی تو میری پوتی نے ماں کے خواب میں آ کر کہا۔

''ماں میں اسی گھر میں جنم لینے والی ہوں۔ اس بچی کا بہت خیال رکھیں بیٹی۔ یہ تمہارے اور تمہارے شوہر کی بچی ہے لیکن اس میں ہماری پوتی کی شبیہہ شامل ہے۔ اس کی خوشبو اس کے بدن میں رچی ہوئی ہے۔ ہم آپ کو تنگ نہیں کرتے پر اس کو دیکھنے آتے ہیں اور آج ہمیں بہت برا لگا۔ وہ لڑکا اپنی طرف سے اس کا جانگیہ بدل رہا تھا۔ لیکن اس کی بے پردگی ہم سے برداشت نہ ہوئی۔''

ادریس داخلی دروازے پر کھانسے۔ وہ کھانا کھانے اندر آ رہے تھے۔ پلک جھپکتے بابا غائب ہو گئے۔ ان کی تسبیح بھی ان کے ہاتھ سے گر گئی۔ جس کے دانوں سے عجیب قسم کی روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے فوراً اسے اٹھا کر الماری میں ڈال دیا۔

میری بیٹی اب شادی شدہ ہے۔ اس بات کو کوئی بیس اکیس سال گزر چکے اسے کسی نے ٹوکا نہیں ڈرایا۔ بس وہ کہتی ہے اماں، عید پر۔ شب برات پر آپ بہت پہلے ڈھیروں چیزیں بھیج دیتی ہیں۔ کیوں اتنا خرچہ کرتی ہیں۔ ابھی بھائیوں کی بھی شادی کرنی ہے۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ لیکن دل دہک سا رہ جاتا ہے۔

''اچھا ہمارے ملازم کو چائے پانی کا پوچھتی ہو کہ صرف چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہو۔''

''ارے امی کیا میں ہسپتال کے چوکیداروں کو ویسے ہی چھوڑ دوں گی۔ سب کی قدر کرتی ہوں۔ پر ایک بات کی الجھن سی رہتی ہے جب بھی کچھ کھانے کو دل چاہے وہ چیز امتیاز یا ان کے دوست تحفتاً دے جاتے ہیں۔ اور اور کبھی کبھی نہ جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سایہ سا میرے قریب رہتا ہو پھر غائب ہو جاتا ہے۔'' میری بیٹی سوچ میں پڑ گئی۔

اچھا بہنو یہ بات ہے۔ میں تمہیں حقیقت نہیں بتا سکتی اور میں ادریس کو بھی نہیں بتا سکتی کہ تمہارے چوکیداروں کے روپ میں کون حوریہ کو تحفے دے جاتا ہے یہ راز تو میرے ساتھ ہی چلا جائے گا۔

☆☆☆

ایک ڈاکٹر کی موت

شیخ معظم الٰہی

ایک ڈاکٹر کے ساتھ پیش آنے والا وہ دل خراش واقعہ جس نے اسے ایک بدروح کا ذریعۂ حیات بنا دیا تھا

وہ پوری قوت کے ساتھ بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ چیخ و پکار اور پکڑو جانے نہ پائے کی بے ہنگم آوازیں اب بھی اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کے ننگے پاؤں نوکیلے پتھروں اور کانٹوں میں الجھ کر بری طرح زخمی ہو گئے تھے اور ان سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں لیکن وہ ہر دکھ اور تکلیف سے بے نیاز بھاگتا جا رہا تھا۔ اچانک وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا اور اس کے سامنے کے دانتوں نے ایک تیز چھری کی طرح اس کے ہونٹوں کو کاٹ ڈالا اب اس کے منہ سے بھی خون بہنے لگا تھا لیکن اس نے اس کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور اس کے بھاگنے کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اچانک ایک تیز نسوانی چیخ اس کے کانوں سے ٹکرائی گویا کہ اب وہ اس کی گرفت میں آنے والا ہے تو اس کی رفتار میں اور بھی شدت آ گئی۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی اور دل کی دھڑکنوں کے ہتھوڑے اس کے دماغ پر برس رہے تھے۔ چیخ و پکار کی آوازیں دور ہوتی گئیں اور پھر مدھم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئیں۔

اب وہ ان کی پہنچ سے باہر تھا اور وہ جلد سے جلد اپنے ہوٹل واپس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ چند روز پہلے جو راستہ چند لمحوں میں طے ہوتا تھا وہ آج اتنا طویل کیسے ہو گیا تھا۔ وہ دو گھنٹے سے بھاگ رہا تھا لیکن راستہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ غالباً دس میل کا سفر طے کر چکا تھا لیکن وہ جگہ تو شہر سے صرف تین میل کے فاصلے پر تھی۔ پھر یہ سفر اتنا طویل کیسے ہو گیا۔ کچھ بھی ہو وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہاں سے زندہ واپس آ جائے گا۔ یقیناً اس کا اپنی جان بچا کر اس سنگین قید خانے سے بھاگ کر آنا ایک معجزے سے کسی طرح کم نہ تھا۔

آخر وہ نصیب ہوٹل آ پہنچا۔ وہ ہوٹل تک اسی رفتار سے بھاگتا آیا تھا۔ ہوٹل کے دروازے میں بھی وہ بھاگتا ہوا داخل ہوا اور ہال کے اندر سے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کے نزدیک ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ دھونکنی کی طرح اس کی سانس چل رہی تھی اور دل اُچھل کر گویا اس کی پسلیوں کو چھو کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہوٹل کا منیجر شوکت اور تمام ملازمین اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئے اور بھاگ کر اس کے قریب پہنچے۔ سب لوگ ایک دائرے کی صورت میں اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ہوٹل کے منیجر نے فوراً آگے بڑھ کر اسے سنبھالا دیا۔ پہلی نظر میں اسے وہ قطعی نہ پہچان سکا۔ چہرے پر بے شمار جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ، سر کے بال گرد و غبار اور جنگلی گھاس پھونس کے تنکوں سے اٹے ہوئے

تھے۔ پتلون اور قمیص کانٹوں سے الجھ الجھ کر تار تار ہو گئی تھی۔ یہ ڈاکٹر اظہار تھا۔ جو گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے نصیب ہوٹل کے کمرہ نمبر 66 میں مقیم تھا۔ منیجر شوکت کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ یہ وہی ڈاکٹر اظہار ہے جو ایک معزز مہمان کی حیثیت سے اس کے ہوٹل میں مقیم تھا۔ ڈاکٹر اظہار بے حد وجیہہ اور خوب صورت جوان تھا۔ اس کے چہرے پر خون کی سرخی اس کی قابل رشک صحت کی دلیل تھی اور اس کے ہر وقت مسکراتے ہونٹ اور گفتگو کرتی ہوئی آنکھوں نے اسے پورے ہوٹل کے علاوہ شہر کے معزز خاندانوں میں بے حد مقبول بنا دیا تھا لیکن اب اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا گویا کسی ظالم نے اس کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا ہو۔ اب اس ہنستے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر خوف محسوس ہو رہا تھا۔

منیجر شوکت نے سہارا دے کر ڈاکٹر اظہار کو اٹھایا پھر چند ملازمین کی مدد سے اسے کمرے تک پہنچا دیا۔ اسے بیڈ پر لٹا کر کہا کہ ”یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

ڈاکٹر اظہار نے پھولی ہوئی سانس لے کر کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوا۔ مجھ سے کچھ مت پوچھو۔“

منیجر نے کہا۔ ”آپ کو فوری طور پر ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر اظہار نے الجھی ہوئی بے ربط سی آواز کے ساتھ کہا۔ ”ہاں! فوراً کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اور ڈاکٹر کے آنے تک مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

سب لوگ کمرے سے باہر چلے گئے۔ منیجر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ آپ فکر نہ کریں اور کچھ دیر آرام کریں۔ میں ابھی شہر کے کسی اچھے اور قابل ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔“ اور پھر وہ بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔

منیجر کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر اظہار نے اٹھ کر اپنے کمرے کو اندر سے لاک کر لیا۔ وہ تیزی کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھا اور اسے بھی بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ جلدی جلدی دروازے اور کھڑکی کے پردے گرا دیئے۔ کمرے

میں ہلکا سا اندھیرا چھا گیا۔ اس نے بڑھ کر خود کو صوفے پر گرا دیا اور اپنے دل کی تیز دھڑکنوں کو دبانے کے لیے دونوں ہاتھوں کو اپنی چھاتی پر کس لیا۔

پندرہ منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔ اب اس کے دل کی دھڑکن کچھ نارمل ہوگئی تھی اور آنکھوں میں خوف اور دہشت کے آثار بھی تقریباً ختم ہوگئے تھے۔ وہ اب خود کو بالکل محفوظ محسوس کررہا تھا۔ ہلکے اندھیرے میں اب اس کی آنکھیں ہر چیز کو اچھی طرح دیکھ رہی تھیں۔ اس کا سامان اسی ترتیب سے پڑا تھا جس طرح وہ چند روز پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ البتہ اس کی غیر موجودگی میں کمرے کی صفائی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے ہر چیز پر ہلکا ہلکا گرد و غبار پڑا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر ایک میلے سے کپڑے سے اپنے صوفے کے بازوؤں پر سے گرد و غبار صاف کی اور پھر سامنے میز پر رکھے ہوئے آئینے کو اٹھا کر صاف کیا پھر اس میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گردی تہوں کے پیچھے ایک چہرہ نظر آیا جو تقریباً کسی بوڑھے اور کمزور شخص کا تھا۔ اس نے گھبرا کر رومال سے آئینے کی گرد کو صاف کیا۔ اس دفعہ اپنا چہرہ دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور بولا کہ ''اُف! اللہ یہ کون تھا؟ یہ تو میں ہرگز نہیں تھا۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا کہ میں نہیں اللہ پاک کی قسم یہ میں نہیں ہوسکتا۔ یہ میں نہیں ہوسکتا۔ آئینے میں نظر آنے والی صورت ایک ستر سالہ بوڑھے کی تھی جس کے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں اور آنکھیں گہرائیوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ آئینے میں نظر آنے والی صورت کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کرسکا۔ پھر اس کی نظریں سامنے دیوار کی طرف اٹھ گئیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر لگے ہوئے قد آور آئینے میں اسے ایک سراپا نظر آیا۔ وہ ہرگز ایک زندہ انسان کا سراپا نہیں تھا۔ وہ ایک چلتی پھرتی لاش کا عکس تھا جو آئینے میں نظر آرہا تھا۔ عکس کو دیکھ کر اس نے نظریں نہیں پھیریں بلکہ وہ بغور اسے دیکھنے لگا۔

ایک فلم کی طرح اس کے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات ابھرنے لگے۔ آئینے کے اندر وہ چلتی پھرتی لاش دھندلا گئی اور پھر اس میں سے ایک خوب صورت وجیہہ اور صحت مند شخصیت ابھری یہ ڈاکٹر اظہار تھا۔

آج سے تین ماہ قبل ڈاکٹر اظہار اس شہر میں آیا تھا اور ایک پرسکون سی جگہ پر اس نے اپنا کلینک کھولا تھا۔ رہائش کے لیے اس نے نصیب ہوٹل کو چنا تھا۔ کیونکہ وہ شہر سے ہٹ کر الگ تھلگ ایک طرف واقع تھا۔ وہ شروع سے ہی ہنگاموں اور شور سے گھبراتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنا کلینک اور رہائش شہر کے ہنگاموں سے دور ہی رکھی تھی۔ دراصل اس نے اپنی پریکٹس اسی شہر میں تجرباتی طور پر شروع کی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس کی پریکٹس چل نکلی تو کوئی خوب صورت سا بنگلہ خرید کر وہاں قیام پذیر ہو جائے گا۔ ورنہ کسی دوسرے شہر میں قسمت آزمائی کرے گا۔ ویسے بھی اس کا پیشہ اس قدر معزز تھا کہ اسے ہر مقام پر کامیابی نصیب ہوسکتی تھی لیکن اس شہر میں اس کے لیے جو جاذبیت تھی وہ یہ تھی کہ پورے شہر میں اس جیسا ڈاکٹر نہ تھا جس کے پاس ایم ڈی کی اعلیٰ ڈگری نہ ہو۔ اسے یقین تھا کہ دیگر تمام ڈاکٹروں کے مقابلے میں وہ زیادہ کامیاب رہے گا۔

امید کے مطابق اسے بے حد کامیابی حاصل ہوئی۔ صرف ایک ماہ کے بعد ہی اس کا کلینک مریضوں سے بھر گیا۔ صبح سے شام تک اسے ایک لمحے کے لیے بھی فرصت نہیں ملتی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے مریضوں میں اکثریت عورتوں کی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ڈاکٹر اظہار کی شخصیت میں نوجوان اور خوب صورت عورتوں کے لیے کشش تھی۔ کئی دوشیزائیں محض بیماری کا بہانہ بنا کر اس کے کلینک میں بلا ناغہ آتی تھیں لیکن ڈاکٹر اظہار نے اپنی جاذب نظر شخصیت سے کبھی بھی کوئی غلط مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈاکٹری جیسے معزز پیشے میں ایک معمولی سی بدنامی کس قدر نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اعتماد ہی اس پیشے کی کامیابی کی ضمانت تھا۔

دو ماہ کی شاندار کامیابی کے بعد اس نے ہمیشہ کے لیے وہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا اور چند ایک پراپرٹی ڈیلروں سے اس نے کوئی پرسکون اور خوب صورت بنگلہ اپنے لیے تلاش کرنے کے لیے کہا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باعث وہ ابھی تک پراپرٹی ڈیلروں کے تلاش کیے ہوئے بنگلوں میں سے ابھی تک نہ دیکھ سکا۔ اپنے کلینک سے فارغ ہوکر وہ تھکاوٹ سے چُور اپنے ہوٹل

کے کمرے میں پہنچ کر جب اپنے نرم اور آرام دہ بستر پر لیٹتا تو اسے بالکل گھر کا سا سکون حاصل ہوتا۔

اس کی عمر اب 35 سال سے تجاوز کررہی تھی اور وہ ابھی تک کنوارہ تھا۔ شادی کے نام سے اسے چڑ نہ تھی البتہ ابھی تک اس کی نظروں میں کوئی لڑکی جچی ہی نہ تھی جو اس کی رفیق حیات بننے کی وہ تمام صلاحیتیں رکھتی ہو جو وہ چاہتا تھا۔ اس شہر کی حسین و جمیل اور دولت مند گھرانوں کی لڑکیاں اسے اپنانے کے لیے آمادہ تھیں لیکن وہ ہر لڑکی کو نظر انداز کر جاتا۔ ویسے بھی وہ اکثر سوچتا تھا کہ شادی کے بغیر آزادی میں بھی اپنا لطف ہے۔ ایک آزاد اور بے پرواہ پرندے کی مانند جس طرف چاہے پرواز کرسکتا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اور پھر ایک دن عجیب اتفاق ہوا کہ وہ رات گئے اپنے مریضوں سے فارغ ہوکر اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک خاتون سفید چادر میں لپٹی لپٹائی نہایت تیزی کے ساتھ اس کے کلینک میں داخل ہوئی۔ اس کا سارا جسم چادر میں چھپا ہوا تھا۔ صرف دو آنکھیں اس سے باہر تھیں۔ اس نے آتے ہی نہایت التجا بھری آواز میں کہا کہ ''خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب! جلدی چلیے میری مالکہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔''

ڈاکٹر اظہار نے جواب دیا کہ ''میں تو کلینک بند کررہا ہوں۔''

عورت نے کہا۔ ''آپ نہ گئے تو میری مالکہ یقیناً مر جائے گی۔ خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب.....!''

ڈاکٹر اظہار نے اس سے ذرا سختی سے کہا کہ ''میں آپ سے کہہ چکا ہوں محترمہ کہ اب میں بالکل تھک چکا ہوں، اس لیے کہیں نہیں جاسکتا۔''

اس خاتون نے کہا کہ ''آپ کیسے ڈاکٹر ہیں کہ آپ کو کسی کی زندگی کا کوئی احساس نہیں۔'' پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ ''آپ فکر نہ کریں آپ کو معقول فیس دی جائے گی اور پھر زیادہ دور بھی نہیں جانا۔''

ڈاکٹر اظہار نے جواب دیا کہ ''آخر شہر میں اور بھی تو بہت سے ڈاکٹر ہیں ان میں سے کسی کو لے جائیں۔''

اپنے اصول کے خلاف ڈاکٹر اظہار کیوں اتنی بے رخی اختیار کررہا تھا۔ اسے اس خاتون سے نہ جانے کیوں الجھن سی ہو رہی تھی۔ وہ ابھی کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ خاتون فوراً اس کے قدموں کی طرف جھکتے ہوئے بولی کہ ''میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں میری مالکہ کی جان بچا لیجیے۔ انہوں نے خاص طور پر صرف آپ کو ہی یاد فرمایا ہے۔''

اس خاتون کی اس حرکت سے ڈاکٹر اظہار نے بڑی شرمندگی محسوس کی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کسی خاتون کے ساتھ سخت رویہ ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا اور پھر اس کا پیشہ ہی ایسا تھا کہ رات کے کسی حصے میں بھی کسی مریض کو دیکھنے کے لیے اسے بلایا جاسکتا تھا۔ ''اچھا ٹھہریئے! میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر اظہار نے اپنے ملازم کو دوائیوں کا بیگ تیار کرنے کا حکم دیا اور خود اس نے فوراً اپنا سفید گاؤن پہن لیا جو تھوڑی دیر قبل اس نے اتار کر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا تھا۔ ملازم نے بیگ لا کر اسے دیا تو وہ سفید چادر میں لپٹی ہوئی خاتون کے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل پڑا۔ کلینک کے دروازے کے پاس دو سفید گھوڑوں والی ایک بگھی تیار کھڑی تھی۔ بگھی کی سیٹیں پردے اور چھت۔ سب ہی سفید کپڑے کے تھے اور اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا کوچوان بھی سفید وردی میں ملبوس تھا۔

ڈاکٹر اظہار سیٹ پر بیٹھ گیا اور سفید پوش خاتون اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ان کے بیٹھتے ہی کوچوان نے اپنا چابک ہوا میں لہرایا اور گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ شہر سے باہر نکل کر ڈاکٹر اظہار نے محسوس کیا کہ بگھی کی رفتار انتہائی تیز ہے اور وہ غالباً ہوا میں پرواز کررہی تھی۔ خاتون بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی بگھی کے اندر ایک عجیب ناگوار سا سکوت طاری تھا۔ ڈاکٹر اظہار خود کو بادلوں میں اڑتا ہوا محسوس کررہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اچانک بگھی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ اس کے سامنے ایک پرانی اور ویران قلعہ نما غار تھا۔ غار کے اردگرد سوائے کھنڈرات کے کچھ نہ تھا۔ دور دور تک انسانی آبادی کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا۔ چاروں طرف ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اظہار کو اپنے جسم کے اندر خوف کی ایک سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اتنے ویرانے اور ایسے کھنڈرات میں کوئی کیسے رہ سکتا ہے؟ وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ خاتون بگھی سے اتری

اور ڈاکٹر اظہار کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا وہ ایک انجانی کشش کے زیر اثر خاتون کے پیچھے چلنے لگا۔ کئی ایک ٹوٹے ہوئے برآمدوں کو عبور کر کے وہ سیڑھیاں چڑھتے گئے۔ اوپر پہنچ کر خاتون نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہ ایک وسیع و عریض، ہال نما کمرہ تھا۔ ڈاکٹر اظہار کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہال نما کمرہ انتہائی قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصاویر، ایک طرف لمبی سی کھانے والی میز جس کے گرد سنہری رنگ کی قیمتی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

ہال کے وسط میں ایک قیمتی قالین بچھا تھا۔ چھت کے ساتھ بڑے بڑے فانوس لٹک رہے تھے جن میں شمعیں روشن تھیں۔ ایسے کھنڈرات میں اتنا خوب صورت کمرہ دیکھ کر کچھ حیرت ہوئی۔ اس کی محویت کا عالم اس وقت ٹوٹا جب اس کے کانوں سے اس سفید پوش خاتون کی آواز ٹکرائی۔ ''میری مالکہ! اپنے سونے والے کمرے میں آپ کی منتظر ہیں۔'' اور میں فوراً خاتون کے اشارے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک کشادہ اور انتہائی خوب صورت مسہری پر ایک عورت دراز تھی۔ اس کا پورا جسم ایک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی جس میں ڈاکٹر اظہار کو اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

''آپ آ گئے ڈاکٹر صاحب؟'' چادر سے ایک لرزتی آواز سنائی دی۔ ''آپ نے آ کر بہت اچھا کیا۔ آپ نہ آتے تو میں مر گئی ہوتی۔'' پھر ایک ہاتھ چادر سے باہر نکلا۔ وہ انتہائی بھدا اور مکروہ ہاتھ تھا۔ سیاہ رنگ جلد پر بے شمار جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ہرگز جاندار انسان کا ہاتھ نہیں تھا۔ وہ تو شاید کسی ایسے انسان کا ہاتھ تھا جو عرصہ پہلے مر چکا ہو۔ ڈاکٹر اظہار خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پیچھے سے اسی خاتون کی آواز آئی جو اسے اپنے ساتھ لائی تھی۔ ''میری مالکہ کا معائنہ کیجیے ڈاکٹر صاحب۔''

ڈاکٹر اظہار ذرا ہمت کر کے پھر مسہری کے قریب پہنچا اس وقت مریضہ نے کروٹ لی اور چادر کا پلو اپنے چہرے سے ہٹا دیا۔

ڈاکٹر کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ ایک نوے سالہ مکروہ صورت بڑھیا تھی۔ چہرے کی تمام ہڈیاں نظر آ رہی تھیں اور آنکھیں گہرائیوں میں گم ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر اظہار نے اتنی بھیانک شکل آج تک نہ دیکھی تھی۔

''میں مر رہی ہوں ڈاکٹر صاحب! مجھے مرتے وقت بہت اذیت محسوس ہو رہی ہے۔ میری اس تکلیف کو دور کر دو ڈاکٹر۔'' اس وقت اس مریضہ کے منہ سے الفاظ جیسے پھسل پھسل کر باہر آ رہے تھے۔

ڈاکٹر اظہار نے جلدی سے اپنے بیگ سے گولیاں نکالیں اور آگے بڑھ کر میز پر رکھے ہوئے جگ میں سے پانی کا ایک گلاس بھرا اور مریضہ کے منہ میں پہلے گولیاں ڈالیں پھر پانی کا گلاس ڈال دیا۔ گولیاں کھلانے کے بعد ڈاکٹر اظہار نے ساتھ لانے والی خاتون سے مخاطب کر کے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ ان کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اب دنیا کی کوئی دوائی انہیں زندگی نہیں دے سکتی۔ میں نے دوا کھلا دی ہے۔ جس سے مرتے وقت انہیں وہ شدید تکلیف نہ ہو گی جس میں وہ اب تک مبتلا تھیں۔

مریضہ کی آواز آئی کہ ''ڈاکٹر صاحب! آپ کی دوائی کھانے سے میری تکلیف کم ہو گئی ہے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ مجھے اپنا ہاتھ دیں تاکہ اظہار تشکر کے طور پر میں اسے بوسا دے سکوں۔'' پھر اس کے دو بوڑھے اور مکروہ ہاتھ چادر سے باہر آئے۔ ڈاکٹر اظہار ہرگز اپنا ہاتھ ان مردہ ہاتھوں میں نہیں دینا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں قریب المرگ بڑھیا کی خواہش کو رد نہ کر سکا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔ بڑھیا نے لپک کر وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ڈاکٹر اظہار نے محسوس کیا کہ ''اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑھیا میں ایک انجانی سی قوت آ گئی ہے اور اس کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر اظہار کا ہاتھ اپنے منہ کے قریب لے جا کر اسے بھرپور بوسا دیا اور ہاتھ کو چھوڑ دیا۔

بڑھیا بولی کہ ''ڈاکٹر! آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آج رات آپ یہیں قیام کریں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری موت سے پہلے ہی آپ چلے جائیں۔''

ڈاکٹر اظہار کسی قیمت پر بھی اس دہشت ناک ماحول میں رات گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ مریضہ کو چھوڑ کر کمرے

سے باہر آ گیا اور ہال کمرے سے ہو کر جونہی دروازے کی طرف بڑھا تو اسے ساتھ لانے والی خاتون نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا اور کہا کہ ''آپ میری مالکہ کی خواہش کو ٹھکرا کر یہاں سے نہیں جا سکتے۔ اب آپ کو آج رات یہاں ٹھہرنا ہو گا۔''

''لیکن..... میں..... میں..... اس جگہ.....'' ڈاکٹر اظہار ہکلانے لگا۔

خاتون نے کہا کہ ''آپ کو اس کی معقول فیس ادا کی جائے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے مٹھی بھر سکے ڈاکٹر اظہار کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

ڈاکٹر اظہار نے سکوں کو دیکھا تو مارے حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ خالص سونے کے سکے تھے جو غالباً بہت پرانے دور سے تعلق رکھتے تھے۔ اتنے میں اس خاتون کی آواز آئی کہ ''آیئے! ڈاکٹر صاحب! آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔'' اس خاتون نے ابھی تک اپنے چہرے سے چادر نہیں ہٹائی تھی وہ ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک روح معلوم ہوتی تھی۔

ڈاکٹر اظہار وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ پراسرار لوگوں میں گھر چکا ہے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن ہال کمرے میں سے باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا۔ وہ چپ چاپ ایک پراسرار قوت کے تحت اس خاتون کے پیچھے چلنے لگا۔ اسے چھوٹے سے خوب صورت بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا جس میں ہر چیز دو صدی پرانے دور سے تعلق رکھتی تھی جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا تو دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اس نے ذرا ہی دروازے کو کھولنا چاہا تو اسے علم ہوا کہ باہر سے تالا لگا دیا گیا ہے۔ گویا وہ اب اس کمرے میں قید ہو گیا تھا۔ اس نے دروازے کو زور سے پیٹا، شور مچایا اور باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کی آواز پر کان نہ دھرا۔

رات بھر اس ہولناک ماحول میں اسے ایک پل کے لیے بھی نیند نہ آ سکی۔ اسے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر جلن کا احساس ہوا اور پھر وہ جلن بڑھتے بڑھتے کافی تکلیف دہ ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی دہکتا ہوا انگارہ اس کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا گیا ہو۔ پھر صبح ہوئی تو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی تکلیف بھی ختم ہو گئی۔ ہاتھ کی پشت پر سرخ رنگ کا ننھا سا دھبہ تھا۔ کمرے میں ملحقہ غسل خانے میں اس نے جونہی ہاتھ پر پانی ڈالا تو وہ دھبہ فوراً ہی ختم ہو گیا۔

چار و ناچار اس نے غسل کیا اور کمرے میں ایک آرام دہ کرسی پر دراز ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنے جسم میں بے حد کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ غالباً رات بھر جاگنے سے اس کا جسم کا ہر بند دکھ رہا تھا۔

دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی پھر کسی نے تالا کھولا اور ایک ٹرے اندر کی طرف سرکائی گئی۔ ڈاکٹر اظہار نے قیدیوں کی طرح اٹھ کر ٹرے پکڑ لی۔ ٹرے پر ایک بڑی سی پلیٹ میں بھنا ہوا گوشت اور دو روٹیاں، ایک پیالے میں شوربہ تھا۔ گویا یہ اس کے لیے ناشتا تھا۔ اس نے شوربے کا ایک چمچ پیا تو اسے بے حد اچھا لگا۔ اس نے اٹھا کر سارا پیالہ منہ سے لگا لیا اور سارا شوربہ پی لیا۔ بھنے ہوئے گوشت کی ایک بوٹی کھائی۔ اتنا نفیس اور ذائقہ دار گوشت اس نے آج تک نہ چکھا ہو گا۔ وہ ہر خوف سے بے نیاز کھاتا گیا حتیٰ کہ پوری پلیٹ صاف کر گیا۔

وہ اب مریضہ کی موت کی خبر سننے کا منتظر تھا۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا وہی خاتون موجود تھی جو اسے ساتھ لائی تھی۔ اس نے کہا کہ آپ کو میری مالکہ نے یاد کیا ہے۔

''کیا!'' ڈاکٹر یک دم چونک گیا۔

''وہ میرا مطلب ہے.....!'' خاتون نے کہا کہ ''وہ زندہ ہیں۔''

ڈاکٹر اظہار تیزی سے چلتا ہوا مریضہ کے کمرے میں آیا۔ اسے کسی طرح بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

بڑھیا ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی ہوئی شوربہ پینے میں مصروف تھی۔ اس کے چہرے پر اب تازگی تھی۔ اس بڑھیا نے ڈاکٹر اظہار سے کہا کہ ''آپ کی دوا نے بہت اچھا اثر کیا۔ اگر آپ کا علاج جاری رہا تو میں پوری طرح صحت یاب ہو جاؤں گی۔''

ڈاکٹر اظہار سوچ رہا تھا کہ اس بڑھیا کو کافی مقدار میں خواب آور گولیاں دی تھیں تاکہ وہ اطمینان سے مر سکے لیکن یہ بڑھیا تو زندہ ہے۔

بڑھیا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جب تک میں مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو جاؤں آپ اس وقت

تک میرے مہمان رہیں گے۔ میں آپ کو اس کے بدلے میں اتنی بھاری فیس دوں گی کہ آپ عمر بھر اتنی دولت نہ کما سکیں گے۔ اب آپ میرے قریب آئیں تاکہ میں شکریہ کے طور پر آپ کے ہاتھ کو بوسا دے سکوں۔

ڈاکٹر اظہار کو اچانک رات بھر اپنے ہاتھ کی پشت پر جلن کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا کہ کہیں یہ پراسرار بڑھیا کے چوسنے ہی کا اثر تو نہیں تھا۔ وہ قدرے ہچکچایا تو پیچھے سے اس خاتون کی آواز آئی کہ ”میری مالکہ کی خواہش کا احترام ضروری ہے ڈاکٹر۔“

نہ جانے اس کفن پوش خاتون کی آواز میں کیا طلسم تھا کہ وہ فوراً بڑھیا کے بستر کے قریب پہنچ گیا۔ بڑھیا نے نہایت اشتیاق اور بے صبری کے ساتھ ڈاکٹر اظہار کا ہاتھ تھاما اور اس کی پشت پر اپنے ہونٹ جما دیئے۔ ایک طویل بوسے کے بعد جب اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ چھوڑا تو نیند سے ڈاکٹر کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ اس نے پھر بڑھیا کو کوئی ایسی دوا دینی چاہی جو اس کی مورت کا پیغام ثابت ہو مگر اس کے پیچھے کھڑی ہوئی کفن پوش خاتون بولی۔ ”دوا بدلنے کی ضرورت نہیں۔ میری مالکہ کو وہی دوا دیجیے جو رات کو دی گئی تھی تھی۔“ ڈاکٹر اظہار کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ کفن پوش خاتون نے آگے بڑھ کر خواب آور گولیوں کی شیشی اٹھائی اور چند گولیاں نکال کر بڑھیا کے منہ میں ڈال کر پانی پلا دیا۔ پھر ڈاکٹر اظہار سے کہا کہ ”اب آپ کو میری مالکہ کی خواہش کے مطابق اس وقت تک یہاں رہنا ہوگا جب تک وہ بالکل طور پر صحت یاب نہ ہو جائے۔“

ڈاکٹر اظہار نے کہا کہ ”گویا یہ میرے لیے حکم ہے؟“

خاتون نے جواب دیا کہ ”ہاں! آپ کو یہ حکم ماننا ہی پڑے گا۔“ اور سخت لہجے میں کہا کہ ”آپ ہماری مرضی کے خلاف کہیں نہیں جا سکتے جب تک میری مالکہ صحت یاب نہیں ہو جاتی۔ آپ ہمارے یہاں رہنے پر مجبور ہوں گے۔“

اس کے بعد ڈاکٹر اظہار کی بھی کوئی بات نہیں سنی گئی اور ایک غیر مرئی قوت نے اسے دھکیل کر اس کے کمرے تک لے گئی۔ دروازے کو بند کر کے پھر سے باہر کا تالا لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر اظہار کمرے میں چیخ و پکار کرتا رہا لیکن بے سود۔ اسے پھر اپنے ہاتھ کی پشت پر جلن محسوس ہوئی اور جلن بڑھتی جاتی تھی۔ وہ اپنے اندر ایک کمزوری محسوس کرتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ جلن بہت بڑھ گئی تو اس نے اپنے بیگ سے اسپرٹ نکال کر ہاتھ کی پشت پر لگایا تو شدت تکلیف سے ایک چیخ اس کے حلق سے نکل گئی۔ اس کا ہاتھ یقیناً زخمی تھا۔ اس خبیث بڑھیا نے اس کا ہاتھ چومنے کے بہانے اپنے دانت اس کے ہاتھ کی جلد میں چبھو دیئے تھے۔ وہ تکلیف سے بے دم ہو کر بستر پر دھم سے گر پڑا اور کروٹیں بدلنے لگا۔ رات گئے تک اس کی یہی حالت رہی۔ پھر نہ جانے اسے کب نیند آ گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئیں اور وہی شوربہ اور بھنا ہوا گوشت اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنی کمزوری دور کرنے کے لیے شوربے کا پیالہ پیا اور گوشت کی پلیٹ کو صاف کر دیا۔ وہ حیران تھا کہ اپنی مجبوریوں اور تکلیفوں کو بھول کر وہ کیوں ایک بھوکے گدھ کی طرح شوربے اور گوشت پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

رات کے دوسرے پہر اسے پھر مالکہ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ یہ دیکھ کر اچھل پڑا کہ وہ پراسرار بڑھیا کسی طرح بھی بوڑھی نظر نہ آئی بلکہ اس کے جسم پر گوشت اور رگوں میں خون دوڑ رہا تھا۔ چہرے کی جھریاں بہت کم ہو گئی تھیں اور آنکھیں گہرائیوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ بڑھیا نے ایک بار پھر ڈاکٹر اظہار کا ہاتھ چومنے کی خواہش کی مگر ڈاکٹر اپنا ہاتھ اب ہرگز اس کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ پیچھے کی طرف ہٹا تو سفید پوش خاتون نے اس کے کندھوں سے پکڑ لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ خاتون کے دونوں ہاتھ دھکیلتے ہوئے بڑھیا کے ہاتھوں کے قریب سے آئے اور بڑھیا نے اپنے ہونٹ بڑی بے صبری کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاتھ کی پشت پر جما دیئے۔ ہونٹوں کے مس ہوتے ہی ڈاکٹر پر ایک غشی سی طاری ہو گئی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کا خون کسی دوسرے جسم میں منتقل ہو رہا ہے۔ اس پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی اور وہ لڑکھڑا کر وہیں گر پڑا۔

پھر ہر رات یہی عمل دہرایا جانے لگا۔ اس کھیل میں فرق یہ تھا کہ ڈاکٹر اظہار کو بڑھیا کے کمرے میں جانے کی زحمت نہیں دی جاتی تھی بلکہ رات کو سونے سے پہلے

شوربے کے پیالے میں بے ہوشی کی دوا اسے پلا دی جاتی اور رات کے درمیانی حصے میں وہ بدروح بڑھیا اس کے کمرے میں آ کر اس کے ہاتھ کی پشت کا ایک طویل بوسہ لے جاتی۔ صبح جب ڈاکٹر اظہار اٹھتا تو اسے اپنے ہاتھ کی پشت پر جلن محسوس ہوتی اور ایک سرخ رنگ کا چھوٹا سا دھبہ اسے اپنے ہاتھ پر نظر آتا۔

وہ ہر صبح اپنے اندر پہلے کی نسبت زیادہ کمزوری محسوس کرتا اور پھر ایک روز اس نے اپنا دوائیوں کا بیگ کھولا تو ایک ننھا سا آئینہ نکالا۔ اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو ایک فلک شگاف چیخ اس کے منہ سے نکل کر کمرے میں گونج گئی۔ وہ خود کو پہچان نہ سکا۔ وہ کسی طرح بھی اسی نوے سال سے کم عمر کا نہ لگتا تھا۔ چہرے پر بے شمار جھریاں، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور گڑھے پڑے ہوئے اسے اپنی ہی صورت سے خوف آنے لگا۔ وہ اٹھ کر زور سے دروازے کو ٹکریں مارنے لگا اور پوری قوت سے چلایا کہ مجھے جانے دو۔ اچانک دروازہ کھلا۔ ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، چہرے کے نقوش تیکھے، بڑی بڑی سحر انگیز آنکھیں اور چاند کی طرح چمکتا ہوا جسم۔ ڈاکٹر اظہار نے آج تک اتنی خوب صورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر انتہائی محویت کے عالم میں اسے تکنے لگا۔

اس دوشیزہ نے ڈاکٹر اظہار سے دلربائی سے کہا کہ ”مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟“

ڈاکٹر اظہار کوئی جواب نہ دے سکا۔ بلکہ اس کے خوب صورت چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ بلکہ اس نے کہا کہ ”کون ہو تم؟“

اس دوشیزہ نے ایک مترنم قہقہہ لگایا اور کہا کہ ”یہ تمہیں آج شام کو معلوم ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ شام کو اسے بڑھیا کے کمرے میں لے جایا گیا۔ آج اس نے جو کچھ بڑھیا کی مسہری پر دیکھا تو اسے حیرت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ بستر پر بڑھیا کی جگہ وہی حسین و جمیل دوشیزہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس دوشیزہ نے ڈاکٹر کا خیر مقدم کیا اور اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

ڈاکٹر اظہار ایک مقناطیسی طاقت کے ذریعے کھنچتا ہوا اس کے بستر کے نزدیک پہنچ گیا۔

حسین دوشیزہ نے مسکرا کر کہا کہ ”میں تمہاری شکر گزار ہوں ڈاکٹر کہ تم نے مجھے ایک نئی زندگی دی اور میرے صدیوں پرانے جسم میں ایک نئی روح داخل کی۔ میں آج اپنی صحت یابی پر تمہیں بہت بڑا انعام دینا چاہتی ہوں۔“

ڈاکٹر نے ذرا تلخی سے کہا کہ ”مجھے کسی انعام کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف واپس جانے کی اجازت دی جائے۔“

دوشیزہ نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا کہ ”تم چلے گئے تو میرے جسم کی تروتازگی کیسے قائم رہے گی اور پھر ذرا سختی سے بولی کہ“ واپس جانے کا خیال دل سے نکال دو اور میرا ذریعہ حیات بنے رہو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا کہ ”کیسا ذریعہ حیات؟“

دوشیزہ نے کہا کہ ”غور سے سنو! میں آج کی عورت نہیں ہوں بلکہ صدیوں پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں نے تمہیں اپنی نئی زندگی کا ذریعہ چنا ہے۔ میں نے اپنے جسم کے لیے حسن، نوجوانی اور یہ تروتازگی تمہارے جسم سے حاصل کی ہے۔ جب تک تمہارے جسم میں روح اور خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔ تمہارے جسم کی پوری زندگی میں اپنے اندر منتقل کر لوں گی اور پھر میں کم از کم ایک صدی اور جوان رہوں گی۔ تم چلے گئے تو میں یہ خوراک کہاں سے حاصل کروں گی۔“

ڈاکٹر اظہار گم سم اس کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ ایک ماہر ڈاکٹر تھا لیکن یہ تجربہ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ پریشان ہو کر بولا کہ ”اس کے لیے تم کسی اور کا بھی انتخاب کر سکتی ہو۔“

دوشیزہ نے جواب دیا کہ ”نہیں اس کے لیے صرف ایک ہی ذریعہ حیات تلاش کیا جاتا ہے اور اسے آخری دم تک اس سے نئی روح حاصل کرنی ہوتی ہے۔ اب تم جاؤ اور ننھے منے انسانی بچوں کے نرم اور لذیذ گوشت کی بھنی ہوئی بوٹیاں کھاتے رہو اور ان کی ہڈیوں سے تیار کیا ہوا شوربہ پی کر اپنے جسم کی قوت بحال رکھو تاکہ تمہارے ذریعے خوراک حاصل کر کے میں بھی جوان رہوں۔“

ڈاکٹر اظہار یہ جان کر کہ وہ رات کو انسانی بچوں کا بھنا

ہوا گوشت کھا تا رہا ہے اور ان کی ہڈیوں کا تیار کیا شوربہ پیتا رہا ہے یہ سوچ کر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ رات بھر بے ہوش پڑا رہا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا کہ میز پر بھنے ہوئے گوشت اور شوربے کا پیالہ پڑا ہوا ہے۔ اسے فوراً ننھے منے پھول سے بچوں کا خیال آیا جنہیں یہ ظالم مار کر اسے کھلاتے رہے۔ اس نے پلیٹ اور پیالہ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اسے اس خیال سے ہی متلی ہونے لگی اور پھر غسل خانے میں جا کر اس نے قے کر دی۔ اب وہ یہاں سے ہر قیمت پر فرار ہونا چاہتا تھا لیکن اتنی سخت قید سے وہ کیسے فرار ہوتا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ دن بھر اسی کشمکش کا شکار رہا۔ اس نے فرار ہونے کے بے شمار منصوبے بنائے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ رات ہو گئی تو وہ کمرے کی کھڑکی کی سلاخوں پر زور آزمائی کرنے لگا لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا کہ اپنے ناتواں اور کمزور ہاتھوں سے کیسے ایک موٹی سلاخ اکھاڑ سکے گا۔

آدھی رات کے وقت ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ اس نے اٹھ کر ایک کھڑکی کھولی اور اس کی موٹی موٹی سلاخیں پکڑ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ آسمان پر چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ چاند کی گولائی دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ وہ چودھویں رات کا چاند ہے۔ باہر کھنڈرات میں ایک عجیب و غریب منظر دکھائی دیا۔ بہت سی عورتیں اور مرد ایک دائرے کی صورت میں محوِ رقص تھے۔ ان کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں جو اسے زیادہ بلندی سے صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ چاند کی روشنی میں اسے مرد و عورتوں کی شکلیں بہت بھیانک نظر آ رہی تھیں۔ ان کے منہ بالکل ایک گول تربوز کی مانند تھے اور پورے دانت باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ وہ بلاشبہ بدروحیں تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایک خوف کی لہر اس کے بدن میں پھیل گئی۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی بند کر دی۔ انتہائی بے چارگی کے عالم میں اس نے خود کو بستر پر گرا دیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے اٹھ کر کمرے کی دیواروں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

اسے یقین تھا کہ دروازہ باہر سے بند ہو گا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کے ذرا سے دھکیلنے سے دروازہ کھل گیا۔ غالباً اس کی کمزوری کے باعث کسی نے دروازے کو پھر سے تالا لگانے کی پروا نہیں کی تھی۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ انتہائی کمزوری کے باعث اس کی کمر و ٹانگیں لرز رہی تھیں لیکن اس کے مضبوط ارادے کی وجہ سے اس میں ایک نئی قوت آ گئی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا ہال کمرے تک پہنچا۔ وہ حیران تھا کہ سب کے سب کہاں غائب ہو گئے۔ ہال کمرے سے گزر کر جونہی اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو اسے آواز آئی کہ اپنے کمرے میں واپس چلے جاؤ۔ تم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اظہار کے پاؤں وہیں جم گئے۔ یہ آواز ایک کرسی سے آئی تھی جس پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پشت ڈاکٹر کی طرف تھی۔ وہ کرسی کے قریب جانے لگا تو اسے آواز آئی کہ میرے قریب نہ آنا کیونکہ تم میرا یہ روپ نہیں دیکھ سکتے۔ ڈاکٹر نے آواز کو پہچان لیا۔ وہ آواز اسی پراسرار خبیث بڑھیا کی تھی جس نے حسین و جمیل دوشیزہ کا روپ اختیار کیا تھا۔

ڈاکٹر اظہار نے ہمت کر کے کہا کہ ”میں نے تمہیں ہر روپ میں دیکھ لیا ہے۔ میرے لیے اب تمہارا کوئی روپ نیا نہیں ہے۔“

بڑھیا نے جواب دیا۔ ”تو پھر مجھے دیکھو۔“ یہ کہہ کر وہ یکدم کرسی سے اٹھی اور اپنا چہرہ ڈاکٹر کی طرف کر دیا۔ ڈاکٹر کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور وہ خوف زدہ ہو کر لہراتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ اس حسین و جمیل دوشیزہ کا چہرہ تبدیل ہو کر ایک بے حد خوفناک شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس کا چہرہ ایک بڑے فٹ بال کی طرح بن گیا تھا جو شاید کسی پتھر کا بنا ہو۔ اس کے دانت اس کے جبڑے سے باہر نکلے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ ہر چودھویں کی رات مجھے اصلی حالت میں آنا پڑتا ہے صرف ایک رات کے لیے۔ یہ ہمارا صدیوں پرانا روپ ہے۔ آج کی رات ہماری صدیوں پرانی روحیں ایک بار پھر ہمارے جسم میں واپس آ گئی ہیں۔ کل کا سورج ہمیں پھر وہی جوان خوب صورتی بخشے گا جو ہم تم جیسے انسان سے حاصل کرتے ہیں۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر ڈاکٹر اظہار کی طرف بڑھی تو ڈاکٹر نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہیں۔ جیسے وہ ٹانگیں گوشت پوست کی نہیں بلکہ کاغذ اور مٹی کی بنی ہیں۔ ڈاکٹر نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کرسی اٹھا کر اس کے سر پر [illegible] بڑھیا لڑکھڑا کر نیچے گر پڑی اور ایک

بھیانک چیخ اس نے نکالی جو سارے ہال میں گونج گئی۔ ڈاکٹر اظہار نے وقت ضائع کیے بغیر ہال کمرے کا دروازہ کھولا اور سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا نیچے کھنڈرات پر پہنچا۔

”اسے پکڑ لو..... اسے پکڑ لو..... یہ میرا ذریعہ حیات ہے۔ جانے نہ پائے۔“ بدروح بڑھیا اوپر کھڑکی سے چیخ رہی تھی۔ ڈاکٹر کھنڈرات کے اوپر سے پھلانگتا ہوا باہر صحن میں آ نکلا جہاں مرد و عورتیں محوِ رقص تھے۔ وہ سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے اس نے دیکھا کہ وہ سب بھی اسی شکل کے تھے جیسے وہ اوپر بدروح بڑھیا کو چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ان کے آگے بھاگ رہا تھا اور وہ سب اس کے تعاقب میں تھے۔ آخر وہ اس قطعہ نما غار سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے بہت تیز بھاگنا شروع کر دیا۔ جانے کہاں سے اس کی کمزور ٹانگوں میں اتنی قوت آ گئی تھی کہ وہ مسلسل دو گھنٹے تک بھاگتا رہا اور آخر اپنے ہوٹل کی سیڑھیوں کے قریب آ کر گر پڑا۔

☆.....☆

ٹھک ٹھک کوئی اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ یکدم چونک گیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا تو دستک دینے کی پھر آواز آئی۔ کسی نے اس کا نام لے کر اسے پکارا۔ ڈاکٹر اظہار نے اس آواز کو پہچان لیا یہ ہوٹل کے منیجر شوکت کی آواز تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہوٹل کا منیجر کھڑا تھا۔ منیجر نے کہا کہ ”میں بڑی دیر سے دروازے پر دستک دے رہا تھا آپ شاید آرام فرما رہے تھے۔ البتہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر دیا تھا۔ وہ تشریف لے آئے ہیں۔“

ڈاکٹر اظہار نے کہا کہ ”ٹھیک ہے۔ انہیں اندر بلا لو۔“

منیجر شوکت پیچھے مڑا اور بولا۔ ”تشریف لے آئیے ڈاکٹر صاحب۔“ اور ایک ڈاکٹر جس نے اوور کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر ہیٹ رکھے اور ہاتھ میں دوائیوں کا بیگ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اس کے اوور کوٹ کے کالر کھڑے ہوئے تھے جس سے اس کا آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ دوائیوں کا بیگ میز پر رکھ کر اس نے ہیٹ کو ذرا سا اوپر اٹھا کر ڈاکٹر اظہار کی طرف دیکھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ڈاکٹر منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی پھر دھم سے بستر پر گرتے ہوئے چلایا کہ ”نہیں یہ ڈاکٹر نہیں ہے۔ یہ تو وہی خبیث بڑھیا ہے۔ مجھے اس سے بچاؤ۔ خدا کے لیے مجھے اس سے بچاؤ۔“

آنے والے ڈاکٹر نے کہا کہ ”پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ ان کا علاج میں انہیں اپنے کلینک میں لے جا کر کر سکتا ہوں۔ کیونکہ ان کا ذہن کسی وجہ سے بالکل مفلوج ہو چکا ہے۔“

ڈاکٹر اظہار نے کہا کہ ”نہیں نہیں میں اس شخص کے ہمراہ ہرگز نہ جاؤں گا۔ یہ وہی خبیث بڑھیا ہے۔“

اس پر آنے والے ڈاکٹر نے کہا کہ ”میں گاڑی ساتھ لایا ہوں۔ بہتر ہے کہ مریض کو اس میں ڈال دیا جائے تاکہ انہیں میں اپنے کلینک لے جاؤں۔“

منیجر نے فوراً چند ویٹروں کو بلایا جنہوں نے ڈاکٹر اظہار کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گاڑی میں ڈال دیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ڈاکٹر اظہار کی چیخ و پکار دیر تک فضا میں گونجتی رہی۔ پاگل پن کا واقعہ بہت شدید تھا۔ منیجر شوکت نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا لیکن وہ ابھی آ کر اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔ منیجر نے آنے والے کو اندر بلا لیا۔ آنے والے نے پوچھا کہ ”آپ میں اس ہوٹل کے منیجر کون ہے؟“

منیجر شوکت نے نظر اٹھا کر دیکھا اس کے سامنے دوائیوں کا بیگ تھامے ایک شخص کھڑا تھا۔ منیجر شوکت نے جواب دیا کہ ”جی ہاں! میں ہی ہوٹل کا منیجر ہوں فرمائیے؟“

آنے والے شخص نے جواب دیا کہ آپ نے تھوڑی دیر پہلے ایک بے حد ضروری مریض کے لیے مجھے فون کیا تھا۔“

منیجر شوکت نے جواب دیا کہ ”ہاں! میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا۔“

آنے والا شخص بولا کہ ”میرا نام ڈاکٹر محمود ہے آپ کا فون ملتے ہی میں فوراً ہی چلا آیا کہاں ہے مریض؟“

منیجر شوکت کا منہ حیرت سے کھلا کر کھلا رہ گیا اور وہ بولا کہ ”آپ ڈاکٹر محمود ہیں تو پھر وہ کون تھا؟“ منیجر شوکت کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے اور پھر اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔

اسے بہت دور سے ڈاکٹر کی کربناک موت کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں مگر وہ بے بس تھا۔ کچھ نہ کر سکتا تھا۔

☆☆☆

نیا گھر

نینا خان

بس ایک نیا گھر لینا ہی اس خاندان کے لیے غضب ہو گیا تھا

یہ بات آج سے چھ سال پرانی ہے۔ جب میرے سب سے چھوٹے ماموں واحد خان کی شادی کے لیے لڑکیاں تلاش کی جانے لگیں اور کافی لڑکیوں کی سلیکشن کے بعد آخر کار ایک مناسب لڑکی پسند آ ہی گئی۔

سب سے چھوٹے ماموں کی کچھ ڈیمانڈز تھیں کہ لڑکی آج کل کے ماحول سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ شریف خاندان کی پڑھی لکھی سلجھی ہوئی لڑکی ہو۔ آج کل کے ماحول سے مطابقت نہ رکھنا اب کافی مشکل کام بن گیا ہے۔ بہرحال کافی مشکل سے ماموں کی فرمائش اور ان کی من پسند لڑکی مل گئی تو خوب جوش و خروش سے ان کا رشتہ طے کر دیا گیا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ماموں کو گھر میں کون سا کمرا دیا جائے کیونکہ سب ہی ماموں کی شادی ہو چکی تھی۔ سب کے اپنے اپنے پورشن تھے اور بچے بھی ہو چکے تھے۔ لہٰذا فیملی دن بدن بڑھتی ہی گئی تھی۔ اس لیے چھوٹے ماموں کے لیے کمرے کا انتظام کرنا خاصا مشکل بھی ہو گیا تھا۔ ہم سب کیونکہ ان کی اکلوتی بڑی بہن کے بچے تھے تو ان سب سے بہت زیادہ اٹیچڈ ماحول رہا ہے۔ سارے ماموں، ماموں کم اور دوست زیادہ تھے۔ ہم سبھی بہن بھائی اکثر نانی کے گھر جانے کی ضد کرتے رہتے تھے کہ وہاں ہم سب بہت زیادہ انجوائے کرتے تھے۔ امی اکلوتی بہن ہیں اس لیے زیادہ بہنیں نہ ہونے کی وجہ سے بھی ماموں ہم سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

جب ماموں کی شادی کے دن نزدیک آئے تو بڑے ماموں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ایک بڑا گھر لے لیں جس میں آرام سے سب مل کر رہیں گے لیکن نانی پرانا گھر چھوڑ کر جانے کو قطعی راضی نہیں تھیں کیونکہ اس گھر سے نانا کی یادیں جو جڑی ہوئی تھیں۔ سبھی ماموں اور امی، نانی کو راضی کرنا چاہ رہے تھے مگر نانی کو راضی کرنے میں ناکام ہی رہے۔ نانی کو منانا ناممکن ہونے لگا تھا جس کی وجہ سے ماموں کی شادی بھی مسئلہ بن گئی تھی۔

آخر کار بعد میں بڑے ماموں نے نانی کی بات مانتے ہوئے یہ فیصلہ لیا کہ تین ماموں نانی کے ساتھ پرانے گھر میں رہیں گے اور دو کو وہ اپنے ساتھ لے کر نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور اسی نئے گھر میں ہی چھوٹے ماموں کی شادی کریں گے۔ بڑے ماموں بزنس میں اپنے بزنس کے سلسلے میں اکثر کبھی ملک [illegible] اپنی شہر سے آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کام [illegible] آ گئے تو وہاں اپنے دوستوں سے گھر تلاش کرنے کی بات کی تو ان کے ایک دوست نے کہا کہ وہ اپنا گھر فروخت کرنا چاہتا ہے۔ قسمت سے ان کے دوست کا گھر ماموں کے گھر کے ایریا میں ہی تھا۔ پیدل بھی آیا جایا جا سکتا تھا۔ ماموں نے بغیر گھر دیکھے ہی دوست کی بات سن کر اس کا گھر خریدنے کا ارادہ کر لیا۔ گراؤنڈ فلور میں دو کمرے ایک بڑا سا صحن اسی کے ساتھ کچن اور کچن کے برابر میں اٹیچڈ باتھ تھا۔ گھر مناسب لگا۔ سننے کے بعد کہ گراؤنڈ فلور کے اوپر فرسٹ اینڈ سیکنڈ فلور بھی بنا ہوا تھا اور سیکنڈ فلور پر دو کمروں کے ساتھ ہی ایک کھلا صحن تھا۔ بڑے ماموں نے سن کر ہی بیعانہ دے دیا اور کاغذی کارروائی شروع کر دی۔

بڑے ماموں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ایک چھوٹے بھائی کے بیوی بچوں اور سب سے چھوٹے ماموں واحد خان کو بھی لے آئے۔ تین ماموں نانی کے ساتھ اپنی اپنی فیملی کے پرانے والے گھر میں ہی مقیم رہے۔

☆.....☆

اب اس گھر میں آ کر ماموں کی شادیوں کی خوب تیاریاں کی جانے لگیں۔ شفٹ ہونے کے بعد بڑے ماموں نے نئے گھر میں اپنے بھائیوں، نانی اور امی کی دعوت کی تاکہ سب آ کر گھر بھی دیکھ لیں اور چھوٹے ماموں کی شادی کی تیاریاں بھی کر لیں۔ جب مجھے امی نے بتایا کہ بڑے ماموں کے گھر جانا ہے نئے گھر میں دعوت رکھی ہے تو میں اور امی بڑے ماموں کے گھر جانے سے پہلے مارکیٹ گئے۔ نئے گھر کی خوشی میں ان کے لیے ایک بڑا سا شوپیس خریدا تاکہ ان کے نئے گھر میں اسے سجایا جا سکے۔ امی اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے سب بھائیوں کی پیاری ہیں۔ سب بھائی ہر کام میں انہیں بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اپنے گھر کے ہر پروگرام میں امی اور ہم سب بہن بھائیوں کو پہلے سے رکنے بلا لیا جاتا تھا۔ اپنے گھر کے کاموں کی ذمہ داریاں بھی کاندھے پر ڈال دی جاتی ہیں کہ ممانیوں کے ساتھ مل کر تمام کاموں میں حصہ لو۔ بہرحال جب ہم سب امی کے ساتھ بڑے ماموں کے نئے گھر میں پہنچے تو سب سے مل

کر ہم سب کزن گھر کا معائنہ کرنے لگے۔ بڑے ماموں اور دوسرے نمبر کے ماموں کے بچوں سے بہت دوستی بھی ہے۔ باقی ماموں کے بچے تو بہت چھوٹے ہیں تو سب سے پہلے گراؤنڈ فلور میں بڑا سا صحن تھا وہیں سب بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے کیونکہ اسی میں کچن اور اٹیچڈ باتھ بھی تھا۔ کورڈ صحن تھا۔ لاؤنج کی طرح اسی کے ساتھ ہی دو کمرے تھے۔ ایک میں ماموں کے بڑے بیٹے نے اسے اپنا اسٹڈی روم کے ساتھ ساتھ اپنا بیڈ روم بھی بنا رکھا تھا۔ اس کے برابر والے روم کو ممانی نے ڈرائنگ روم بنا کر اسے سیٹ کر دیا تھا کافی اچھا سا۔ صحن کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں۔ پہلے اسٹیپس ختم ہوتے ہی سامنے ایک اسٹور بنا ہوا تھا۔ اس میں لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے تھوڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ پہلے اسٹیپ کے ساتھ ہی دوسرے اسٹیپ تھے۔ چند اس کے سامنے ایک کمرا اور ایک کمرا اس کے برابر میں تھا۔ دوسرے کمرے کے ساتھ ہی اٹیچڈ باتھ تھا۔ اٹیچڈ باتھ کے ساتھ ہی مشین رکھی ہوئی تھی۔ سیڑھیوں کے اسٹیپ کے سامنے والا کمرا چھوٹے ماموں واحد خان کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے برابر والا کمرا بڑے ماموں اور بڑی ممانی کا بیڈ روم تھا۔ اسی کے ساتھ ہی پھر سے سیڑھیاں تھیں جو کہ سیکنڈ نمبر کے ماموں کی فیملی کو دیا گیا تھا۔ اس پورشن میں دو کمرے اور ایک بڑا سا صحن جو کہ کھلا تھا، اسی کے ساتھ ہی اٹیچڈ باتھ تھا۔ گھر ویسے تو پرانی طرز کا بنا ہوا تھا مگر اچھا تھا۔ ہم سب کزن خوب ہنسی مذاق میں مصروف ہو گئے تھے مگر پھر بھی مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا پتا نہیں کیوں مجھے بار بار اس اسٹور روم کا خیال آ رہا تھا۔ میں نے اس بات کا ذکر اپنی چھوٹی بہن سے کیا تو اس نے پہلے تو میرا وہم کہہ کر مجھے چپ کروا دیا۔ بعد میں شاید اسے میری بات پر یقین آ گیا جب ہم بار بار اوپر سے نیچے تو کبھی نیچے سے اوپر پورشن میں آنا جانا کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں میری نظریں بار بار اس اسٹور روم کے گیٹ پر ٹھہر جاتی تھیں۔ جب اسی طرح آنے جانے میں بہن کو بھی خوف سا محسوس ہوا تو اس نے آ کر کہا کہ ہاں آپی تم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ عجیب سی وحشت محسوس ہو رہی ہے اسٹور کے گیٹ کو دیکھ کر، ہم سب نماز پڑھنے کے پابند ہیں اور کافی ذکر وغیرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے گھر میں تو شاید اسی وجہ سے چھٹی حس تیز ہو گئی ہو۔ دن سے شام تک ہنسی مذاق میں چائے ناشتے میں رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تو ہم سب نے کھانا کھایا اور رات کو ہی اپنے گھر واپس آ گئے لیکن ماموں کی شادی کی تیاریوں میں اکثر ممانیوں کا ہاتھ بٹانے جانا ہی پڑتا تھا۔ میں تو بس اسٹور سے خوف کھاتی تھی۔ شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں ہم سب نے اپنے اپنے کپڑے تیار کر کے سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے کہ ماموں کے گھر رکنا تھا۔ شادی کو انجوائے کرنا تھا۔ ہم پہلے سے ہی ماموں کے گھر آ گئے تھے جس دن ہم ماموں کے گھر آئے رات کا کھانا وغیرہ کھا کر سب کے سب سیکنڈ فلور پر بڑے ماموں کے بیڈ روم میں بیٹھے تھے۔ ممانی شادی سے متعلق سامان دکھا رہی تھیں کہ بڑے ماموں نے کہا آج کھانے کے بعد چائے کیوں نہیں بنائی۔ وہاں سب کھانے کے بعد چائے لازمی پیتے تھے۔ تینوں ٹائم کے کھانے کے بعد چائے پینا وہاں معمول تھا۔ ماموں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا کہ نینا بیٹا جلدی سے اچھی سی چائے بنا لو سب کے لیے۔ میں او کے کہہ کر نیچے آ گئی۔ سب کے سب اوپر تھے مجھے اکیلے اسٹور کے سامنے سے گزر کر نیچے آنا تھا۔ میں پہلے اسٹیپ سے اتر کر جیسے ہی دوسرے اسٹیپ پر آنے لگی تو اسٹور کو دیکھ کر وہیں ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی مجھے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے میں نے اگنور کیا اور فوراً سیڑھیوں کے اسٹیپ سے اتر کر نیچے آ گئی۔ کچن میں چائے بنا کر انتظار کرنے لگی کہ جلدی سے چائے تیار ہو اور میں چائے لے کر اوپر سب کے پاس جاؤں۔ بہرحال چائے تیار ہوتے ہی میں سب کے لیے چائے لے کر گئی تو میرے بھائی نے چائے پیتے ہی کہا۔ ”چینی کم ہے چینی لے کر آ جاؤ۔“ میں نہ چاہتے ہوئے بھی چلی گئی۔ میں اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں ہوں۔ اتنی آسانی سے ڈرتی نہیں ہوں مگر مجھے بیچ میں بہت خوف سا محسوس ہو رہا تھا اور میری نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی اسٹور پر ٹھہر رہی تھیں۔ تقریباً بارہ بجے ہوں گے کہ میں چینی لینے کی

غرض سے پھر سے نیچے پورشن میں آ چکی تھی۔ چینی لے کر میں اوپر جانے لگی تو پہلے ہی اسٹیپ پر قدم رکھتے ہی نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو اسٹور کا گیٹ تھا اور میری نظریں اس پر ٹھہر چکی تھیں اور میں پسینے پسینے ہو چکی تھی۔ میری ہارٹ بیٹ انتہائی تیز ہو چکی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے پیٹ میں اچانک درد ہو رہا ہے۔ درد کی نوعیت ایسی تھی کہ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اچانک سے مجھے اندھیرا سا آتا محسوس ہوا۔ آنکھوں کے چاروں طرف اندھیرا اور چکر آنے لگے میں چکرا کر گر گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ کافی دیر کے بعد مجھے جب ہوش آیا تو امی تمام ماموں اور ممانیاں کزن وغیرہ سامنے تھے۔ مجھ سے سب نے پوچھا تو میں نے بس اتنا کہا کہ اچانک سے اندھیرا آنکھوں میں آیا پیٹ میں درد ہوا اور پتا نہیں چلا۔ سب نے کہا اندرونی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی مگر میں بھی کہاں ان چیزوں کے سامنے کمزور پڑنے والی تھی۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ میں تو اب اسی اسٹور کے سامنے بار بار گزروں گی۔

☆.....☆

پھر شادی کی تیاریاں مایوں مہندی کی رسمیں ہوئیں خوب انجوائے کیا۔ ہم نے خوب گانے گائے۔ ڈانس کیا پرونق محفلیں جمائیں۔ بہت انجوائے کے ساتھ چھوٹی ممانی کو گھر لے آئے۔ ممانی کی عادت اخلاق بھی باقی ممانیوں کی طرح ہی تھا۔ کافی دوستانہ ان سے بھی اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ پھر ہم اپنے گھر آ گئے۔ بس اسی طرح دن گزر رہے تھے۔ میں نے ہمیشہ یہ بات نوٹ کی کہ اس گھر میں رہنے والے تمام کزن کو بھی کوئی ڈر اور خوف محسوس نہیں ہوا۔ کزن تو اسٹور میں سامان رکھنا اور نکالنا کرتے رہتے تھے۔ وہاں کے رہنے والے مکینوں کو کسی غیر محسوس چیز کی موجودگی محسوس نہیں ہوئی جب کہ میں تو جب بھی جاتی تو مجھے بہت طاقتور چیز کی موجودگی محسوس ہوتی تھی۔ میری چھوٹی بہن بھی کافی خوف سا محسوس کرتی تھی۔

☆.....☆

چند مہینوں کے بعد سیکنڈ نمبر کے ماموں نے اپنے چھوٹے بیٹے کا عقیقہ کیا تو ہم لوگ ایک دن پہلے سے ہی وہاں پہنچ گئے۔ رات خوب انجوائے کیا کافی گانے گائے۔ رات ساری کزن اور سارے کزن مل کر انجوائے کر رہے تھے۔ تیسرے نمبر کے ماموں کی بیٹی بھی تھی اگلے دن سب شاور لینے کے لیے تینوں اٹیچڈ باتھ میں باری لگائے بیٹھے تھے۔ میں سب سے اوپر سیکنڈ فلور میں بس شاور لینے جانے لگی تو تیسرے ماموں کی بیٹی ایشا نے آ کر کہا۔

”آپی آپ نیچے شاور لینے چلی جائیں۔ مجھے یہاں جانے دیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم نیچے کیوں نہیں جا رہیں میں تو کب سے ویٹ کر رہی تھی یہ باتھ خالی ہو تو میں شاور لینے جاؤں۔“

وہ کہنے لگی۔ ”آپی سب سے نیچے گراؤنڈ فلور والا باتھ روم ہوتا تو میں چلی جاتی مگر یہ فرسٹ فلور والے میں، میں نہیں جانا چاہتی۔“

میں نے فوراً اس سے پوچھا۔ ”کیوں؟“

”کیوں کہ مجھے ہمیشہ سے یہاں اس گھر میں رہنے والے کزن ٹال دیا کرتے تھے کیوں کہ تیسرے نمبر کے ماموں کی فیملی تو پرانے گھر میں ہی رہتی تھی تو اس نے مجھے بتایا۔ ”آپی مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے اس باتھ روم میں سے ایک بار میرے ساتھ کچھ واقعہ ہوا کسی نے یقین نہیں کیا۔ مجھے پاگل کہہ کر ہنسنے لگے۔ ڈرپوک ڈرپوک کہہ کر چڑانے لگے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”ایشا مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا۔ اس باتھ روم میں کیونکہ وہ باتھ روم اسی اسٹور روم کے ساتھ ہی بنا ہوا ہے۔“

میرے پوچھنے پر اس نے مجھے بتایا۔ ”آپی میں اس باتھ روم میں باتھ لے رہی تھی کہ اچانک سے صابن غائب ہو گیا۔ میں ڈھونڈنے لگی۔ صابن دانی تو ہے مگر اس میں رکھا صابن غائب ہے۔ میں نے باتھ روم میں چاروں طرف ڈھونڈا مگر صابن کا تو نام و نشان ہی نہیں تھا۔ میں کافی پریشان ہونے لگی کہ ابھی تو میں نے صابن استعمال کیا ہے اور صابن دانی میں رکھا تھا۔ یہ اچانک سے صابن دانی سے کہاں غائب ہو گیا۔ پھر کسی نے میرا نام لیا کہ ایشا یہ رہا صابن۔ اور صابن جیسے کسی نے میرے پاس پھینکا ہوا۔ میں انتہائی

خوف زدہ ہوگئی۔ جلدی سے کپڑے پہن کر واپس آ کر سب کو بتایا تو کسی نے بھی یقین نہیں کیا اور میرا خوب مذاق اڑایا۔ میں تو نہیں جاؤں گی اس باتھ روم میں آپ چلی جائیں۔''

''یار سب ڈانٹ رہے ہیں کہ جلدی سے تیار ہو جاؤ باہر ٹینٹ سج بھی چکا ہے اور کچھ دیر میں مہمان بھی آنا شروع ہو جائیں گے۔'' میں نے ایشاء سے تمام باتیں سن لینے کے بعد بھی اسی باتھ روم میں شاور لینے چلی گئی۔ مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ پانی ڈالنے کے بعد میں خوف کو خود پر حاوی نہ ہونے کی کوشش کرتی رہی اور جلدی سے واپس آ کر تیار ہوگئی اور پھر پارٹی انجوائے کی۔ رات میں پارٹی ختم ہونے کے بعد ہم سب اوپر صحن میں کھلی ہوا میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے باتوں باتوں میں سب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر کسی نے بھی کچھ نہ بتایا۔ وہاں سب نارمل ہی تھے۔ میری چھوٹی بہن بھی خوف محسوس کرتی تھی۔ وہ تو کھل کر سامنے کہہ دیتی تھی کہ اس اسٹور میں ضرور کوئی مسئلہ ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے میں بھی اس کی تصدیق کر کے رہ جاتی مگر کوئی یقین ہی نہیں کرتا اور مذاق بنانے لگتے۔ چھوٹی بہن تو ڈر کا صاف کہہ کر ہر کام کرنے سے منع کر دیتی تھی اس کی بچت ہو جاتی اور میں خاموشی سے ہر کام کے لیے نیچے آ جاتی اور کام کرتی رہتی کیونکہ ڈر خوف کو خود پر حاوی نہ ہونے دینا ہی عقل مندی ہے۔ میں ہمیشہ سے ہی ڈر اور خوف کو خود پر حاوی ہونے ہی دیتی تھی۔ اس لیے بھی ہر کام آرام سے کر کے آنا جانا رکھتی تھی۔ عقیقے کے بعد ہم سب اپنے گھر آ گئے اور اپنی اپنی اسٹڈی میں مصروف ہو گئے۔ بس کافی ٹائم تک اسی سلسلے میں پھر جانا بھی نہیں ہوا۔ بس مل کر واپس آ جاتے۔ اسی طرح چند سال گزر گئے۔ ماموں اور تینوں ماموؤں کی فیملیز اسی گھر میں خوشی سے رہ رہی تھیں۔

☆.....☆

میرے بی ایڈ کے امتحانات قریب تھے۔ میں بہت زیادہ ہی اپنی تعلیم میں مصروف تھی۔ امتحانات کی اتنی فکر تھی کہ بس کسی طرح سے اچھے پیپرز ہو جائیں اور میرا رزلٹ اچھا آ جائے۔ میں ہمیشہ سے ہی اپنے امتحانات اور پڑھائی کو لے کر بہت سنجیدہ ہوں۔ جب امتحانات ہوتے ہیں تو میں ہر جگہ آنے جانے اور ملنے جلنے سے اجتناب برتتی تھی۔ بہرحال ایگزام کی جب ڈیٹ شیٹ آئی تو دیکھا کہ ایگزام کا بورڈ سرسید کالج میں ہے اور سرسید بالکل بڑے ماموں کے گھر کے قریب تھا۔ پیدل کا راستہ تھا لیکن بڑی ممانی نے سنا تو کہا کہ ان کا بیٹا احتشام چھوڑ کر آ جایا کرے گا بائیک پر تم یہاں رہنے آ جاؤ۔ یہیں سے ایگزام دینے چلی جایا کرنا۔ کیونکہ ہمارے گھر سے سرسید کالج کافی دور تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا تو میں روز روز آنے سے بچنے کے لیے وہیں چلی گئی اور وہیں سے میں احتشام کے ساتھ بائیک پر ایگزام دینے جاتی اور وہ ہی مجھے لینے بھی آ جاتا۔ اسی طرح وہاں رہ کر میں نے اپنے تمام پیپرز دیئے اور اللہ کے کرم سے تمام پیپرز تیاری کے مطابق ہوئے۔

لاسٹ پیپر والے دن ہم سب کزنز نے مل کر آئس کریم کھانے کا سوچا۔ پاس ہی آئس کریم پارلر تھا۔ وہاں جا کر ہم سب نے آئس کریم کھائی اور وہیں ہمارا پروگرام بنا کہا کہ آج رات تمام کزن مل کر ڈرائنگ روم میں رات بھر باتیں کریں گے کیونکہ اگلے دن مجھے واپس اپنے گھر بھی جانا تھا۔ پھر یہ پلان طے ہوگیا۔ رات کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سب کے سب اپنے اپنے پورشن میں چلے گئے اور ہم سب کزن ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سب سے چھوٹی ممانی بھی ہم سب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھیں ہم رات بھر باتیں کرتے رہے، ہنسی مذاق چلتا رہا۔ تقریباً رات کے ڈھائی بجے ہوں گے میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں دروازے کے اوپر خوب صورت سی گرل لگی ہوئی تھی۔ اس گرل سے اس اسٹور کا گیٹ نظر آتا تھا اور میری نظر بار بار اسی گیٹ پر جا رہی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آج کی رات میرے ساتھ کوئی ایسا واقعہ ہونے والا ہے جسے فراموش کرنا میرے لیے ناممکن ہوگا۔ رات کا وقت تھا تو تمام لائٹس بند تھیں ہم بھی ڈرائنگ روم میں زیرو کا بلب جلا بیٹھے تھے۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا۔ برابر والے

روم میں احتشام اس رات نہیں سویا تھا۔ بڑے ماموں بزنس کے سلسلے میں چائنا گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی امی یعنی بڑی ممانی کے ساتھ ہی روم میں سو گیا تھا۔ اس کی بہن ہمارے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھی۔ مجھے واش روم جانا تھا میں اٹھی اور ڈرائنگ روم کا گیٹ کھول کر نکلی اور گیٹ بند کر دیا۔ واش روم سے فارغ ہو کر جیسے ہی میں نے گیٹ کھول کر باہر نکلنا چاہا تو سامنے روم پر فریج رکھا ہوا تھا وہاں کوئی سیاہ لباس میں ملبوس کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر اس کا سر موجود نہیں تھا سیڑھیوں سے اچھی خاصی روشنی آ رہی تھی اور ڈرائنگ روم کی گرل سے بھی کافی روشنی آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ گھر میں انٹر ہوتے ہی گیٹ کے ساتھ بھی سیور لگا ہوا تھا۔ اس کی روشنی بھی اس پر بہت زیادہ پڑ رہی تھی۔ کیونکہ فریج وہیں رکھا ہوا تھا اور میرے دو قدم کی دوری پر اسے دیکھ کر انتہائی خوف زدہ ہوگئی کہ یہ کیا چیز ہے اتنا کالا لباس اور سر نہیں ہے اس آدمی کا ہاتھ پاؤں سب ہیں اور سر کی جگہ سے خون گر رہا ہے۔ میں نے ہمت کر کے واش روم کا گیٹ بند کیا۔ واش بیسن سے ہاتھ دھوئے اس کو دیکھتے ہوئے جلدی سے گیٹ کھولا اور ڈرائنگ روم کے اندر آ گئی۔ میری سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ میں پسینے سے شرابور تھی۔ دل کی دھڑکن تیز تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ سانس حلق میں اٹک گئی ہو۔ مجھ سے سب نے پوچھا کیا ہوا میں نے کہا کچھ نہیں اور جلدی سے لیٹ گئی آنکھیں بند کر لیں رات بھر سو نہیں سکی۔ میں نے صبح اٹھ کر دیکھا تو مجھے بہت تیز بخار تھا۔ میں بس بے چینی سے بھائی کا ویٹ کر رہی تھی کہ بھائی بائیک پر آئیں اور مجھے گھر لے جائیں۔ نانی آ گئی تھیں میں نے ان سے یہ رات والا واقعہ ڈسکس کیا تو وہ سمجھ گئیں اور انہوں نے مجھے سب کو نہ بتانے کا کہا کہ تمام کزن ڈر جائیں گے۔ میں بھی پہلے ہی یہ سوچ چکی تھی کہ مجھے یہاں کسی کزن سے ڈسکس نہیں کرنا کیونکہ یہ لوگ اگر ڈر گئے تو یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ میں بہت زیادہ خوف زدہ ہو چکی تھی۔ اس شے کا خیال میرے جسم کو مزید بھاری کر رہا تھا۔ میں بار بار پریشان ہو رہی تھی کیونکہ وہ شے میری آنکھوں میں آ رہی تھی۔ بہرحال میں نے خود کو سنبھالا اور اس بات کا یقین دلایا کہ یہ تمام چیزیں بھی دنیا میں ہیں۔ ان کا وجود ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو سب سے زیادہ

سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ ''پلیٹ فارم''

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں.....جن میں جدائی اور ملن کی وصل بھی شامل ہے۔

ممتاز احمد کے قلم سے خوش اثر، رسیلی، زہریلی کہانیاں، نازنیناں، نازپیشگاں کے قصے

فتنہ سامانیاں، جولانیاں لیے پلیٹ فارم نمبر کی سوغاتیں.....

جنہیں قارئین سچی کہانیاں نے اپنی پسندیدگی سے نواز کر امر کر دیا۔

''پلیٹ فارم'' اب کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قیمت صرف 500 روپے۔

زیر اہتمام: طلوع اشک پبلی کیشنز

رابطہ: 0300-4850461/0333-4524137

Email : tulooashk@yahoo.com

طاقت ور بنایا ہے۔ اشرف المخلوقات میں سے ہونے کی وجہ سے ہم سب سے زیادہ معزز ہیں اللہ کے نزدیک۔ لیکن آج بھی جب اس شے کا خیال آتا ہے تو عجیب سا خوف آتا ہے کہ کوئی بنا سر کا انسان سیاہ لباس میں تھا اور اس کے سر کی جگہ سے خون ٹپک رہا تھا اور میں اس کو مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ آخر وہ صرف مجھے ہی کیوں نظر آیا۔

☆.....☆

کافی ٹائم کے بعد جب میں اس بات کا ذکر اپنے کزن سے کیا تو احتشام نے ہنس کر بات ٹال دی اور دوسرے کزن کے سامنے بات بناتے ہوئے کہا۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس گھر میں بس اب وہاں کی باتیں مت کرو۔ ہم وہ گھر چھوڑ چکے ہیں۔ اب ہمارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ گھر اب ہم بیچ بھی چکے ہیں۔ اس گھر کی باتیں جانے دو۔''

ہاں اب وہ گھر بڑے ماموں بیچ چکے ہیں اس گھر کو چھوڑے ہوئے ایک سال گزر گیا ہے۔ پانچ سال وہاں رہے ہیں۔ تین ماموؤں اور ایک سال وہاں سے چھوڑے ہوئے ہو گیا۔ اس گھر میں رہتے ہوئے چھوٹے چھوٹے حادثات تو ہوئے مگر ان حادثات کو اتنا سنجیدہ نہیں لیا گیا تھا مگر ایک حادثے نے بڑے ماموں اور ان کے بچوں کی زندگی ہی بدل دی۔ اس گھر کی رونق اور خوشیاں جن کے دم سے تھیں وہ خوشیاں اور رونق ہی ختم ہو گئی۔ ایک ہنستا بولتا گھر پانچ سال کے قلیل عرصے میں ماتم کدہ بن گیا تھا۔ سمجھ نہیں آتا آج بھی کہ اچانک ایسا کیسے ہو گیا؟

سب کو ہنسانے اور ہر وقت ہنسی مذاق کرنے والی بڑی ممانی جنہوں نے بڑے پیار سے اپنا یہ نیا گھر سجایا تھا۔ گھر کی ہر ایک چیز کو نئے سرے سے بنایا اور اسے خوب صورتی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ سجایا تھا، بڑی ممانی ہر دلعزیز خاتون تھیں۔ ان کی صحبت میں اگر کوئی بیٹھ جاتا تھا تو وہ کبھی بور نہیں ہوتا تھا۔ جب ان کے ساتھ اچانک ایسا واقعہ پیش آیا تو ہم سب حیران تھے کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔ چالیس سالہ نوجوان خاتون جن کو کوئی بیماری بھی لاحق نہیں تھی۔ بالکل ٹھیک تھیں بس بارہ ربیع الاول کو اپنے گھر میں ایک بڑا میلاد کروانا چاہتی تھیں اسی سلسلے میں پرانے محلے میں رہنے والی میلاد پڑھنے والی خاتون سے بات کرنے گئی تھیں۔ بڑے ماموں نے صدر جانے سے پہلے ان کو نانی کے گھر چھوڑ دیا کہ وہ میلاد والی خاتون سے بات کر کے چھوٹے ماموں کے ساتھ واپس گھر چلی جائیں۔ میلاد والی سے بات کی تو اس نے کہا کہ وہ تو بہت مصروف ہے اس کی بکنگ ہو چکی ہے۔ پورے بارہ ربیع الاول میں ایسا کوئی دن نہیں ہے کہ جس میں آ کر وہ ان کے گھر میلاد کی محفل سجائے۔ وہ کافی افسردہ سی ہو گئی تھیں۔ واپس نانی کے گھر آ کر کہا کہ کاش وہ میلاد اسی بارہ ربیع الاول میں پڑھ دیتی میرے گھر۔ دوسری ممانیاں روکتی رہیں پر انہوں نے کہا کہ نہیں میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔ تیسرے نمبر والے ماموں نے کہا کچھ دیر رک جاؤ بھابی میں کام سے فارغ ہو کر چھوڑ آؤں گا۔ بس اپنا کام ختم کر لوں۔ مگر انہوں نے منع کر دیا برابر میں ماموں کے کزن کے ساتھ بائیک پر واپس گھر جانے کا کہا تو تیسرے نمبر والے ماموں نے منع بھی کیا کہ میں ہی چھوڑ دوں گا۔ کزن تو چھوٹا ہے پر بڑی ممانی نے ضد کی اور وہاں سے بائیک پر جانے لگیں۔ جیسے ہی گلی سے نکل کر روڈ پر آئے کیونکہ ناظم آباد کا روڈ خاصا چلتا ہوا ہے۔ رکشہ والے کی غلطی سے بائیک گر گئی اور ممانی مین روڈ پر گری تھیں۔ سامنے سے بڑی بس آ رہی تھی اس کی اسپیڈ بہت تیز تھی وہ بس ان کے سر کو کچلتی ہوئی گزر گئی۔ ان کا ماتھا ختم ہو چکا تھا چہرہ بری طرح تباہ ہو چکا تھا۔

یہ خبر ہم سب پر قیامت سے کم نہیں تھی۔ مانو جیسے قیامت ہی برپا ہو گئی ہو۔ بڑی مشکلوں سے سب کو سنبھالا کافی وقت لگا۔ کافی روحانی عاملوں نے اس گھر کو بیچنے کا کہا تو پھر وہ گھر بیچ دیا گیا۔ جو کمی بڑی ممانی کے جانے سے یوں اچانک پیش آئی وہ کبھی پوری نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کوئی اور ان کی کمی کو پورا کر سکتا ہے۔

آج بھی اس مخلوق کا ذکر میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی مخلوقات کے شر سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)۔

☆☆☆

سچی کہانیاں ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- .....پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ بتیس برس سے تین نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔
- .....اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- .....اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- .....پوری دنیا میں پھیلے اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- .....اِس لیے کہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- .....جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- .....اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- .....آپ کی مصنوعات کے اشتہار باکفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- .....جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: سچی کہانیاں

II 88-C۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

ناول

ایم اے راحت

زرد لومڑی

قسط:10

انتقام کی ایک نئی داستان جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا۔
برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکتہ الآرا سلسلہ

فلائٹ نمبر 727 کینیڈی ایئرپورٹ سے سیدھی میوئخ جاتی تھی۔ ایک پرسکون سفر طے کر کے میں اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ طیارے سے اتر کر اور ضروری قوانین سے فارغ ہو کر میں نے ٹیکسی کی اور النیشن پہنچ گئی

جہاں سے مجھے انسبرگ جانے والی ٹرین پر سفر کرنا تھا مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں ہر جگہ عمر رسیدہ لوگوں کی پذیرائی ہوتی ہے اور یہ ایک اچھی بات ہے۔

آخر کار میں ہوٹل ایسٹ مین پہنچ گئی جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ ہوٹل میں کوئی دو گھنٹے ریسٹ کے بعد میں باہر نکل آئی ایک بوڑھے مرد کا کردار ادا کرتے ہوئے مجھے بہت مزہ آرہا تھا۔ میں خاص طور سے لوگوں کے چہروں کا تجزیہ کررہی تھی اور کسی بھی چہرے پر اپنے لیے کوئی شبہ نہ پایا تھا۔ یہ میرے لیے فخر کی بات تھی۔ اپنے تمام ضروری کاموں کو میں نے سیر تفریح قرار دے دیا تھا اور مختلف مقامات دیکھتی ہوئی ڈھلتی شام میں میوزیم ٹریسے پہنچ گئی۔

گلی چوڑی تھی۔ یہاں خوبی یہ تھی کہ گلیوں میں سائیکل کے سوا کسی سواری کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ گلی کافی چوڑی تھی اور اس میں کیفے ہی کیفے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ دکانیں فوٹو گرافروں اور ریڈی میڈ کپڑوں کی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے نوجوان لڑکیاں قابل توجہ لباس میں ملبوس تاریکی میں بند دکانوں کے سامنے کھڑی یا دیواروں سے لگی گاہکوں کا انتظار کررہی تھیں۔

جس کی مجھے تلاش تھی اسے انہی لڑکیوں میں مجھ سے ملنا تھا۔ میں اس کی تلاش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لڑکیوں کو گھورتی آگے بڑھ رہی تھی۔ گاہکوں کی متلاشی مجھ بوڑھے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں جسے گرم شہر کی نہیں، نرم تابوت کی ضرورت تھی۔

پھر وہ مجھے نظر آگئی۔ مضبوط کاٹھی کی ایک بے حد خوب صورت لڑکی۔ اس کا سڈول جسم بے حد دلکش تھا۔ کمال کی صحت رکھتی تھی۔ میں اس کے سامنے سے گزر کر پھر واپس پلٹی اور اس کے موتیوں جیسے سفید دانت چمکے۔ تب میں اس کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔

''پانچ سو شلنگ۔'' اس کی آواز بھی اس کے پورے وجود کی طرح دلکش تھی۔

''زیادہ ہیں۔ لیکن تم خوب صورت ہو۔'' میں نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''کہاں چلنا ہے۔''

''میرے پاس کمرہ ہے۔''

''چلو۔'' میں نے کہا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ مجھے پکڑے آگے بڑھی تو کئی عورتوں نے ہنس کر ہم پر فقرے کسے۔ اس کا کمرہ ایک کیفے کی اوپری منزل پر تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو اس نے دروازہ بند کیا اور بولی۔

''کچھ پیو گے پروفیسر۔''

''پہلے تمہارا نام پوچھوں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جنیفیر۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''تمہیں ساری تفصیل معلوم ہے جینی۔'' میں نے اس کا نام مختصر کرلیا۔

''ظاہر ہے مجھے اس کام کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔''

''تمہارے ساتھ پارٹی ہے۔''

''ہاں سوچی آرگنیو پارٹی۔'' اس نے دلکش لہجے میں کہا اور ہنس پڑی۔

''تو پھر کیا پروگرام ہے۔''

''ہم کل صبح سالسبرگ ویانا روانہ ہوں گے۔ سالسبرگ میں لنچ لیں گے پھر سیر کریں گے پھر شام کو ویانا پہنچیں گے اور رات وہیں ٹھہریں گے۔ پرسوں صبح براٹسلاوا سے سرحد پار کریں گے۔''

''وہ کیسے۔'' میں نے پوچھا۔

''بس کے ذریعے۔ پھر بس سے اتر کر لانچ سے بوڈاپسٹ جائیں گے وہاں ہم ایک دن اور دو راتیں گزاریں گے اور باہر کے علاقوں کا گشت کریں گے۔''

''کیا وہی ہمارے مطلوبہ علاقے ہوں گے۔''

''یقین کرو، میں نہیں جانتی۔'' اس نے کہا اور پھر ایکدم اچھل سی پڑی۔

''کیا ہوا؟''

''کوئی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی اور برق رفتاری سے ایک کھڑکی کے پاس پہنچی پھر پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور کچھ لمحوں کے بعد پلٹ آئی۔ ''میرا اندازہ ٹھیک تھا۔''

''کیا؟''

''ہم دشمنوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں وہ اپنا کام کررہے ہیں۔''

''اس وقت جو شخص چھپ کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کررہا تھا، کے اونی میں اس کی تصویر موجود ہے اور گرے پاؤنڈ کے نام سے مشہور ہے۔ سنو میں تمہیں کچھ ضروری باتیں بتادوں باقی سب بعد میں۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور وہ بولی۔ ''مجھے ہدایات ہیں کہ میں تمہیں وہ مختصر تفصیل بتادوں۔ بوڈاپسٹ میں قیام کی دوسری رات ہم اوپیرا میں جائیں گے اور دوسرا ایکٹ شروع ہونے سے پہلے جب گھنٹی بجے گی تو تم مردانہ ٹوائلٹ میں جاؤ گے وہاں دیوار کے ساتھ والی بوتھ میں کوئی تمہارا منتظر ہوگا۔ بس اس کے بعد کھیل تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔''

''ٹھیک۔ مجھے یہاں کتنی دیر رکنا ہوگا؟''

''جتنی دیر تمہاری عمر ساتھ دے سکے۔'' اس نے کہا اور ہنس پڑی۔

☆.....☆

جنیفر مجھے پسند آئی تھی۔ بہت کم شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں میں دل سے پسند کرتی ہوں۔ اس وقت وہ میری اس مہم میں میری سیکنڈ بن گئی تھی کیونکہ حد سے زیادہ ایکٹو تھی۔ بے حد خوب صورت اور پرکشش ہونے کے باوجود اس کے اندر ایک مردانہ سی پھرتی تھی۔ بہن کی دلکش بناوٹ میں بھی ایک انوکھی بات تھی جسے لفظ نہیں دیئے جاسکتے تھے۔ اس کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ زبردست خوبیوں کی مالک ہے لیکن میرے میک اپ مین نے جو کمال کیا تھا اس کی میں دل سے قائل تھی اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پاپا سے درخواست کروں گی کہ اس شخص کو کچھ عرصہ کے لیے بلا کر مجھے اس سے میک اپ کی تربیت دلائی جائے۔

یہ میک اپ مین کے فن کا کمال تھا کہ جنیفر جیسی آفت لڑکی ابھی تک مجھ پر یہ شبہ نہیں کرسکی تھی کہ میں مرد نہیں عورت ہوں۔ پروگرام معمول کے مطابق آگے بڑھ رہا تھا اور جنیفر یہاں بھی سپر حیثیت سے تھی۔ یعنی اس تفریحی گروپ کے ساتھ وہ ایک گائیڈ کی حیثیت سے تھی۔ جس بس سے سفر کا آغاز کیا گیا تھا وہ ایک بڑی مرسڈیز ڈبل ڈیکر تھی جنیفر نے گائیڈ کے مخصوص یونیفارم میں رسمی مسکراہٹ کے ساتھ مسافروں کا خیر مقدم کیا تھا۔ میں بس کی اوپری منزل پر چلی گئی۔ یہاں ابھی کچھ سیٹیں خالی تھیں۔ جنیفر نے گائیڈ کی حیثیت سے چھوٹے سے اسپیکر پر جرمن، اسپینی اور انگریزی زبان میں دعائیہ کلمات پڑھے اور بس چل پڑی۔ وہ مسافروں کو راستے کے شہروں اور خاص چیزوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ بس کی رفتار تیز ہوتی جارہی تھی۔ جنیفر مسافروں سے ان کی خیریت اور ضروریات کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میرے پاس آکر وہ خوش اخلاقی سے جھکی۔ پھر رازداری سے بولی۔

''ڈرائیور ہمارا اپنا آدمی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ انسبرگ سے ایک جیگوار ہمارے پیچھے لگی ہے۔''

''ڈرائیور کو ہمارے مشن کے بارے میں پتا ہے؟''

''ضروری حد تک۔''

''اس سے رابطہ ہے؟''

''ہاں فون پر۔ ایک خفیہ ہینڈ فری میں نے ایک رسی سے لگا رکھی ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''بہت چالاک ہو تم۔ کہیں تمہارے درمیان عشق تو نہیں چل رہا؟''

''آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن ابھی ایسا نہیں ہوا ہے۔'' وہ خوش مزاجی سے بولی۔

''اس سے کہو جیگوار کو آگے نکلنے کا موقع دے اور جب وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو تم دیکھو وہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔''

کوشش شروع ہوگئی۔ خاصی دیر کے بعد اس نے مجھے بتایا۔ ''وہ تعداد میں تین ہیں اور شکل وصورت سے اطالوی لگتے ہیں۔ یا ممکن ہے ان کا تعلق اسپین سے ہو۔''

کچھ دیر کے بعد بس ایک بڑے سے چوراہے پر رک گئی۔ یہاں ایک پیٹرول پمپ اور سروس اسٹیشن تھا جس سے ملحق ریستوران بھی تھا۔ پیٹرول پمپ اور ریستوران پر کئی کاریں کھڑی تھیں۔ سیاح نیچے اترنے لگے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد تعاقب کرنے والی کار بھی وہاں آکر رک گئی اور اس سے دو آدمی نیچے اتر آئے۔ تیسرا کار میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ تب میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ سو فیصد اسپینی ہی تھے۔ دونوں ریستوران کے پاس کھڑے ہوگئے۔

میں بھی بس سے باہر آگئی اور ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ اگر وہ میرا تعاقب کر رہے ہیں اور مجھ سے کچھ چاہتے ہیں تو میں انہیں ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع دوں۔ میں نے ریستوران کے عقب کا رخ کیا۔ ادھر کا ماحول بے حد حسین اور قدرتی تھا۔ دور دور تک سرسبز شاداب گھاس سے لدے پہاڑی ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے ادھر کا رخ کیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ اس طرف نہیں آئے تھے۔ حالانکہ میں نے انہیں خود پر حملہ کرنے کا بہترین چانس دیا تھا۔

جب میں وہاں سے واپس پلٹی تب بھی دونوں نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ جیفر بھی اس صورت حال کا جائزہ لے رہی تھی۔ آخر کار مسافر بس میں آبیٹھے اور بس چل پڑی۔ میں نے فون پر جیفر سے کہا۔

''کیا کہتی ہو۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' وہ بولی۔

''پریشان ہو۔''

''الجھن میں ہوں۔''

''فکر مت کرو، سب ٹھیک ہے۔''

''او کے۔'' اس نے کہا۔

☆.....☆

ویانا کا سٹی ہال بھی بڑی مختلف نوعیت کا حامل تھا۔ اس میں کئی بڑے بڑے ریستوران تھے۔ ہر ریستوران میں کھانے پینے کے اسٹال اور خوب صورت بار تھے۔ عالیشان [illegible] خانے تھے۔ خوب صورت عورتیں پذیرائی کے لیے موجود تھیں۔ ہم نے یہاں کچھ وقت گزار کر یہاں [illegible] دیکھے اور پھر یہاں سے چلنے کا وقت ہوگیا کیونکہ اگلی صبح ہمیں سرحد پار کرنی تھی۔

غرض یہ کہ ہم صبح ہی صبح رابرٹ سلویا کے لیے چل پڑے۔ وہاں سے ہمیں دریائے ڈینیوب کو لانچ کے ذریعے پار کرنا تھا۔ دونوں طرف کے سرحدی گارڈز نے سرسری چھان بین کی۔ ہمیں اپنا سامان بس میں ہی چھوڑنا تھا اور اسے بوڈاپسٹ میں لینا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہمارے لانچ کے سفر کا آغاز ہوگیا اور وہ دریا کی پرسکون لہروں پر بہنے لگی۔

دریائے ڈینیوب کا شمار دنیا کے خوب صورت ترین دریاؤں میں ہوتا ہے۔ دونوں طرف برف اور جھاڑیوں میں ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ سیاح اس حسین سفر سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ طویل و عریض لانچ صرف لانچ کہلائی جاسکتی تھی حقیقت میں یہ چھوٹا موٹا سمندری جہاز تھی جس میں سیاحوں کے لیے ہر چیز کا معقول بندوبست کیا گیا تھا۔

میں لانچ کی سیر کر رہی تھی کہ ایک موٹے تازے عمر رسیدہ شخص نے مدھم سی سیٹی بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور جب میں نے اس طرف دیکھا تو اس نے غیر محسوس طریقے سے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہ شخص میرے لیے اجنبی تھا۔ مجھے حیرت ہوئی پھر میں نے اس طرف دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔

وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو چہرے سے بے ضرر نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی بیٹھا ہوا تھا جو اخبار پڑھ رہا تھا لیکن بار بار آنکھیں گھما کر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا۔ تیسری شخصیت ایک جوان عورت تھی۔ قابل رشک صحت کی مالک، خوب صورت مردانہ سوٹ میں ملبوس تھی لیکن میری عقابی نظروں نے بھانپ لیا کہ وہ عورت نہیں مرد ہے۔ ابھی میں ان کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ عورت کرسی سے اٹھ کر چل پڑی۔ میرا تجسس بڑھ گیا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑی اس وقت لانچ ایک موڑ سے گزر رہی تھی اور دونوں طرف پرانے قلعوں کے کھنڈرات اور دنیاتی طرز کے مکانات نظر آرہے تھے۔ میں ریلنگ کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ عورت میرے پاس آکھڑی ہوئی۔

''ہیلو۔'' اس نے نرم اور دلکش آواز میں کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''آپ سیاح ہیں انکل؟'' وہ پھر بولی۔ اور پھر چونک کر کہنے لگی۔ ''او آپ کی گردن پر یہ کیڑا۔'' یہ کہہ کر اس نے بالکل غیر متوقع طور پر میری گردن پر ہاتھ مارا اور ایک سوئی سی میری گردن پر چبھی۔ لیکن وہ درحقیقت سوئی ہی تھی جو اس کی چٹکی میں دبی ہوئی تھی۔ میں چونکی مگر دیر ہوگئی۔ مجھے زور سے چکر آیا اور میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے صرف اتنا احساس ہوا کہ میں ڈیک پر گر رہی ہوں۔

پھر مسلسل جھٹکوں سے مجھے ہوش آیا تھا اور میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ مجھے ہر طرف سفیدی ہی سفیدی نظر آرہی تھی۔ اسی وقت ایک آواز سنائی دی۔

''یہ ہوش میں آگیا ہے۔''

میں نے آواز کی سمت آنکھیں پھاڑیں لیکن کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

''اس کی آنکھیں کھول دو۔'' دوسری آواز ابھری۔ تب مجھے پتا چلا کہ میری آنکھوں پر ٹیپ لگا دیا گیا ہے۔ تب کسی نے بڑی بے دردی سے میری آنکھوں سے ٹیپ نوچ لیا۔ میں کسی ایمبولینس میں تھی۔ میری دونوں کلائیاں اور پنڈلیاں کشن سے بندھی ہوئی تھیں اور میرے سامنے وہی بیٹھا ہوا تھا جو عورت کے روپ میں مرد تھا۔ اس کے ساتھ وہ بھی تھا جس نے مجھے اشارے سے اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

''یہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ تمہیں میری حالت کا اندازہ نہیں ہے۔'' میں نے کسی بوڑھے کی بہترین آواز کی نقل کی۔

''بکواس مت کرو اور خاموش پڑے رہو۔'' اس بار ایک تیسری آواز سنائی دی اور میں نے اسے حیرت سے دیکھا لیکن حیرت کا ایک اور جھٹکا میرے ذہن کو لگا کیونکہ میں نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ یہ یونیس آر کو تھا۔ کرائے کا جاسوس بلکہ اسے شرلاک ہومز کہنا مناسب تھا کیونکہ یہ صرف تفتیش کرتا تھا لیکن سراغ رسانی کی فہرست میں اسے بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اب مجھے تھوڑی سی تشویش ہوئی تھی۔

''میں تو خود زندگی کو دھوکا دیتا پھر رہا ہوں۔ میرے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک۔ آخر مجھ بوڑھے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''تم..... تم صرف ایک بوڑھے آدمی نہیں ہو۔'' وہ بولا۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔'' میں نے اس اعصابی جھٹکے کو آبزرور کرتے ہوئے کہا۔

''بوڈاپسٹ۔'' وہ بولا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ تم بیمار ہو۔''

''بیمار!''

''ہاں۔''

''مگر مجھے کیا ہوا ہے؟'' میں نے صورت حال کی سنسنی محسوس کر کے کہا۔

''لانچ پر تمہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ تمہیں فوری طور پر اسپتال لے جایا جا رہا ہے۔''

''اوہ..... مگر.....!''

''بس خاموشی اختیار کرو۔'' اس نے کہا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس سے سگریٹ منتخب کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد ایمبولینس رک گئی اور پھر پچھلا دروازہ کھل گیا۔ ایمبولینس میں بیٹھے لوگ اتر گئے اور انہوں نے میرا کشن ایمبولینس سے نکالا۔ اس میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ جس جگہ وہ اترے تھے وہاں پانی کا شور صاف سنائی دے رہا تھا کوئی دریا، یا سمندر نزدیک تھا جہاں سے وہ گزر رہے تھے وہ جگہ سرنگ نما تھی۔

''کہاں لے جا رہے ہو مجھے۔'' میں نے بوڑھی آواز میں پوچھا۔

''اسپتال بڑے میاں۔'' جواب ملا اور میرے کشن کو ایک لفٹ میں چڑھا دیا گیا۔ پھر لفٹ سے اتار کر جس کمرے میں لے جایا گیا وہ کسی اسپتال کے بجائے کسی رئیس کی عیش گاہ معلوم ہوتی تھی۔ شاندار فرنیچر، کھانے پینے کی اشیاء، ایک کونے میں مشروبات سے بھرا ہوا شیشے کا کیبنٹ۔

اسی وقت ایک دروازے سے ڈینس آر کو نمودار ہوا اور خوشگوار حیرت میں بولا۔

''خوش آمدید مسٹر آرلینو۔ میں نے تمہیں اس رات پہچان لیا تھا جب تم عیاشی کے لیے اس کے ساتھ کمرے میں گئے تھے میری مراد جنیفر سے ہے۔''

''اوہ گڈ، جنیفر! اب کیا وہ تمہاری ساتھی ہے۔ ویلڈن۔'' میں نے کہا لیکن ایک عجیب سے تاثر کی لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ نہ جانے کیوں ایک دھندلا سا عکس ابھرا تھا۔

''ہمیں تمہارے یہاں آنے کی وہ معلوم ہو گئی ہے پروفیسر آرلینو اور ہم یہ چاہتے تھے کہ تم خیریت سے

یہاں پہنچ جاؤ۔ اس سفر کے دوران تمہاری سخت حفاظت کی گئی ہے۔''

''یقیناً اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی ورنہ میں زندہ نہ ہوتا۔''

''ایسی ہی بات ہے۔ تمہیں کچھ اطلاعات دینا بھی ضروری تھیں۔''

''کیا؟''

''نمبر ایک تمہیں شاید معلوم ہی نہ ہو کہ ناکی گارس کو اسپین میں ہلاک کر دیا گیا ہے۔'' دوسرا شدید جھٹکا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس کا اظہار میرے چہرے سے نہیں ہو سکتا تھا۔

''اس میں ہمارا ہاتھ نہیں تھا۔''

''گڈ۔ پھر کیا تمہیں معلوم ہے اس میں کس کا ہاتھ تھا۔''

''ہاں معلوم ہے۔ اور تمہارے مشن کے بارے میں بھی معلوم ہے۔''

''میرا مشن؟''

''ہاں! او تمہیں خوشی ہوگی کہ ہم بھی ناکی گارس کی مشرقی جرمنی سے واپسی چاہتے ہیں۔''

میرا منہ حیرت سے کھل گیا اور میں حیرانی سے ڈینس کو دیکھنے لگی۔ وہ منہ کھول کر ہنس پڑا پھر بولا۔

''اور تم سوچ رہے ہو گے کہ میں بے پیے ہی نشے میں آ گیا ہوں مگر ذرا صبر کرو۔ ابھی تمہیں بہت کچھ بتانا ہے۔'' کچھ لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا۔

''سب جانتے ہیں کہ لیٹا کمیونسٹ پارٹی کی ایک سرکردہ آرگنائزر تھی لیکن اندرونی طور پر وہ فاشسٹ تھی اور فاشزم کو دوبارہ لانے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ اس لیے وہ کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرنے کے بہانے سے اسپین گئی لیکن دراصل اس کا مقصد وہاں فاشزم کا اقتدار قائم کرانا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی لیکن اس کے سرپرستوں کو پتا چل گیا کہ وہ انقلاب لانے کے بعد خود اقتدار میں آنا چاہتی ہے۔''

''اس لیے اسے مار ڈالا گیا؟''

''ہاں۔'' ڈینس نے جواب دیا۔

''اور اب تمہارا سارا انحصار اس کے شوہر اور بیٹی پر ہے۔ اس لیے تم نے یہ ڈراما رچایا کہ میں انہیں سرحد پار کراؤں اور تم انہیں استعمال کرو۔''

''بالکل یہی بات ہے ذہین پروفیسر میری جان۔'' اس نے موڈ میں آ کر کہا۔

''اس کے بعد کیا ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں اس کے پیچھے شائریکا کا گیم ہے۔ شائریکا چاہتا ہے کہ ہم بھی وہی کچھ چاہتے ہیں جو شائریکا۔'' وہ پراسرار لہجے میں بولا۔

''یعنی؟''

''اسپین میں شائریکا کے اڈے ہیں اور ہم بھی وہاں آئروس کے کمیونسٹ اڈے چاہتے ہیں۔ شائریکا اپنے اڈے قائم رکھنے کے لیے ایک طاقت کی حمایت کر رہا ہے اور ہم اپنے لیے اڈے حاصل کرنے کے لیے دوسری طاقت کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس طرح ایک تیسری طاقت کو ابھرنے کا موقع مل جائے گا جو فاشزم ہے اور ہم میں سے کوئی یہ نہیں چاہتا۔

میں صحیح معنوں میں خوف زدہ ہو گئی۔ یہ گیم اتنا بڑا ہے کہ شاید مسٹر ساترے نے بھی اس بارے میں نہیں سوچا تھا بلکہ جس ملک نے اس بارے میں آگے کے لیے پیانے پر کام کرنے کے بارے میں سوچا تھا اسے خود بھی اس خوفناک عمل کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔

میں اس وقت ایک عمر رسیدہ بوڑھے کے روپ میں تھی لیکن یہ کہانی سن کر میرے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ میں نے سوچا کہ ترمودا واچی کے کہنے کے مطابق سائنسدانوں اور فوجی جرنیلوں نے تیسری جنگ عظیم روکنے کے لیے جو ''پی فورس'' بنائی ہے او عمران یعنی ایکس ٹو اس کا چیئرمین ہے اور ان کا کہنا ہے کہ میرے معاملات چونکہ اسی طرح بین الاقوامی سازشوں کے خلاف ہوتے ہیں تو یہ خوفناک سازش جس کا علم مجھے ہوا ہے سو فیصدی پی فورس کی مداخلت کا مقام رکھتی ہے۔

کیا عمران کو ابھی تک اس سازش کی بھنک نہیں ملی ہے؟

کیا یہ خوفناک سازش پی فورس کو متوجہ نہیں کرتی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ پی فورس کے وسائل کیا ہیں۔ اس کے ذرائع معلومات کیا ہیں۔ حالانکہ سوچا جا سکتا تھا کہ سائنسدانوں اور جرنیلوں کا گٹھ جوڑ کیا معنی رکھتا ہے۔ گویا ساری دنیا کی پاور سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئی تھی جسے پی فورس کا نام دیا گیا تھا۔ اس طرح یہ ممکن تو نہیں تھا کہ یہ سازش پی فورس کی نظروں میں نہ آئی ہے اور اگر آ گئی ہے تو اب تک اس کی طرف سے مداخلت کیوں نہیں ہوئی اور اگر ہو گئی ہے تو کیا عمران اس بار اس سازش کے خلاف کام نہیں کر رہا۔

اپنی اس احمقانہ سوچ پر مجھے خود ہنسی آ گئی۔ اس وقت میں ایک نوخیز ارمان بھری دوشیزہ بن گئی تھی جو اپنے پیا کو ہر قیمت پر اپنے قریب دیکھنا چاہتی تھی۔

''یار عمران کہاں ہو، اب آ جاؤ نا۔'' میرے دل نے کہا اور میں نے سوچا اگر انسان اپنے دل کو سزا دے سکے تو کتنا اچھا ہو۔ کیا درگت بنا کر رکھ دیتا ہے۔ مس ایٹی پارک کیوں گدھی بن رہی ہو۔ ساری شخصیت تباہ ہو جائے گی۔ ایک بار دل چاہا کہ انکل واچی سے بات کروں۔ ان سے کہوں کہ اگر پی فورس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے تو اس سازش کا کچا چٹھا اسے بتا کر اس طرف متوجہ کیا جائے۔

محبت اتنا ہی بے وقوف بنا دیتی ہے انسان کو۔'' ان خیالات سے نکل کر میں نے ڈینس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''کیا کہتے ہو پروفیسر۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''نہیں ڈیئر پروفیسر آرلینو، اس کیس میں اسپیٹ کنگ تم ہی ہو۔ اتنے معصوم نہ بنو۔''

''لیکن یہ تو کھیل کی نوعیت ہی بدل گئی۔'' میں نے کہا۔ ''اسے میں نے اپنی پارک کا کھیل شروع کیا جس کے لیے اس کا انتخاب اور اس پر اعتماد کیا جاتا تھا۔

''مطلب.....'' وہ بولا۔

''مطلب تم جانتے ہو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''غالباً تم یہ کہنا چاہتے ہو پروفیسر کہ اب تو ہمارا اور تمہارا مشن ایک ہی ہو گیا یعنی ہم بھی یہی چاہتے ہیں جو تم۔''

''ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے تم اپنا کام اپنے طور پر جاری رکھو۔ ہم اس میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔''

''ایک سوال کا جواب دو گے؟''

''ضرور۔ بولو۔''

''وہ شمسی توانائی کا قصہ کیا بے بنیاد ہے؟''

وہ آنکھیں سکوڑ کر کچھ دیر چھت کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

''یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے۔ اس کا واقعی کوئی وجود نہیں ہے صرف ناکی گارس کی اہمیت بنانے کے لیے یہ کہانی تراشی گئی ہے لیکن یہی ضروری ہے۔''

''اب میری طرف سے بھی ایک آخری بات، آخری سوال۔''

''وہ کیا۔'' میں نے پوچھا۔

''پروفیسر آرلینو کے روپ میں تم کون ہو، کوئی شائریکا ایجنٹ یا.....''

میرے بدن میں جھنجھناہٹ ضرور ہوئی تھی لیکن میں نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

''تم چاہو تو مجھے صدر شائریکا بھی کہہ سکتے ہو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔''

اس نے پھر کچھ نہیں کہا لیکن میں نے اس کے انداز میں بے یقینی ضرور محسوس کی تھی۔ پھر اس نے کسی کو آواز دی اور ایک مریل سا آدمی اندر آ گیا۔

''پروفیسر کے ساتھ جاؤ۔''

کمرے سے نکل کر میں ایک ہال میں آئی جس میں لفٹ تھی اور اس کے ذریعے نیچے ایک اور ہال میں پہنچی جہاں ایک دروازہ تھا جو ایک لمبی کوریڈور میں کھلتا تھا۔ اس سے گزر کر ہم سڑک پر آ گئے تو میں نے دیکھا کہ بلڈنگ دریا کے کنارے تھی۔ سڑک پر وہی گاڑی کھڑی تھی جس میں مجھے لایا گیا تھا۔ اس شخص نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے بیٹھنے کے بعد گاڑی چل پڑی۔

صبح کے ناشتے کے بعد جنیفر نے تمام سیاحوں کو ایک خوب صورت ٹورسٹ بس میں سوار کرایا اور کچھ لمحوں کے بعد بس چل پڑی حسین ترین راستے سیاحوں کو خود میں سمیٹ رہے تھے۔ میں نے پورا شیڈول اور نقشہ نکال کر گھٹنوں پر پھیلا لیا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں جھیل بالائن کو سیوفوک کے مقام پر لانچ کے ذریعے عبور کرنا تھا اور اس کے دوسرے کنارے پر پھر بس میں سوار ہونا تھا پھر گراز کے مقام پر سرحد پار کر کے آسٹریا میں داخل ہونا تھا اور ویانا پہنچنا تھا۔ راستے میں میئرلنگ کا اسٹاپ تھا اور یہیں سے میرا کام شروع ہوتا تھا۔ یعنی ان لوگوں کے درمیان سے غائب ہونا تھا۔ یعنی اس اسٹاپ پر ایک کار مجھے ملنی تھی جو مجھے وہاں سے لے جائے گی۔

میں انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ لاؤڈ اسپیکر پر جنیفر کی آواز سنائی دی۔

''ہم جھیل بالائن پہنچ رہے ہیں اس میں ہمیں لانچ پر لمبا سفر کرنا ہے دوسرے کنارے سے پھر بس میں سوار ہونا ہے۔ سب سے اہم خبر یہ ہے کہ یہاں سے میرا اور آپ کا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔ اب ایک دوسری گائیڈ آپ کو آگے لے جائے گی۔ آپ کا شکریہ آپ نے میرے ساتھ بہترین تعاون کیا۔''

سیاح اس کی تعریف کرنے لگے پھر وہ میرے قریب آ گئی۔

''شکریہ پروفیسر اور اب آپ کی نئی گائیڈ'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہ تیسرا بم دھماکا تھا جو میرے ذہن میں ہوا۔ گائیڈ کے یونیفارم میں جو خوب صورت لڑکی تھی وہ ایزونا تھی۔ سو فیصدی ایزونا جسے تصویر کے ذریعے میرے ذہن میں فیڈ کر دیا گیا تھا۔

میں نے اسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اپنی عمر سے بہت آگے نظر آتی تھی۔ چہرے پر نوجوانی کی شگفتگی کی جگہ گہری سنجیدگی اور پختگی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں کرختگی تھی۔ وہ ایک انقلابی ماں کی بیٹی تھی اس نے مجھے دیکھا اور نہ جانے کیوں کئی سیکنڈ تک مجھ پر نظر جمائے رہی۔

جنیفر سے مجھے کوئی خاص رغبت نہیں تھی لیکن لانچ میں وہ زیادہ تر میرے قریب ہی رہی۔ اس نے ایک بار بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی بلکہ ایک طرح سے لاپرواہ ہو گئی۔ دوپہر تک یہ سفر جاری رہا پھر لانچ کنارے لگ گئی۔

ایزونا ایک تجربے کار گائیڈ کی طرح مسافروں کو آگے کے بارے میں بتانے لگی۔ تو میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔

''خوب صورت بچی اس طرح مسافروں کو گائیڈ کرتے ہوئے تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

میں نے کانپتی ہوئی بوڑھی آواز میں کہا۔ اس نے سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھا لیکن کچھ نہ بولی۔ میں نے دوبارہ کہا۔

''مجھے اچھا کھانا کہاں ملے گا۔'' تب اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور میں اس طرف چل پڑی۔ ایک چھوٹا سا کیفے تھا لیکن حیران کن شے اس کے نزدیک کھڑی جیگوار تھی۔

میں نے ایک سرسری نظر اس طرف ڈالی اور دل چاہا کہ اسے پکڑ کر زمین پر بیٹھ جاؤں۔ ایزونا کو اس نے تصویروں میں دیکھا تھا اور نا کی گارس کو۔ ایزونا گائیڈ کے روپ میں نظر آ گئی تھی اور نا کی گارس ڈرائیور کی سیٹ پر جگیوار میں۔

یہ کون سا نا کی گارس ہے۔ کمبخت ڈینس آرگو نے تو بڑے وثوق سے کہا تھا کہ اسے اسپین میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ پھر ڈینس نے کچھ اور بھی کہا تھا جس کی تفصیل سامنے نہیں آ سکی تھی اور اب یہ نا کی گارس میرے سامنے موجود تھا گویا دونوں باپ بیٹی میرے قریب موجود تھے۔

اچانک گارس نے رازدارانہ طور پر مجھے اشارہ کیا اور مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ یہ مجھے کیا جانے۔ بس اس طرح کے معاملات معمولی ذہنوں کے حامل نہیں ہوتے۔ پتا نہیں اس نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ پھر بھی میں اس کے قریب پہنچ گئی۔

''ہیلو۔'' اس نے کہا۔

''ہائے۔''

''تم یہیں سے واپس لوٹ جاؤ ہمارے ساتھ آگے مت جاؤ۔'' وہ بولا۔

''کیوں؟'' میں نے کہا۔

''آگے تمہاری جان کو خطرہ ہے۔''

''کس سے..... اور تم.....'' میں نے آگے کچھ کہنا چاہا لیکن اس وقت ایزونا ہمارے قریب آ گئی۔

''ارے پروفیسر، تم لنچ نہیں کر رہے۔'' یہ کہہ کر اس نے تیکھی نظروں سے گارس کو دیکھا۔ گارس کچھ نروس سا نظر آیا تھا۔

میری نگاہوں نے کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ان باپ بیٹی میں کچھ کھنچاوٹ ہے اور یہ بہت عجیب تصور تھا۔ میں جانتی ہوں کہ حکومت شائریکا نے ہی سوچی آرگنیو یا لمپارنو سے رابطہ کر کے نا کی گارس کو اس کی بیٹی کی محبت نکال لانے کی بات کی ہوگی اور اس کے ایما پر میرے ذریعے یہ کام شروع کیا گیا تھا۔ میری دوسری مہمات کی طرح یہ مہم بھی اس پیمانے کی تھی اور اس کا تعلق بھی ایک بین الاقوامی خطرے سے تھا۔ میری ذمے داری تھی کہ میں نا کی گارس اور اس کی بیٹی کو نکال لاؤں اور اس سلسلے میں یہ دلچسپ ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی لیکن سارے کردار الجھے ہوئے تھے، جن میں، میں بھی شامل تھی۔ اول تو اس بار مجھے ایک عجیب و غریب شے بنا دیا گیا تھا۔ یعنی ایک مست شباب لڑکی کو بوڑھا مرد۔ مسٹر ماتزے سے صاف کہہ دوں گی کہ آئندہ اس طرح کی احمقانہ پلاننگ کبھی نہ کریں۔ مجھے ایک بوڑھے مرد کی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے نہ جانے کیسی کیسی مشکلات سے یہ کردار نبھا رہی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہاں تو باوا آدم ہی نرالا نظر آ رہا ہے۔

نمبر ایک نا کی گارس کی بیوی لٹیا ایمبروس قتل کر دی گئی تھی اور اس کی ایزونا کمیونسٹ خیالات کی حامل تھی۔

بے شک وہ ماں کی موت کے بعد باپ کی طرف رجوع ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ مغربی جرمنی آ جانا چاہتی تھی جہاں سے شائریکا کے مفادات کی نگرانی کرنی تھی اور مشرقی جرمنی کسی قیمت پر انہیں وہاں سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

ڈینس آرسنا کی گارس کے قتل کی اطلاع ملی تھی۔

آرس کا کہنا تھا کہ شمسی توانائی کے صول کے لیے جو جدوجہد ہو رہی تھی وہ فراڈ تھی اور نا کی گارس ایسا کوئی سائنسداں نہیں تھا، اومائی گاڈ۔ سارے کا سارا کھیل غلط تھا۔

نا کی گارس زندہ تھا، یہ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اور یہ میں نے دونوں کے انداز میں تھوڑی سی کشش محسوس کی تھی، اوف! اور اب مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بھی ان کی نظروں میں مشکوک ہو گئی۔ ابھی تک مجھے جو بھی افراد ملے تھے انہوں نے مجھے پروفیسر آرلینیوس سمجھا تھا لیکن لگ رہا تھا کہ یہ تماشا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔

دل تو چاہا کہ مسٹر ساترے سے مل کر ساری سچویشن بتاؤں اور کہوں کہ پاپا میری جان اس بار تم بھی دھوکا کھا گئے۔ کمپیوٹر پرتم نے جو شکل میرے سامنے پیش کی اور جس نے کہا کہ نا کی گارس شمسی توانائی کے حصول کا ماہر ہے۔ اس نے تمہیں بے وقوف بنایا تھا۔ نا کی گارس کچھ بے ضرر مگر اس پائے کا سائنس دان نہیں ہے کیوں اس کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے اور مجھے جس اہم مشن پر تم نے بھیجا ہے اس سے دونوں کردار اس وقت موجیں کر رہے ہیں اب بتاؤ کیا کروں۔

پھر ایک غرور سا میرے اندر ابھر آیا۔ میں خود میں آئندہ کے فیصلے کیوں نہ کر دوں۔ اپنی اس کمزوری کا میں اعتراف کیے بغیر نہیں رہوں گی کہ اب میری آنکھیں اپنے اس پاس موجود یہ شخص میں عمران تلاش کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ڈینس آرکو میں بھی میں نے عمران کی جھلکیاں تلاش کی تھیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ مجھے عمران سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے تو الہ دین درکار تھا۔ وہ کسی بھی روپ میں ہو۔

''آیئے پروفیسر! انہوں نے گائیڈ کی حیثیت سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور میرے بڑھاپے پر ترس کھاتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور کیفے کی طرف بڑھ گئی۔

اندر نیم تاریکی تھی۔ بہت بڑا ہال تھا جسے لکڑی کے پارٹیشنوں سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ بہت ہی گھٹیا قسم کی لکڑی کی میزیں اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے۔

ایزونا میرا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھتی گئی پھر ایک میز کے پاس رک گئی۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایک ویٹر نے آرڈر لیا اور چلا گیا۔ ایزونا مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''پروفیسر آرلینیو۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ پھر بولی۔

''جو تم نہیں ہو۔'' میں سرد نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ پھر بولی۔ ''لیکن تم باکمال ہو۔ رضیہ تمہیں ایک وارننگ دی گئی ہے۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ کہیں سے بھی تم پر جان لیوا وار ہو سکتا ہے۔''

''اوہ، تب تو وہ ویٹر جو کھانا لینے گیا ہے۔ کھانے میں زہر ملا کر بھی لا سکتا ہے۔ اس لیے میری بھوک اڑ گئی ہے اور یہاں لانے کا شکریہ۔'' میں فوراً اٹھ گئی۔ اس نے کچھ لینے کے لیے منہ کھولا لیکن میں تیزی سے باہر نکل آئی۔ پے در پے ذہنی جھٹکے لگ رہے تھے اور مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

ابھی میں کچھ قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ میں نے ایزونا کو بھی باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ باہر نکل کر اس نے شاید میری ہی تلاش میں نظریں دوڑائیں پھر کچھ لمحہ رک کر اس نے ایک طرف قدم بڑھا دیئے۔ یہ پیلے رنگ

کی گودام نما عمارت تھی جس میں کئی ٹوٹے دروازے نظر آرہے تھے۔ وہ انہی دروازوں میں سے ایک کو کھول کر اندر چلی گئی۔ میں اپنا تجسس کیسے روک سکتی تھی چنانچہ میں بھی اس طرف بڑھ گئی۔

یہاں دور دور تک کوئی موجود نہیں تھا۔ میں احتیاط سے قدم بڑھاتی، دروازوں کے قریب پہنچ گئی۔ ابھی میں ایک دروازے کو کھول کر اندر جھانکنے کی تیاری ہی کر رہی تھی کہ اچانک اس کے برابر کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی وڈیو گیم کے بمپنے کی طرح سر جھکائے نکلا اور ٹکر مار کر مجھے گرانا چاہا لیکن میں نے ایک ماہر مینا ڈور کی طرح اس کی گردن پکڑ کر اس کا رخ دیوار کی طرف کر دیا۔ اگر وہ پوری طاقت سے دیوار پر ہاتھ ٹکا کر اپنا چہرہ دیوار سے ٹکرانے سے نہ روک لیتا تو اس کے چہرے کا بھرتا بن گیا ہوتا۔ وہ خود کو روک کر پلٹا اور پھر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن میرا موڈ پہلے ہی کافی خراب تھا۔ بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کو دل چاہ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے پاؤں چلایا۔ میری ٹھوکر اس کے پیٹ پر پڑی اور کچھ اس طرح پڑی کہ کمال ہو گیا۔ وہ زمین سے دو فٹ اونچا اچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور اس کے حلق سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اس وقت مجھے اور خوشی ہوئی جب دوسرے دروازے سے دوسرا دنبہ نکلا اور اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ یہ کچھ نئے طرز جنگ کا ماہر تھا۔ دو تین بار اپنی جگہ سے اچھلا اور پھر میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں نے بے شک اپنی جگہ چھوڑ دی لیکن میدان جنگ وسیع نہیں تھا۔ اس کے اسپینش اسٹائل کے جوتے میرے کندھے کو چھوتے ہوئے نکل گئے اور مجھے کافی زور کی چوٹ لگی۔ دوسری طرف وہ نیچے زمین پر رکا اور رک کر اس نے اپنے لباس سے ایک چاقو نکال لیا۔ چمکدار چاقو کو گھما کر اس نے ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور میری طرف لپکا لیکن اسی وقت ڈز ڈز کی آوازیں آئیں۔ بہت ہلکی آوازیں تھیں لیکن میرے کان ایسی آوازوں کی شناخت رکھتے تھے۔ یہ انتہائی نفیس سائیلنسر لگے ریوالور سے چلائی ہوئی گولیوں کی آوازیں تھیں۔ دونوں گولیاں حملہ آور کے دل کے مقام پر لگی تھیں۔

میری تو جان بچ گئی لیکن وہ بالکل خاموشی سے آواز نکالے بغیر مر گیا۔ تب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ایزونا اپنا ننھا سا جرمن بورگون پھونک مار کر اپنے لباس میں رکھ رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ اس کا شکار مر گیا ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر تردد کی لکیر تک نہیں تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بہت آگے کی چیز ہے۔

''ہمارے پاس بالکل وقت نہیں ہے پروفیسر چلو جلدی چلو۔''

اس نے پھر آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب ہمارا رخ بس کی طرف تھا، بس کے مسافروں نے بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ ایزونا بھی گائیڈ کی حیثیت میں پہنچ گئی تو ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کر دی۔

☆

ہم سوپرون پہنچے تو اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہمیں سرحد پار جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ صرف رومانیہ کے دو باشندوں کو پکڑ لیا گیا جس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بیڈن میں داخل ہوئے اور بس ہوٹل کے ساتھ رک گئی۔ میں بھی ہوٹل میں داخل ہو گئی پتا نہیں کیوں اب اس سفر سے اکتاہٹ ہو گئی تھی۔

اچھا صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ ایک میز پر بیٹھ کر میں نے کافی طلب کی اور انتظار کرنے لگی۔ کچھ لمحوں کے بعد ایک ویٹر نے خوبصورت ٹرے میں کافی اور اسٹینک اسٹینڈ [illegible] اسٹینک اسٹینڈ کی ایک پلیٹ میں ایک لفافہ اور لفافے کے اوپر ایک خوب صورت چابی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ویٹر کی طرف دیکھا تو وہ پر ادب لہجے میں بولا۔

''یہ آپ کے لیے ہے میڈم۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں چیزیں جیبوں میں رکھ کر اطمینان سے کافی پینے لگی لیکن میرے من میں کھد بد ہو رہی تھی۔ کافی کا پورا مگ خالی کر کے میں اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ روی سے چلتی آگے بھی۔ چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ ایک دبلی پتلی لڑکی میرے سامنے سے گزری۔

''سنو، میں نے اسے روکا تو لڑکی رک گئی۔ ''یہ تیرہ رابنس ٹریسے کتنی دور ہے؟''

''دو بلاک آگے جاؤ پھر بائیں ہاتھ دیکھو۔'' لڑکی نے کہا۔

''پھر کیا کروں۔'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''شرم نہیں آتی بابا جی۔ بوڑھے ہو کر لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہو۔'' اس نے نتھنے پھلاتے ہوئے کہا اور بس جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ واقعی مجھے شرم آنی چاہیے۔

فٹ پاتھ پر آ کر میں چلتی رہی، میرے اردگرد کوئی مشکوک آدمی نہیں تھا۔ کاغذ کے ساتھ جو چابی تھی وہ کسی کار کی تھی اور کاغذ پر ٹریسے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ دوسرا بلاک ختم ہوا تو پتھر کی ایک بلڈنگ پر 13 روبنس ٹریسے لکھا نظر آیا۔ اس کے سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ میں کار کے پاس پہنچ گئی۔ آس پاس سناٹا تھا۔ میں نے چابی نکال کر دروازے میں لگائی اور دروازہ کھل گیا لیکن دروازہ کھول کر میں سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک پیچھے آہٹ سنائی دی اور میں پلٹی لیکن اسی وقت ایک زوردار ضرب میری گردن کے نیچے ہڈی پر پڑی اور میرے حلق سے کراہ نکل گئی۔ یہ ضرب میرے سر کی پشت پر لگائی گئی تھی۔ لیکن پلٹنے سے یہ میری گردن پر لگی تھی۔ اگر تھوڑی سی اوپر لگتی تو دانتوں کا صفایا ہو گیا تھا۔

وہ دو افراد تھے اور مجھ پر دوبارہ حملے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک تیز روشنی میں نہا گئے۔ یہ روشنی ایک اور کار کی تھی جو اس طرف آ رہی تھی۔ میں انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی لیکن وہ دوسری کار سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے۔ دوسری کار میں پتا نہیں کون تھا لیکن اس نے میری طرف توجہ نہیں دی اور جس رفتار سے آ رہا تھا اسی رفتار سے آگے بڑھ گیا۔

اب میں کسی اور حملے کے لیے تیار تھی۔ کوئی تین منٹ تک میں انتظار کرتی رہی ان بہادروں کا۔ لیکن وہ نہ آئے۔ اپنی فطری جبلت کے تحت میں ان سے مقابلے کے لیے تیار تو تھی لیکن میری پسلی کی ہڈی سخت درد کر رہی تھی۔ اب یہاں سے تو آگے بڑھوں۔ چنانچہ میں نے کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھا دیا۔ کوئی نصف فرلانگ چل کر میں نے رفتار سست کی اور گردن گھما کر کار کے پچھلے حصے کی طرف دیکھا تو مجھے جھرجھری آ گئی۔ پچھلی سیٹ پر ایک انسانی جسم پڑا ہوا تھا۔

شاید لاش!

اس وقت کار کو طوفانی رفتار سے آگے بڑھانے میں صرف میرے اضطراری عمل کا ہاتھ تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کس سمت جا رہی ہوں۔ بس دل میں یہ تھا کہ کسی سنسان جگہ پہنچ کر کار روکوں اور دیکھوں کہ پیچھے کون ہے۔ زندہ ہے یا مردہ۔

پھر کار شہر سے باہر نکل آئی اور میں نے جنگل دیکھا۔ درختوں اور ان کے درمیان جھاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ میں کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگی۔ پھر میں نے ایک جگہ کار روک دی۔ قرب و جوار کے ماحول کا جائزہ لے کر میں نیچے اتری اور میں نے پچھلا دروازہ کھول کر اس انسانی جسم کو دیکھا۔ وہ ہمارے ساتھ بس میں سفر کرنے والا ایک نوجوان سیاح ہی تھا۔ اس کی پیشانی میں گولی ماری گئی تھی جس سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ لیکن کار میں خون نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے کہیں اور ہلاک کر کے کار میں ڈالا گیا تھا۔

لیکن یہ کون ہے اور اسے کیوں قتل کیا گیا ہے۔ شکل بالکل شناسا نہیں تھی۔ لاش کو کار میں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ واپسی کے لیے کار کی ضرورت بھی تھی۔ پھر اپنی حفاظت بھی ضروری تھی۔ پولیس وغیرہ کی مصیبت آ گئی تو عذاب میں گرفتار ہو جاؤں گی اور سارا پلان چوپٹ ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے کار سے اتر کر اور کچھ دور جا کر ان جھاڑیوں کو دیکھا۔ قدم آدم جھاڑیوں میں اگر لاش کو پھینک دیا جائے تو کافی وقت نکل جائے گا۔ جب تک بدبو نہیں پھیلے گی کسی کو اس بارے میں نہیں معلوم ہوگا اور اس دوران میں کہیں سے کہیں نکل گئی ہوں گی۔

مرنے والا کافی وزنی تھا لیکن میں اسے نکال کر جھاڑیوں میں لے گئی اور پھر معذرت کے ساتھ اسے جھاڑیوں میں ڈال کر واپس چل پڑی۔ راستے بھر اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ واقعات تیزی سے پیش آ رہے تھے لیکن بس ایک بات لاجواب تھی۔ میرے اردگرد بڑے بڑے ذہین بلکہ فطین کردار بکھرے ہوئے تھے لیکن ابھی تک کسی کو یہ شبہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں ایک گزرا ہوا وقت نہیں بلکہ ایک دوشیزہ ہوں۔ جو بہت سوں کی نیندیں لوٹ سکتی ہے۔

ہوٹل پہنچ گئی۔ کوشش کر کے چھپتی چھپاتی اوپر پہنچی تھی۔ راہداری میں بیمار بلب جل رہے تھے، میں اس کمرے پر پہنچی جس میں ایزونا ٹھہری ہوئی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دروازہ اندر سے مقفل نہیں تھا۔

میرے ذہن میں خطرے کا الارم بج اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے اپنی مالک کو آواز دی۔ اس کا اپنا کام آ گیا تھا اور جب اینی پارک میرے اندر جاگ گئی تو میں نے دروازے کو آہستہ سے اندر دھکیلا۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ سنگھار میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی بیڈ پر پڑ رہی تھی اور اس بیڈ پر لاک سٹ لیٹا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ریوالور بھی نمایاں تھا۔ میں نے بھی چھلانگ لگائی اور اس طرح تاک کر اس پر نشانا لگایا کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

لیکن میں نے اس کے سینے میں وہ بڑا سوراخ دیکھ لیا تھا جو گولی سے نہیں خنجر وغیرہ سے بنا تھا اور دل کے مقام سے ہٹ کر تھا۔ ورنہ شاید وہ کبھی کا مر چکا ہوتا۔ سوراخ سے کافی خون بہہ چکا تھا اور اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''تم لاک سٹ ہو نا؟'' میں نے اس پر جھک کر کہا۔

''ہاں، کولکیٹ روک سٹ۔'' وہ نحیف آواز میں بولا۔

''تمہیں کس نے زخمی کیا ہے؟''

''ڈینس، ڈینس آرکو..... نے.....!''

''ایں؟'' میں حیرت سے اچھل پڑی۔

''ہاں۔''

''میں کچھ لمحوں کا مہمان ہوں۔ زور سے نہیں بول سکتا۔ اپنا چہرہ میرے قریب لاؤ پروفیسر۔'' اس نے کہا اور میں اس کے قریب ہو گئی۔

''مجھے جانتے ہو پروفیسر آرلینو۔'' اس کی کھرکھراتی آواز سنائی دیا۔

''ہاں۔'' میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

''یہ بہت بڑی سازش تھی۔ لٹیا ہلاک کر دی گئی۔ تب بھی نازیوں کو ہمارے خلاف مخبری ہوتی رہی۔ ہمیں غدار کی تلاش تھی۔ کئی بے گناہ مارے گئے لیکن اصل غدار ڈینس آرکو تھا۔ تمہارے ذریعے نا کی گارس اور اس کی لڑکی ایزونا کو اسپین میں لانے کا منصوبہ اس کا تھا۔ اصل میں ایزونا اور ڈینس آرکو کے درمیان گہرے تعلقات ہیں اور دونوں تمام مراحل سے گزر چکے ہیں۔ یہ بات ایزونا کی ماں لینا بھی جانتی تھی لیکن اسے ان تعلقات پر

اعتراض نہیں تھا بلکہ اسے زرکو پر بھروسا تھا کیونکہ وہ اسے اپنا ہم خیال سمجھتی تھی اور دونوں اسپین میں ایک نئی نازی پارٹی بنانے کی تیاری کر رہے تھے۔

''اور وہ خود برسر اقتدار آنا چاہتے تھے۔'' میں نے کہا۔

''بالکل ایسا ہی تھا۔''

''آگے بولو۔''

''دوسرے یہ نہیں چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے لٹیا کو ختم کروا دیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ لٹیا نے اس منصوبہ کی پوری تفصیل مائیکرو فلموں کے ساتھ کانسی کے ایک چھوٹے سے مجسمے میں محفوظ کر دی تھی جسے اس نے نیلا بھیڑیا کا نام دیا تھا۔ یہ مجسمہ بھڑیے کا تھا جس میں خوب صورت نیلاہٹ دی گئی تھی۔ لٹیا نے اس مائیکرو فلم میں نئے نازی منصوبہ میں شریک دوسرے لوگوں کی تفصیل بھی محفوظ کی تھی۔ یہ پوری منصوبہ بندی تھی جو آج بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے اور ڈینس آرکو آج بھی اسی خواب میں ڈوبا ہوا ہے اور وہ اب بھی اس منصوبے کو کامیاب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

''تاکہ اپنی محبوبہ کو برسر اقتدار لانے کا تحفہ لے سکے۔'' اس نے کہا۔

''اور خود بھی۔''

''گویا وہ اسپین میں نازی ازم کو زندہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔''

''سو فیصدی۔''

''اور نا کی گارس۔''

''وہ محض ان کا آلہ کار ہے اور خاص طور سے تمہارے ذریعے ایزونا کو سرحد پار کرانا چاہتا ہے۔''

''کیا اس منصوبے میں برلن شریک ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ یہ اس کا اپنا منصوبہ ہے۔ نا کی گارس اس بارے میں بہت خوفزدہ ہے۔ وہ اپنی بیٹی تک سے ڈر رہا ہے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ برلن سے ڈینس کو امداد حاصل نہیں ہے۔''

''ہاں میری معلومات مکمل ہیں۔ اس سلسلے میں کلیدی کردار ایک پراسرار لڑکی جنیفر کا ہے جس کے بارے میں ابھی تک کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اوکس طرف سے اس..... اس.....!''

''تمہارے پاس یہ معلومات؟'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ کھانسنے لگا دوسرے لمحے خون کی ایک پچکاری سی اس کے حلق سے نکل کر سینے پر گری۔

میں نے اسے سنبھالا دینے کی کوشش کی اور کہا۔

''ہمت کرو، مجھے یہ بتاؤ اب یہ لوگ یہاں سے کہاں جانا چاہتے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ سب کچھ..... ساری پلاننگ..... جنیفر..... جنیفر..... خفیہ پیغام..... گڑبڑ، گڑبڑ.....''

اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

کام ختم ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر چادر ڈال دی اور وہاں سے نکل آئی۔ اس کے بعد میں سیدھی نا کی گارس کے کمرے میں گئی تو ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ وہ جا چکا ہے۔ دونوں میں سے ایک بات ہوئی تھی۔ نا کی گارس اور ایزونا بھاگ گئے تھے میں ڈینس آرکو انہیں لے گیا تھا۔

(اینی پارک..... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔
اُس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

گفگو

حمیرا خان

سانپوں کی سرزمین سے ایک خلائی مخلوق کی حیرت ناک کتھا

آسمان سے دھیرے دھیرے نیچے اترتی وہ چیز کسی دھات کی بنی ہوئی محسوس ہوتی تھی، یہ وہ جگہ تھی جہاں دور دور تک انسانی آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا اس لیے اس چیز کی طرف توجہ دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ ہوا میں تیرتی ہوئی وہ زمین پر ٹک گئی وہ چاروں طرف سے بند گول مٹول چیز جس میں بظاہر دروازہ ہونے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن چند لمحوں بعد ہی اس میں ایک طرف بڑا سا سوراخ دکھائی دینے لگا اور دروازے میں سے ایک عجیب الخلقت چیز اچھل کر باہر نکلی، اس نے باہر نکل کر ایک جگہ دباؤ ڈالا تو دروازہ ایک بار پھر غائب ہوگیا۔ وہ انسانوں کی طرح دو پیروں پر کھڑا تھا لیکن اسے کسی طور بھی انسان نہیں کہا جا سکتا تھا، اس کے پورے بدن پر لمبے لمبے بال تھے اور پشت پر بندر کی دُم جیسی ایک لمبی سی دُم تھی لیکن وہ بندر بھی نہیں تھا وہ زمین کی مخلوق نہیں تھی، وہ اپنی بڑی بڑی گول آنکھوں میں حیرت اور تجسس لیے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر کچھ فیصلہ کرتے ہوئے ایک طرف چل پڑا دور تک ریت ہی ریت دکھائی دے رہا تھا تبھی گفگو کی نظر زمین پر رینگتے ہوئے زہریلے سانپ پر پڑی وہ اپنی جگہ ساکت ہو کر سانپ کو دیکھنے لگا۔ ”تو یہ ہے اس سیارے کی مخلوق ان کو جاننے کے لیے مجھے بھی ان جیسا بننا ہوگا“ گفگو نے سوچا، سانپ رینگتا ہوا اس سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا گفگو نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں یکا یک اس کے جسم کی ہیئت تبدیل ہونا شروع ہوگئی اور کچھ ہی لمحوں میں گفگو کی جگہ ایک بڑا سا سانپ بیٹھا دکھائی دینے لگا گفگو رینگتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔

☆.....☆

آگے پیچھے چلتی ان تین گاڑیوں میں سب سے آگے والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ آکاش نے سنبھالی ہوئی تھی، سانولی رنگت مگر روشن آنکھوں والے آکاش کے اندر کچھ کرنے کی لگن اس کے ہر انداز میں دکھائی دیتی تھی، جبکہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھامس بیٹھا تھا وہ پینتالیس سال کا ایک پرکشش مرد تھا پچھلی سیٹوں پر ایملی اور کیرن براجمان تھیں، ایملی اگرچہ سمارٹ اور خوبصورت تھی اور اس کے شولڈر کٹ بھورے بال اس کے چہرے پر بڑے بھلے لگتے تھے لیکن اگر مقابلہ کیا جاتا تو کیرن اپنی فربہی مائل جسامت کے باوجود ایملی سے کہیں زیادہ پرکشش تھی شاید یہ اس کے چہرے کی معصومیت تھی جو اسے ایک الگ طرح کا حسن عطا کرتی تھی۔ تھامس وقفے وقفے سے آکاش سے محوِ گفتگو تھا جبکہ دونوں لڑکیاں کھڑکی سے باہر نظر آتے نظاروں میں کھوئی ہوئی تھیں لیکن وقتاً فوقتاً ان کی طرف سے ہونے والے سوالوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ خاموش ضرور ہیں لیکن ان کی توجہ بہرحال ادھر ہی ہے اور ہونے بھی چاہیے تھی کیونکہ تھامس کا موضوع گفتگو وہی تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ اس وقت انڈیا میں موجود تھے۔ ان کے پیچھے والی گاڑی میں آنند سنگھ، جینا اور علیشا تھے، علیشا آنند کے ساتھ فرنٹ سیٹ سنبھالے ہوئے تھی جبکہ جینا پچھلی سیٹ پر تھی، سب سے پیچھے والی گاڑی میں ولیم اور جیکب تھے اور گاڑی کی پچھلی سیٹوں اور ڈگی میں ان کی ضرورت کا بہت سارا سامان تھا جس میں، کیمرے، ایمرجنسی دوائیں، خیمے وغیرہ کے ساتھ ساتھ کھانے پکانے کا بہت سارا سامان بھی تھا کیونکہ وہ ایک لمبے سفر پر نکلے تھے جس میں انہیں اپنے مشن کی کامیابی تک دور دراز کے ویرانوں میں قیام کرنا تھا، آکاش، آنند سنگھ اور علیشا انڈین تھے جبکہ باقی سب کا تعلق امریکہ سے تھا۔

☆.....☆

گفگو رینگتے رینگتے کافی دور آ گیا تھا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ ابھی تک وہ وہیں ہے جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے ابھی تک ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا تھا، حتیٰ کہ اس سانپ کے بعد سے ابھی تک کوئی اور سانپ بھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ ”کیا اس سیارے پر مخلوق نہ ہونے کے برابر ہے؟“ اس نے حیرت سے سوچا ”یہاں ابھی تک کوئی ترقی نہیں ہوئی؟ یا پھر میں کسی ایسے علاقے میں ہوں جہاں کچھ بھی نہیں ہے؟“ گفگو کے پاس یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات تھے جن کا جواب اسے آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔ فی الحال تو وہ اپنی منزل سے بے خبر آگے اور آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

☆.....☆

گفگو ایک ایلین تھا اور اس کا تعلق ایلفا سینتوری نامی سیارے سے تھا، انسانوں کی طرح ہی وہ لوگ بھی برسوں سے اس تلاش میں لگے ہوئے تھے کہ اگر کائنات کے کسی اور سیارے پر کوئی مخلوق موجود ہے تو کسی طرح سے ان سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔ رابطہ تو ممکن نہ ہو سکا تھا لیکن گفگو اور اس کے ساتھیوں کی برسوں کی محنت رنگ لائی تھی جس کے نتیجے میں وہ آج زمین تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا، جس حد تک ممکن تھا گفگو زمین کے بارے میں معلومات لے کر آیا تھا لیکن جتنی معلومات وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس سے کہیں زیادہ معلومات اسے اپنے ہاتھ لے کر واپس اپنے لوگوں

کے پاس جانا تھا، یہ ایک مشکل کام تھا یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کر پاتا اور اگر معلومات مل بھی جاتیں اور وہ باخیریت زمین سے رخصت بھی ہو جاتا تب بھی اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ واپسی کا سفر خیر خیریت سے گزرتا اور وہ صحیح سلامت اپنی دنیا میں پہنچ پاتا۔ لیکن ہمیشہ سے گنگو جیسے نڈر اور سرپھرے لوگ ہی دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے درج کرتے آئے ہیں۔

☆.....☆

زمین کا دامن بھی ایسے سرپھروں سے خالی نہیں جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی زندگیوں کو خطروں کی نذر کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے، تھامس اور اس کے ساتھیوں کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا بس ان کا کام تھوڑا مختلف تھا گنگو جیسے لوگ اپنے سیاروں سے نکل کر دوسری دنیاؤں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں اور تھامس جیسے لوگ اپنے سیارے پر موجود خطرناک مخلوقات کے بارے میں دنیا کو باخبر کرنے میں دن رات ایک کیے رکھتے ہیں۔ تھامس اور اس کے ساتھیوں کا تعلق ایک بہت بڑے چینل سے تھا جو کہ انٹرنیشنل سطح پر بے حد معروف و مقبول تھا۔ ان لوگوں کی طرح اور بہت سارے لوگ اس چینل سے جڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا کام مختلف جانوروں کی زندگیوں کے شب و روز کو ڈاکیومینٹری کی صورت میں لوگوں تک پہنچانا تھا۔ اس بار وہ لوگ انڈین سانپوں پر ڈاکیومینٹری بنانے کے ارادے سے یہاں آئے تھے اور ان میں ہر ایک اپنے کام میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔

☆.....☆

تھامس اور اس کے گروپ کو سفر کرتے کئی گھنٹے گزر چکے تھے جب انہوں نے سفر کا آغاز کیا تھا تب سورج مغرب کی بانہوں میں پرسکون نیند سویا ہوا تھا اور اب دنیا کو روشنی سے مالا مال کرنے کے بعد سورج واپسی کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ راستے میں انہوں نے دو جگہ تھوڑی دیر قیام کیا تھا ایک جگہ کھانا کھایا تھا۔ اور دوسری جگہ محض چائے سے شغل کیا تھا۔

''انڈیا میں تین سو سے زیادہ اقسام کے سانپ پائے جاتے ہیں'' تھامس نے گردن موڑ کر ایملی اور کیرن کو بتایا جو اشتیاق اور توجہ سے اسے سن رہی تھیں۔

''لیکن ان میں زیادہ تر وہ سانپ ہیں جو کسی بھی طرح خطرناک نہیں ہیں ہاں جبکہ پندرہ انواع ایسی ہیں جو بہت خطرناک ہیں، اور ان میں بھی چار اقسام ایسی ہیں جن کی وجہ سے سب سے زیادہ اموات ہوتی ہیں، جن میں کوبرا، کریٹ، رسلز وائپر اور سیا وائپر شامل ہیں'' ایملی اور کیرن دونوں اچھی فوٹو گرافر تھیں اور کیمرے کا استعمال بہت اچھے سے جانتی تھیں کئی ڈاکیومینٹریز بھی بنا چکی تھیں لیکن یہ اتفاق ہی تھا کہ ان دونوں میں سے کسی نے بھی ابھی تک سانپ پر بننے والی کسی ڈاکیومینٹری کے لیے کام نہیں کیا تھا اور وہ دونوں انڈیا بھی پہلی بار آئی تھیں جبکہ تھامس یہاں پہلے بھی کئی بار کام کے سلسلے میں آ چکا تھا وہ انڈیا اور یہاں کے جانداروں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتا تھا ویسے بھی ڈاکیومینٹری بنانے کے بعد اس کا دوسرا پسندیدہ کام پڑھنا ہی تھا چاہے وہ کوئی کتاب ہوتی یا انٹرنیٹ پر آنے والا کوئی آرٹیکل۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا بھر کے جانوروں کے بارے میں جانتا تھا جہاں لوگ اس کے علم سے متاثر ہوتے تھے وہاں وہ خود بھی اپنی اس خوبی سے اچھی طرح واقف تھا اور یہی وجہ تھی کہ جونیئرز کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک نامحسوس سا جانے والا احساس تفاخر جھلکنے لگتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ دوسروں کو کمتر سمجھتا تھا اس کا رویہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہت دوستانہ ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ لوگ اس کے ساتھ کام کرنا پسند کرتے تھے۔

☆.....☆

گنگو خاصا تھک چکا تھا اس کو مخصوص وقت میں زمین سے لوٹ جانا تھا لیکن ابھی تک اسے زمین اور یہاں کی مخلوق کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا تھا لیکن دن رات کا فرق اس کے لیے نئی نہیں رکھتا تھا کیونکہ وہ اندھیرے میں بھی بالکل ٹھیک ٹھیک ہر چیز دیکھ سکتا تھا۔ ''اتنی دور آ کر خالی ہاتھ لوٹ جانا مناسب نہیں ہوگا۔ کچھ نہ کچھ حاصل کرنا ہی ہوگا'' گنگو نے اپنے آپ کو سمجھایا اور زیادہ رفتار سے رینگنے لگا۔

☆.....☆

اپنی منزل پر پہنچ کر تھامس اور اس کے گروپ نے خاصا کام کیا تھا۔ بھی تھکن محسوس کرنے کے باوجود خاصے پرجوش تھے اور کسی کا بھی آرام کرنے کا کوئی ارادہ

نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ کھانے سے فارغ ہوتے ہی سب اپنا اپنا بیگ کندھوں پر لٹکائے اِدھر اُدھر بکھر کر علاقے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئے، بیگ میں چھوٹے مگر جدید ترین کیمرے، بیٹریاں اور اسی طرح کی ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔

''ذرا دھیان سے ایملی یہاں بہت خطرناک سانپ پائے جاتے ہیں، انڈیا میں ہر سال تقریباً پچاس ہزار لوگ سانپ کے کاٹنے سے موت کا شکار ہوتے ہیں'' ایملی اس وقت ایک بڑے سے سوراخ کے پاس بیٹھی اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی جب اسے آنند کی آواز سنائی دی تھی اس نے آنند کی طرف دیکھا اور مسکرا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ایملی ہاتھ میں چھوٹا سا روبوٹ لیے ایسی جگہ کی تلاش میں تھی جہاں سانپ کے پائے جانے کا امکان ہو، تاکہ وہ روبوٹ وہاں رکھ دے جس پر کیمرے فٹ کیے گئے تھے اور ریموٹ کے ذریعے اسے اپنی مرضی سے آگے پیچھے اور اوپر نیچے حرکت دی جا سکتی تھی۔ کچھ لمحے ایملی کے پاس کھڑے رہنے کے بعد آنند آگے بڑھ گیا۔ ''کیرن ذرا میرے پاس آؤ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے'' ایملی نے پاس سے گزرتی کیرن کو آواز دی تو وہ اس کے قریب چلی آئی۔

''کہو کچھ ملا کیا؟'' کیرن کے لہجے میں تجسس بول رہا تھا۔

''ابھی تو کچھ نہیں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں ضرور کچھ مل سکتا ہے، میں لیٹ کر یہ روبوٹ کیمرہ اندر رکھتی ہوں جب میں کہوں تو مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچ لینا'' ایملی نے زمین پر منہ کے بل لیٹتے ہوئے کہا پھر دھیرے دھیرے اس تنگ سوراخ میں منہ ڈال کر ہاتھوں اور کہنیوں کی مدد سے آگے بڑھنا شروع کر دیا کیرن اس کے پیروں کے پاس ہوشیار کھڑی منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ'' کچھ ہی لمحوں میں کیرن نے ایملی کی خوف اور حیرت بھری آواز سنی ''مجھے باہر نکالو'' وہ چیخی تھی اور کیرن نے فوراً اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے اسے باہر کھینچ لیا تھا۔

''سر تھامس کس طرف گئے ہیں؟'' باہر نکلتے ہی ایملی نے پوچھا اور پھر کچھ بھی کہے بنا اس طرف دوڑ پڑی جدھر کیرن نے اشارہ کیا تھا۔

''سر مجھے کچھ ملا ہے میرا خیال ہے آپ کو وہ دیکھنا چاہیے'' تھامس، علیشا اور آکاش ایک ہی جگہ پر موجود تھے اور ان کے درمیان کوئی معاملہ زیر بحث تھا جب ایملی کی آواز سے زیادہ اس کے لہجے پر وہ تینوں چونکے تھے اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں ایملی نے اپنا کیمرہ فٹ کیا تھا، کیرن ابھی تک وہیں کھڑی ہوئی تھی یقیناً وہ جاننا چاہتی تھی کہ ایملی نے وہاں کیا دیکھا ہے۔ باہر رکھی چھوٹی سی سکرین پر سوراخ کے اندر کے منظر کو بنا کسی وقت کے دیکھا جا سکتا تھا، وہاں جو کچھ دکھائی دے رہا تھا وہ ان سب کے لیے انوکھا اور دلچسپ تھا، وہ ایک بہت ہی عجیب و غریب قسم کا بڑا سا سانپ تھا، وہ سانپ اس لیے اتنا اہم تھا کہ ایک تو وہ سائز میں خاصا بڑا تھا دوسرا اس کا انداز بہت مختلف تھا اس نے ایملی پر حملہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ عجیب انداز میں کیمرے کو گھور رہا تھا اور پھر سانپوں کے بارے میں ہر طرح کی معلومات رکھنے کے باوجود وہ لوگ سانپ کی اس قسم سے ناواقف تھے جو سامنے دکھائی دے رہا تھا، باقی لوگ بھی ان کے ارد گرد آ کھڑے ہوئے تھے۔ کافی دیر سکرین پر اس کی نقل و حرکت دیکھتے رہنے کے بعد جیسے تھامس کسی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

''میرا خیال ہے اس سانپ کو لیب لے جانا چاہیے اور اس پر ریسرچ ہونی چاہیے'' تھامس نے اپنی فیصلہ نما رائے کا اظہار کیا تو سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کیونکہ قانون کے مطابق وہ لوگ ڈاکیومینٹری تو بنا سکتے تھے لیکن ساتھ انہیں یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ ان کی وجہ سے کسی قسم کی ڈسٹربنس نہ ہو اور نہ جانداروں یا ان کے قدرتی ماحول کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے، کسی جاندار کو ساتھ لے کر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن تھامس اس گروپ کا لیڈر تھا سو اس کی بات اہمیت رکھتی تھی دوسرے وہ سب بھی دل ہی دل میں اس بات کے حامی تھے کہ اس پر ریسرچ کی جانی چاہیے، تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد سانپ کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ فیصلہ ہوتے ہی جیکب اور ولیم سانپ پر قابو پانے اور پکڑنے کا سامان نکالنے کے لیے گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆

گنگو اسی طرح آگے بڑھتا چلا جارہا تھا تبھی اسے کچھ آوازیں سنائی دینے لگی وہ احتیاطاً ایک سوراخ کے اندر رینگ گیا اور چھپ کر باہر کا جائزہ لینے لگا، آنے والے تھامس اور اس کے ساتھی تھے، گنگو بغور ان کا جائزہ لے رہا تھا اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی تھیں اس کی تصاویر اس کے دماغ کے پردے پر بنتی چلی جایا کرتی تھیں جنہیں بوقت ضرورت کچھ چیزوں کی مدد سے دوسرے لوگوں کو بھی دکھایا جاسکتا تھا۔ گنگو وہیں بیٹھا ان لوگوں کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہا وہ ابھی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اسے آگے کیا کرنا چاہیے یہاں رکنا چاہیے یا اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ تبھی اس نے ایملی کو اپنی طرف آتے دیکھا وہ مزید اندر کی طرف کھسک گیا اس انجانی مخلوق سے اسے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد گنگو نے ایملی کو اندر گھستے دیکھا لیکن کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر کرنے کی بجائے چپ چاپ بیٹھا رہا اس نے ایک چھوٹی سی چیز (کیمرہ) جس میں سے روشنی بھی نکل رہی تھی گنگو سے کچھ فاصلے پر رکھ دی اور دوسرے ہی لمحے وہ سوراخ کے منہ سے باہر نکلتی چلی گئی۔ گنگو حیرت سے اس چیز کا جائزہ لیتے ہوئے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ کہیں وہ چیز اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ تو نہیں رکھتی، وہ ایک ٹک کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا تبھی اسے باہر کئی ساری آوازیں سنائی دینے لگیں اجنبی انجانے ماحول کا خوف اس پر اثر انداز ہونے لگا، تبھی ایک لمبی سی چیز اندر آئی اور اچانک وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی پھر وہ گنگو کی طرف بڑھی اور اس نے گنگو کے منہ کو بری طرح جکڑ لیا، وہ ایک طرح کی سنیک سٹک تھی جو پروفیشنل لوگ استعمال کیا کرتے تھے۔

☆.....☆

گنگو کو ایک بڑے سے پنجرے نما چیز میں قید کر کے اس کے پاس کیمرہ فٹ کر دیا گیا تھا جو اس کی ہر ہر لمحہ کی ویڈیو بنا رہا جسے بعد میں ان لوگوں کے کام آنا تھا۔ گنگو سے فارغ ہو کر وہ لوگ ایک بار پھر اِدھر اُدھر پھیل کر مزید جگہوں پر کیمرے رکھنے میں مصروف ہو گئے، رات کافی گزر چکی تھی جب تھامس نے پکار کر سب کو آرام کرنے کی تاکید کی تھی اور پھر ایک ایک کر کے سبھی اپنے اپنے حفاظتی سلیپنگ بیگز میں جا لیٹے تھے، انہوں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا باقی کے دنوں میں انہوں نے مزید کیمرے رکھنے تھے اور ان کیمروں سے بننے والی ویڈیوز کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دھیان رکھنا تھا کہ کبھی کیمرے ٹھیک ٹھیک کام کر رہے ہیں یا نہیں۔

☆.....☆

گنگو اس صورت حال سے بے حد پریشان تھا اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ آخر کو کیا کرے اور کیسے اس قید سے نجات حاصل کرے، بہت سوچنے کے بعد اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی بات آرہی تھی کہ جس مخلوق نے اسے قید کیا ہے اسے بھی ان کے جیسا روپ لینا چاہیے تبھی وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر سکتا ہے اور آخر اس نے اپنی اس سوچ پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆.....☆

صبح سب سے پہلے علیشا کی آنکھ کھلی تھی علیشا اور جینا نے ایک ہی خیمے میں رات بسر کی تھی وہ دونوں بہت اچھی دوست بھی تھیں، علیشا باہر جانے کے لیے اٹھی تو آہٹ سے جینا بھی جاگ گئی، جینا کو جاگتے دیکھ کر علیشا نے مسکراتے ہوئے اسے گڈ مارننگ کہا اور اسے اپنے ساتھ باہر گھومنے کی دعوت دی جو جینا نے بخوشی قبول کر لی اور دونوں اٹھ کر باہر نکل آئیں۔

''کیا خیال ہے سب سے پہلے رات والے سانپ کا دیدار کیا جائے؟'' علیشا کے شرارت سے کہنے پر جینا ہنس پڑی اور دونوں جیکب اور ولیم کے خیمے کی طرف چل دیں، اسی خیمے میں سانپ والا پنجرہ رکھا گیا تھا۔ خیمے میں پہلے داخل ہونے والی علیشا تھی وہ جینا سے باتیں کرتے ہوئے خیمے میں داخل ہوئی تھی لیکن جیسے ہی اس کی نظر پنجرے پر پڑی تھی وہ حیرت کی دنگ ہو کر رہ گئی تھی، پیچھے آنے والی جینا کا بھی یہی حال تھا، وہ پنجرہ جہاں ان سب نے رات ایک سانپ رکھا تھا اس وقت وہاں ایک نوجوان انسان بیٹھا دکھائی دے رہا تھا، دونوں لہرا کے خیمے کے فرش پر گر پڑیں اور [illegible] ہوئیں ان کے گرنے کی آواز نے ولیم اور جیکب کو بیدار کیا، پنجرے کی بجائے ان کی پہلی نظر زمین پر [illegible] پڑی تو دونوں گھبرا کر ان کی طرف دوڑے [illegible] لیے پلٹنے والا ولیم پنجرے میں بیٹھے نوجوان

کو دیکھ کر ساکت رہ گیا تھا، ذرا ہی دیر میں گروپ کے سبھی لوگ پنجرے کے ارد گرد اکٹھے ہو چکے تھے، سب کے چہروں پر تجسس اور حیرت کے ساتھ ساتھ ہلکا سا خوف بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ''ہمارے لوگوں کا ماننا ہے کہ جب سانپ کی عمر سو سال سے اوپر ہو جاتی ہے تو پھر اس میں کوئی بھی روپ لینے کی شکتی آجاتی ہے'' آکاش جھجکتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے مخاطب تھا کیونکہ وہ خود اتنی بے تکی بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا اور اس کے ساتھی بھی سب کے سب پڑھے لکھے سمجھدار لوگ تھے لیکن سچ تو یہ بھی تھا کہ اس وقت سب کی عقل ان کا ساتھ چھوڑے بیٹھی تھی۔ انہوں نے اجنبی نوجوان سے مخاطب ہونے کی کوشش کی مگر وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا تھا۔ یہ ایک بہت ہی عجیب وغریب صورتِ حال تھی جس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا کافی مشکل تھا کچھ کا خیال تھا کہ اس عجوبے کو دنیا کے سامنا لایا جائے تو ساری دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا لیکن دوسری طرف یہ سوال بھی کہ جب یہ بات بتائی جائے گی تو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ انہوں نے سانپ چرایا تھا جو کہ ایک جرم تھا اور پھر قابل غور بات تو یہ بھی تھی کہ سب سے پہلے اس بات کے بارے میں کس کو اطلاع دی جانی چاہیے تھی، ان لوگوں کا وہ سارا دن اسی سوچ بچار اور بحث میں گزر گیا تھا اور فیصلہ پھر بھی نہ ہو پایا تھا انہوں نے نوجوان کے پنجرے میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں ڈال دی تھیں لیکن اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی، رات گئے طے پایا کہ اگلی صبح اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔

☆.....☆

گنگو کے لیے یہ سب بہت پریشان کن تھا، اس نے اس مخلوق کا روپ تو لے لیا تھا لیکن وہ ابھی تک قید میں تھا دن بھر وہ لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو کر شور کرتے رہے تھے (سمجھ نہ آنے کی وجہ سے گنگو کے لیے ان کی باتیں شور ہی تھیں) لیکن کسی نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی اس حوالے سے اسے تھوڑا اطمینان بھی تھا بہرحال یہ تو طے تھا کہ اسے کسی نہ کسی طرح اس قید سے نکلنا ہے اور واپس اپنی دنیا میں جانا ہے، زمین پر رکنے کا جو وقت اس کے پاس تھا اس میں سے بہت تھوڑا وقت اس کے پاس رہ گیا تھا اس وقت سے پہلے پہلے اسے خلائی شٹل تک پہنچنا تھا، اچانک گنگو کی نظر ایک مکوڑے پر پڑی یہ اس کے لیے ایک اور نئی مخلوق تھی وہ سب بھول بھال کر توجہ سے مکوڑے کو دیکھنے لگا، اور دیکھتے دیکھتے جیسے اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا، اس نے دیکھا کہ مکوڑا بڑے آرام سے پنجرے کے اندر داخل ہو گیا تھا، دوسرے ہی لمحے گنگو نے روپ بدلا اور اب اس کی جگہ ایک مکوڑا دکھائی دے رہا تھا، گنگو تیزی سے پنجرے سے باہر آیا اور پھر خیمے سے نکلتا چلا گیا کچھ دور جا کر وہ اپنے اصل روپ میں آگیا کیونکہ اسے جلد از جلد اپنے شٹل تک پہنچنا تھا اور اتنا تیز سفر وہ اپنے اصلی روپ میں آکر ہی کر سکتا تھا، کچھ گھنٹوں بعد وہ زمین پر الوداعی نظر ڈالتا ہوا شٹل میں داخل ہو گیا اور کچھ ہی دیر میں شٹل حرکت میں آگیا، اجنبی مہمان گھر کو لوٹ چکا تھا، اگرچہ اس کے اس سفر کو بہت زیادہ کامیاب نہیں کہہ سکتے تھے لیکن پھر بھی اس کے پاس اپنے لوگوں کو بتانے کے لیے بہت کچھ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جانتا تھا اگلی بار وہ اس سے زیادہ بہتر طور پر اپنا کام کر سکتا ہے۔

☆.....☆

اگلی صبح ان سب کے لیے ایک بار پھر ڈھیروں حیرت لے کر آئی تھی کیونکہ پنجرہ بالکل خالی تھا نہ وہاں کوئی سانپ تھا نہ ہی انسان، ''وہ کون تھا؟ کیا تھا اور کہاں غائب ہو گیا؟'' اس سوال کا جواب ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا، آخر وہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور فیصلہ کیا گیا کہ اس بارے میں کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا جائے گا لیکن ان سب کے ذہنوں سے اس واقعے نے کبھی محو نہیں ہونا تھا، اور وہ ہمیشہ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے بے چین رہتے کہ کیا انہوں نے کوئی خواب دیکھا تھا؟ لیکن اتنے لوگ ایک ساتھ ایک خواب کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ تو اگر وہ سچ تھا تو وہ کیا تھا کوئی سانپ؟ انسان یا پھر روپ بدلنے والا سانپ؟ یا پھر وہ کوئی اور ہی مخلوق تھی؟ دوسری طرف گنگو بھی زمین کی مخلوق کے بارے میں سوچتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ دو سیاروں کی مخلوق آمنے سامنے آئی تھی لیکن اس بات کی خبر زمین پر کبھی کسی کو نہیں ہونے والی تھی اور یہ راز یونہی انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہنے والا تھا۔

☆☆

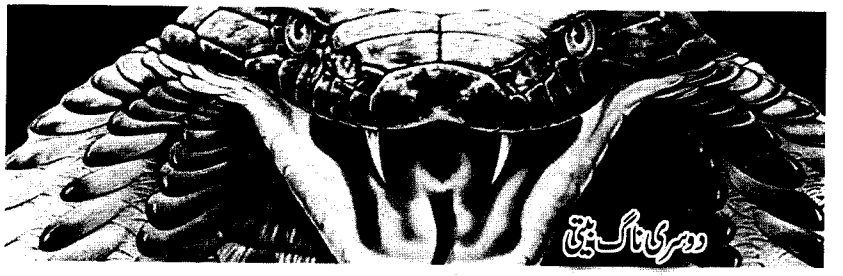

ساتواں منکا

ناصر خان

سانپ اور انسان کی دوستی کی ایک منفرد کتھا

چاندنی رات نے فسوں کا جال کو پوری طرح اپنے اثر میں لے رکھا تھا، چاندنی رات یقیناً خوبصورت ہوتی ہے لیکن یہی رات اگر جنگل میں اتری ہو تو چاہے کتنی بھی خوبصورت کیوں نہ ہو عجیب اسرار میں لپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے گٹھے ہوئے مضبوط جسم والا وہ شخص زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں جنگل کے بیچ و بیچ بنی اس جھیل پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے لب دھیرے دھیرے کوئی جاپ کرنے میں مصروف تھے۔ پچاس پچپن سال کا وہ شخص اس پرسرار ماحول کا حصہ بن کر خود بھی خاصا پرسرار لگ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتا یوں دیکھنے میں وہ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا تھا لیکن اس کے اندر کی بے چینی کی جھلک اس کے چہرے پر صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے کسی بات یا کسی چیز کا انتظار ہے اور پھر جیسے اس کا انتظار ختم ہو گیا بوڑھے کا چہرہ خوشی اور جوش کے احساس سے تمتما اٹھا ''آج میں ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا'' بوڑھے نے جیسے خود کو یقین دلایا اس کے لب اور تیزی سے حرکت کرنے لگے تبھی ایک عجیب منظر دکھائی دینے لگا آسمان سے سات سانپ نمودار ہوئے اور نیچے آتے آتے وہ سب جھیل کے پاس اتر گئے، بوڑھا اب اپنی جگہ پر کھڑا ہو چکا تھا اس کی نظریں ان سانپوں پر ٹکی تھیں اور ذہن بہت تیزی سے آگے کا پلان دہرا رہا تھا۔ سبھی سانپ لائن میں کھڑے ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے انسانوں کا روپ دھار لیا اور جھیل کی طرف بڑھنے لگے، بوڑھے کو شاید اسی لمحے کا انتظار تھا وہ دبے قدموں ان کی طرف بڑھنے لگا تبھی اسے کسی کی پکار سنائی دی۔

''بابا... بابا کہاں ہو تم'' یہ اس کی بیٹی تھی جو اسے پکارتی ہوئی چلی آ رہی تھی، وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنی بیٹی کی طرف دوڑا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس اس طرف مڑ لیا جس طرف سے وہ آئی تھی۔

''شکر ہے بابا تم مجھے مل گئے'' وہ ہر بات سے بے خبر معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

''یوں ایسا کیا ہو گیا جو تجھے آدھی رات کو یوں [illegible] باہر آنا پڑ گیا'' بوڑھا بری طرح [illegible] وہ لہجہ جس کا اس نے پورا سال انتظار [illegible] اس کی بیٹی کی مداخلت کی وجہ سے ضائع ہو [illegible] پھر ایک سال انتظار کرنا پڑتا۔ لیکن غصے اور جھنجھلاہٹ کی انتہا پر بھی بیٹی سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ اور الفاظ نرم ہی تھے یہ اس کی اپنی بیٹی سے بے انتہا محبت کا ثبوت تھا۔

''میں نے بہت بُرا سپنا دیکھا بابا اس نے مجھے ڈرا دیا، تم بھی جھونپڑے میں نہیں تھے میں تمہیں ڈھونڈتی ادھر آ گئی، شکر ہے تم مل گئے ورنہ میں تو مر ہی جاتی۔''

''اللہ نہ کرے تجھے کچھ ہو بھلی نہ ہو تو ایسے کیوں کہتی ہے'' بوڑھے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے پیار سے ڈانٹا۔ کچھ ہی دیر بعد باپ بیٹی اپنے جھونپڑے میں پہنچ چکے تھے لیکن وہ وہاں اکیلے نہیں پہنچے تھے کوئی اور بھی تھا جو ان کے تعاقب میں چلا آیا تھا۔ بوڑھا اور لڑکی اس بات سے بالکل بے خبر رہے تھے۔

☆.....☆

وہ بوڑھا ایک سپیرا تھا۔ وہ خاندانی سپیرا تھا جس طرح باقی علم نسل در نسل چلتے ہوئے اس کے پاس پہنچا تھا ایسے ہی اسے اس کے بڑوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہر سال ایک مخصوص رات کو سات سانپ انجانی دنیا سے زمین پر اترتے ہیں ان سب کے پاس منکا ہوتا ہے جسے وہ ایک ساتھ جھیل کے پانی میں ڈبوتے ہیں اس سے ان کی طاقتوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ سپیرے کے آباؤ اجداد ساری عمر ان سانپوں سے منکا حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ان میں سے کئی اس کوشش میں اپنی جان بھی گنوا بیٹھے لیکن کوئی بھی سانپوں پر قابو پا کر منکا حاصل نہ کر سکا تھا اب یہ سپیرا بھی اسی کام کو انجام دینے کی کوشش کر رہا تھا سالوں کی محنت کے بعد آج اسے یقین تھا کہ وہ سانپوں پر قابو پا کر منکا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن اس کی بیٹی نینا کی مداخلت نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ نینا دوبارہ سو چکی تھی لیکن بوڑھا اپنے بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہوا انہیں سوچوں میں کھویا ہوا تھا آج کی رات اسے نیند آنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

☆.....☆

صبح جب نینا کی آنکھ کھلی تب بھی سپیرا جاگ رہا تھا۔ ''بابا تو جاگ گیا یا سویا ہی نہیں؟'' سپنا کے پوچھنے پر سپیرا کوئی جواب دینے کی بجائے مسکرا دیا۔

''چل تو اٹھ ناشتے پانی کا انتظام کر میں ذرا جنگل سے لکڑیاں لے آتا ہوں، پھر مجھے شہر بھی جانا ہے آج'' سپیرا جھونپڑے سے باہر جاتے ہوئے بولا تو نینا بھی سستی چھوڑ کر ناشتے کی تیاری کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نینا کی ماں سالوں پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی تھی، ان باپ بیٹی کا دنیا میں ایک دوسرے کے سوائے کوئی نہ تھا، سپیرا ہفتے میں دو تین بار شہر جاتا لوگوں کو سانپ کا تماشا دکھاتا اور بدلے میں سب اسے کچھ نہ کچھ دے دبا کر تے اسی سے ان کی گزر اوقات ہو رہی تھی۔ سپیرے کی زندگی میں دو ہی فکریں تھیں ایک تو منکا حاصل کرنا اور دوسرے نینا کی شادی لیکن ان دونوں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں ہو پا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان رہنے لگا تھا منکا نہ بھی ملتا تو گزارا ہوتا تھا لیکن جب اسے یہ خیال آجاتا کہ کہیں کسی روز اسے اچانک موت نے آلیا تو اس کی معصوم بیٹی کے ساتھ دنیا کیا سلوک کرے گی تو وہ بے چین ہو جایا کرتا۔

☆.....☆

نینا ناشتہ بنا کے سپیرے کا انتظار کرنے لگی کافی دیر گزر گئی مگر وہ نہیں آیا نینا نے کئی بار جھونپڑے کے دروازے پر آکر بھی جھانکا لیکن باپ کو نہ پا کر پھر سے اندر جا بیٹھی ''نہ جانے آج بابا کہاں رہ گیا ہے پہلے تو کبھی لکڑیاں لانے میں اتنی دیر نہیں لگی''۔ وہ گھٹنوں پر سر ٹکائے سوچوں میں گم تھی جب اسے جھونپڑے سے باہر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا وہ تیزی سے باہر کو لپکی لیکن پھر ٹھٹک گئی باہر اس کا باپ نہیں بلکہ کوئی اجنبی نوجوان کھڑا تھا، وہ نوجوان اتنا پرکشش تھا کہ نینا کا دل دھڑک اٹھا۔

''میں مسافر ہوں کیا تم مجھے ایک گلاس پانی پلا سکتی ہو؟'' نوجوان مسکراتے ہوئے نینا سے مخاطب تھا اس کی مسکراہٹ نے اسے اور دلکش بنا دیا تھا نینا کچھ بھی کہے بنا جھونپڑے کی طرف پلٹی اور کچھ ہی لمحوں میں وہ پانی سے بھرا برتن لیے نوجوان کے سامنے کھڑی تھی، نوجوان نے اس کے ہاتھ سے برتن لے لیا اور پانی پی کر واپس اسے تھماتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

''کون ہو تم؟'' ابھی وہ شکریہ ادا کر رہا تھا کہ سپیرا بھی آن پہنچا اپنی بیٹی کے پاس ایک اجنبی نوجوان کو کھڑے دیکھ کر اس کی زبان پر پہلا سوال یہی آیا تھا۔

''مسافر ہوں بابا جی، پانی کی تلاش آپ کے گھر تک لے آئی اور آپ کی رحمدل بیٹی نے مہربانی کی اور پانی پلا دیا'' نوجوان گھبرائے جھکے بنا سپیرے کو جواب دے رہا تھا، نینا جھونپڑے میں جا چکی تھی لیکن اس کا دھیان باہر سے آتی ان دونوں کی آوازوں پر ہی تھا۔

''کاش بابا اس اجنبی کو کھانے کے لیے روک لے'' اس خیال پر وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ باہر سپیرا ابھی تک نوجوان سے باتیں کر رہا تھا کچھ ہی دیر بعد شاید اپنی اُپھی طرح تسلی کر لینے کے بعد سپیرا لڑکے کو ساتھ لیے جھونپڑے میں داخل ہوا۔

''بیٹی مہمان کے لیے ناشتہ لاؤ'' وہ نینا سے مخاطب ہوا اور اس کی تو جیسے من کی مراد بر آئی کھانے کی جو بھی چیز دستیاب تھی اس نے سب کی سب نوجوان کے سامنے لا رکھی۔ ''آؤ نا تم بھی ناشتہ کرو'' وہ ایک طرف جا بیٹھی تھی جب سپیرے نے اسے ناشتے کے لیے کہا تو وہ بھی شرماتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھی اور چھوٹے چھوٹے نوالے لینے لگی۔

☆.....☆

سپیرے نے ارسلان نامی اس نوجوان کو اپنے ساتھ رہنے کا کہا اور وہ رک بھی گیا تھا ویسے بھی اس کا کوئی گھر در نہیں تھا وہ یونہی ادھر اُدھر پھرا کرتا تھا موٹے موٹے کام کر کے اپنی زندگی گزار رہا تھا، سپیرے اور ارسلان نے مل کر ایک ہی دن میں ایک اور جھونپڑی کھڑی کر دی یوں گویا

بنا کہے یہ طے پا گیا تھا کہ اب ارسلان کو وہیں رہنا ہے۔ وہ روز سپیرے کے ساتھ جنگل جا کر لکڑیاں جمع کرتا اور گاؤں جا کر بیچ آتا، نینا ان دونوں کے لیے کھانا تیار کرتی اور وہ سب مل کر کھانا کھاتے ارسلان دنوں میں اس چھوٹے سے خاندان کا حصہ بن گیا تھا۔

اسے یہاں رہتے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ ہو چکے تھے اس دوران ارسلان اور نینا دونوں ایک دوسرے کے دل کا بھید پا چکے تھے بس اب ارسلان کسی مناسب موقع کا منتظر تھا جب وہ سپیرے کے سامنے اپنا مدعا بیان کر سکے اور آخر وہ دن بھی آ ہی گیا۔

☆.....☆

اس روز سپیرے کو بہت تیز بخار تھا صبح اس سے بستر سے اٹھا بھی نہ جا رہا تھا ارسلان اسے آرام کرنے کا کہہ کر اکیلا ہی جنگل لکڑیاں لینے چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو سپیرے کی طبیعت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو چکی تھی۔

''گاؤں چلتے ہیں حکیم صاحب سے دوا لے آتے ہیں'' ارسلان نے سپیرے سے کہا۔ نینا مسلسل روئے جا رہی تھی ارسلان بھی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا تھا تبھی سپیرے نے ارسلان کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا ارسلان چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''مجھے اپنے مرنے کی فکر نہیں ہے بیٹا بس فکر ہے تو اپنی بیٹی کی، میرے بعد اس کا کیا ہوگا'' سپیرا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا وہ اپنی بات کہنے سے جھجک رہا تھا کہ جانے ارسلان کیا سوچے لیکن ارسلان نے اس کی مشکل حل کر دی۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں'' ارسلان کے ان الفاظ نے گویا سپیرے میں نئی روح پھونک دی اس کی آنکھوں سے شکر گزاری کے آنسو بہنے لگے۔ بوڑھے کی حالت سنبھلتے ہی اس نے نینا اور ارسلان کی شادی کرا دی اور نینا اپنے باپ کی جھونپڑی سے ارسلان کی جھونپڑی میں اٹھ آئی۔

☆.....☆

نینا اور ارسلان ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے اور ان دونوں کو خوش دیکھ کر سپیرا اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا۔ ارسلان نے جیسے جادو سے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا اس نے شہر میں نوکری کیا کی کہ ان کے حالات بدلتے چلے گئے، اب وہ جھونپڑے میں نہیں بلکہ گاؤں کے ایک گھر میں رہا کرتے تھے جو کہ ارسلان نے خریدا تھا، اس نے سپیرے کو منع کر دیا تھا کہ اب اسے جنگل سے لکڑیاں جمع کرنے کی ضرورت ہے نہ شہر جا کر سانپ تماشہ دکھانے کی۔ شروع میں سپیرے کو اعتراض ہوا اسے لگا کہ اس طرح وہ بیٹی اور داماد پر بوجھ بن جائے گا لیکن ارسلان کے محبت بھرے اصرار کے سامنے وہ زیادہ دیر اس کی بات سے انکار نہ کر سکا۔ ارسلان نے دنوں میں ضرورت کی ہر چیز اس گھر میں جمع کر دی تھی، وہ نینا کو کسی شہزادی کی طرح رکھتا تھا اس کا خیال رکھتا اس کے ناز نخرے اٹھاتا اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے نینا کے علاوہ دنیا کی کسی چیز میں بھی اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے، نینا جو پہلے ہی بہت خوبصورت تھی شوہر کی محبت اور یہ عیش و آرام پا کر مزید نکھرتی چلی جا رہی تھی۔ نینا کی ذمہ داری اور فکر معاش سے آزاد ہو کر اب سپیرے کی پوری توجہ صرف اور صرف منکا حاصل کرنے کی طرف ہو چکی تھی، وہ دن رات مختلف قسم کے جاپ کر کے اپنی طاقتوں میں اضافہ کرنے میں لگا رہتا تھا۔

☆.....☆

سپیرا پچھلے کئی دنوں سے روزانہ جنگل کا چکر لگا رہا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ جھیل کا پانی کم ہوتا چلا جا رہا ہے، اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی لیکن یہ بات اس کے لیے پریشانی کا باعث تھی کیونکہ اگر جھیل کا پانی خشک ہو جاتا تو پھر وہ سانپ منکا ڈبونے کے لیے نیچے نہ اترتے اور اگر وہ آتے ہی نہ تو پھر وہ منکا کیسے حاصل کر سکتا تھا، دن یونہی

گزرتے چلے گئے آج پھر وہی مخصوص رات تھی سپیرا پھر اسی درخت کے نیچے بیٹھا جھیل کو تک رہا تھا جس میں پانی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا آخر اس کا انتظار ختم ہوا آسمان سے سانپ نمودار ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جاپ کرتا ہوا سانپوں کی طرف بڑھا۔ سانپ انسانی شکل اختیار کر چکے تھے پھر جیسے ان کے بیچ کوئی بات ہونے لگی اور اچانک وہ سب وہاں سے غائب ہو گئے۔ سپیرا حیران پریشان کھڑا رہ گیا، اس کی سمجھ میں یہ ماجرا نہ آ رہا تھا اپنا اپنا منکا جھیل کے پانی میں ڈبوئے بنا وہ سانپ کیوں غائب ہو گئے تھے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

☆.....☆

وہ سب وہاں جمع تھے اس وقت وہ انسانی روپ میں تھے لیکن نہیں وہ سب وہاں نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد چھ تھی ان کا ساتواں ساتھی وہاں موجود نہیں تھا۔ ''تو اب کیا کرنا ہے؟'' ایک لڑکے نے سب سے بارعب اور پروقار دکھائی دینے والے انسان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ ان سب میں سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ باقی سب بھی منتظر نظروں سے سربراہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''جھیل کا پانی بہت کم رہ گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب پچھلے سال ہم لوگ نیچے اترے تھے تو ساتوں منکے پانی میں نہیں ڈبوئے گئے تھے۔ ہمیں ہر حال میں اپنے ساتھی کو تلاش کرنا ہوگا تاکہ سارے منکے پانی میں ڈبوئے جا سکیں اس کام میں دیر ہوئی تو جھیل کا پانی خشک ہو جائے گا اور ہماری طاقتوں میں اضافے کا سلسلہ یہیں رک جائے گا'' سربراہ کی بات نے سب کے چہروں پر پریشانی پھیلا دی اور پھر وہ اس عہد کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئے کہ جلد از جلد اپنے ساتھی کو تلاش کر لائیں گے۔

☆.....☆

ارسلان کو تلاش کرنا ان کے لیے زیادہ مشکل کام ثابت نہیں ہوا تھا وہ اس کے بارے میں ایک ایک بات جان چکے تھے کہ کس طرح اس روز ان کی ساتھی کی نظر نینا پر پڑی اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کے پیچھے چل پڑا اور پھر انسانی روپ میں ارسلان بن کر ان سے ملا اور ان کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ نینا کو جان سے مار دیا جائے تاکہ ارسلان کو واپس لایا جا سکے کیونکہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ نینا کے زندہ رہتے ارسلان اسے کبھی نہیں چھوڑے گا۔

سپیرا گزرے سال میں بہت زیادہ طاقتیں حاصل کر چکا تھا اور اپنی انہی طاقتوں کی بدولت وہ بات کی تہہ تک جا پہنچا تھا۔ وہ ارسلان کی اصلیت سے بھی واقف ہو چکا تھا، اور سربراہ کے فیصلے سے بھی۔ زندگی اسے عجیب دوراہے پر لے آئی تھی ایک طرف جان سے پیاری بیٹی کی زندگی اور بیٹوں کی طرح خدمت گزار اور فرمانبردار ارسلان کی خوشیوں کا سوال تھا دوسری طرف منکے کا حصول جس کے لیے اس نے اپنی ساری عمر لگا دی تھی۔ لیکن پھر بھی سپیرے کو فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

☆.....☆

اس رات وہ پھر جھیل کے قریب موجود تھا جھیل میں پانی مزید کم ہو چکا تھا، چھ سانپ جھیل کے کنارے کھڑے آنکھیں بند کیے کوئی جاپ کرنے میں مصروف تھے جب سپیرا آگے بڑھا اور اس نے کچھ پڑھ کر ان سب پر پھونک دیا انہوں نے ایک ساتھ آنکھیں کھول دیں اور سپیرے کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگے۔

''کیوں اپنی موت کو آواز دیتا ہے جا چلا جا یہاں سے'' سربراہ نے سپیرے کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

''دیکھو ابھی تو تم لوگ مجھے مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتے کیونکہ ابھی تم اپنے جسم کو حرکت تک نہیں دے سکتے'' سپیرے نے اطمینان سے جواب دیا سربراہ اور اس کے ساتھیوں نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے ان کے غیض و

غضب میں اضافہ ہو گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' سربراہ نے سوال کیا۔

''ایک سودا کرنا چاہتا ہوں، تم لوگ میری بیٹی کو مارنے کا ارادہ چھوڑ دو اور ارسلان کو واپس بھی مت بلاؤ، میری بیٹی ماں بننے والی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں۔'' سپیرے نے کہا۔

''اگر تم یہ سب جانتے ہو تو تمہیں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ ہمارے لیے سات منکوں کو ایک ساتھ جھیل کے پانی میں ڈبونا کتنا ضروری ہے۔ اگر ہم نے جلد یہ کام نہ کیا تو جھیل کا پانی خشک ہو جائے گا اور ایسا ہوا تو ہم پھر کبھی اپنی طاقتیں نہیں بڑھا سکیں گے'' سربراہ نے جواب دیا۔

''میں ان سب باتوں سے واقف ہوں، اور وہ ساتواں منکا اپنے ساتھ لایا ہوں، تم یہ منکا لے لو اور ارسلان کو بھول جاؤ'' سپیرے کی بات سن کر سربراہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟ جو تم چاہتے تھے وہ ہو رہا ہے اب فیصلہ کرنے میں دیر کیوں کر رہے ہو؟'' سپیرے نے سربراہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی، تم اتنی طاقتیں حاصل کر چکے ہو کہ تم نے ہم سب کو بے بس کر رکھا ہے، اگر تم چاہو تو ہمیں مار کر ہم سب کے منکے حاصل کر سکتے ہو اس کے باوجود تم ہمارے ساتھ سودا کرنے کی بات کر رہے ہو آخر کیوں؟'' سربراہ کی بات پر سپیرا مسکرانے لگا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو منکا حاصل کرنا میری زندگی کا مقصد رہا ہے، اور اگر ایک ساتھ سات منکے مجھے مل جائیں تو میں دنیا کا سب سے طاقتور انسان بن جاؤں گا، لیکن ارسلان کے حسن سلوک نے میرے خیالات کو بدل ڈالا ہے، اس نے میری بیٹی کو اتنی خوشیاں دی ہیں اور ایک بیٹے کی طرح میرا خیال رکھا ہے اب میرا فرض بنتا ہے کہ احسان کے بدلے میں احسان کروں اور میں اس سے زیادہ اس کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ اس کے دوستوں کو کوئی نقصان پہنچائے بنا واپس جانے دوں، رہی بات منکا پانے کی تو اب مجھے اس کی طلب نہیں رہی۔ میری بیٹی کی خوشیاں ایسے ہزار منکوں سے زیادہ قیمتی اور اہم ہیں'' سپیرے کی بات پر سب چپ چاپ اسے دیکھتے رہ گئے۔

''ٹھیک ہے ہمیں یہ سودا منظور ہے'' سربراہ نے سب کی طرف سے کہا تو سپیرے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر منکا نکالا اور زمین پر رکھ دیا۔

''یہ رہا ساتواں منکا، اب میں تمہیں اپنے سحر سے آزاد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم لوگ اپنا وعدہ پورا کرو گے'' اس کے ساتھ ہی سپیرے نے ان سب کو سحر سے آزاد کر دیا۔ انہوں نے ساتوں منکے جھیل کے پانی میں ڈبوئے اس کے ساتھ ہی جھیل پانی سے بھر گئی ان سب کے چہروں پر خوشی دکھائی دینے لگی۔ سپیرا گاؤں جانے کے لیے مڑ گیا۔

''ٹھہرو'' سپیرے کو اپنے پیچھے سربراہ کی آواز سنائی دی وہ پلٹا تو دیکھا وہ ارسلان کا منکا ہاتھ میں لیے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یہ منکا واپس لے جاؤ اسے ارسلان کے پاس رہنے دو۔ اس منکے کے بغیر اس کی ساری طاقتیں ختم ہو جائیں گی۔ انسان اور سانپ کے انوکھے رشتے سے جنم لینے والا ان کا بچہ قدرتی طور پر بہت سی طاقتوں کا مالک ہوگا لیکن یہ منکا اس کی طاقتوں میں اضافہ کرتا رہے گا، تم سے بس اتنا وعدہ لینا ہے کہ ہر سال جب ہم جھیل پر آئیں تم منکا لے کر یہاں پہنچ جایا کرنا تاکہ ہم اپنی رسم پوری کر سکیں۔''

سپیرے نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے منکا ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ سب اسے خدا حافظ کر کے وہاں سے غائب ہو گئے تو سپیرا بھی خوشی خوشی گاؤں کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

خیبر ناگ سیریز

نورانی ناگ

ڈاکٹر ثمینہ خان

اُس نیک ناگ کی کہانی، جس نے اللہ کا گھر آباد کر دیا تھا

پورا گاؤں دھند اور تاریکی کی لپیٹ میں تھا، ایسے میں مولوی فیاض نے روز کی طرح وضو کیا اور یہ جاننے کے باوجود کہ اللہ کا کوئی بندہ اللہ کے اِس گھر میں نہیں آنے والا وہ اذان کی تیاری کر رہا تھا، کچھ ہی دیر بعد وہ لوگوں کو اللہ کے گھر کی طرف آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اذان دینے کے بعد وہ چٹائی پر آ بیٹھا اور منتظر نگاہوں سے مسجد کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا نماز کا ٹائم شروع ہوا تو اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے آخری بار دروازے کی طرف دیکھا اور پھر نماز کی نیت باندھ لی۔ ''اے میرے پروردگار چوہدری کو ہدایت دے اور اپنے اس گھر کو بھی پہلے کی طرح آباد کر دے'' نماز کے بعد یہ دعا مانگتے ہوئے ہمیشہ کی طرح مولوی کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو چکے تھے۔

☆.....☆

مولوی فیاض اس وقت نوجوان تھا جب اس نے اس مسجد کی امامت سنبھالی تھی اس وقت چوہدری فخرالدین زندہ تھا۔ وہ بڑا سادہ مزاج کا انسان تھا روایتی چوہدریوں سے ہٹ کر وہ ایک رحم دل اور خوفِ خدا رکھنے والا انسان تھا۔ وہ خود بھی پانچوں وقت نماز کے لیے مسجد میں آیا کرتا اور گاؤں والوں سے بات چیت کرتا اس طرح وہ گاؤں کے ہر گھر کے دکھ سکھ سے واقف تھا اور شامل بھی۔ عمر کے اتنے فرق کے باوجود چوہدری کی مولوی فیاض کے ساتھ بہت بنتی تھی اور شاید یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے چھوٹا چوہدری یعنی چوہدری فخرالدین کا اکلوتا بیٹا چوہدری اسد مولوی فیاض کی طرف سے دل میں بغض و عناد رکھتا تھا۔ چوہدری فیاض اپنے باپ سے اتنا مختلف تھا کہ فرشتے کے گھر شیطان والا محاورہ ان پر پورا اترتا تھا، چوہدری اسد اپنے باپ کی ضد تھا باپ میں جتنی اچھائیاں تھیں بیٹا اتنا ہی برائیوں میں لتھڑا ہوا تھا۔ وہ نوعمری میں ہی دوستوں کی سنگت کی بدولت باپ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ چوہدری کو جب اسد کی حرکتوں کی خبر ہوئی تو اس نے اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس کی کوئی دھمکی، کوئی نصیحت چوہدری اسد کو راہِ راست پر واپس نہ لا سکی۔ ایسے میں جب چوہدری اپنے بیٹے کو مولوی فیاض کی مثال دے [illegible] کی کوشش کرتا جو اسد کا ہم عمر تھا لیکن گاؤں [illegible] بڑے اسے عزت و احترام سے [illegible] تھے تو وہ اور چڑ جاتا۔ اسد کی نظر میں اسے [illegible] مثال دے کر سمجھانا ہی غلط تھا۔ وہ ایک امیر

باپ اور بڑے گھر کا بیٹا اور مولوی ایک چھوٹے گھر کا عام سا دو ٹکے کا انسان۔ ان کا موازنہ کرنا اسد کو اپنی توہین محسوس ہوتا، یہی وجہ تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ اسد کے دل میں مولوی کے لیے نفرت بڑھتی چلی گئی، چوہدری فخرالدین کی پریشانی دیکھتے ہوئے مولوی نے ایک دو بار اسد کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اس نے بڑے سخت الفاظ میں مولوی کو اپنے کام سے کام رکھنے کا مشورہ دیا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے اسد کے تیور مولوی کو بہت کچھ سمجھا گئے تھے اس کے بعد چاہتے ہوئے بھی اس نے کبھی اسد کو کچھ سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سب کچھ اسی طرح چل رہا تھا کہ اچانک ایک رات دل کا دورہ پڑنے سے چوہدری فخرالدین خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ جہاں چوہدری کے اس طرح چلے جانے سے گاؤں کا ہر فرد خود کو یتیم محسوس کر رہا تھا وہیں چوہدری اسد کی گویا لاٹری لگ گئی تھی۔ باپ کی موجودگی اس کو جو تھوڑا بہت پابند کیے ہوئے تھی وہ اس سے بھی آزاد ہو گیا اور اس نے کھل کھیلنا شروع کر دیا۔ جہاں دوسرے لوگ اس کے عتاب کا نشانہ بنے وہیں سرِفہرست مولوی فیاض کی ذات ٹھہری تھی۔ چوہدری اسد نے دنوں میں ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی اور ساتھ مدرسہ بھی بنوایا، مسجد کی تعمیر اگرچہ ایک اچھا کام تھا لیکن دوسری طرف اس نے گاؤں کے لوگوں کو سختی سے مولوی فیاض والی مسجد میں جانے سے روک دیا۔ ایک دو بار کچھ

لوگوں نے چوہدری کی حکم عدولی کرنے کی کوشش کی تو انہیں اور ان کے خاندانوں کو اس کی سزا دی گئی یہی وجہ تھی کہ اب گاؤں کا کوئی فرد مولوی فیاض کی مسجد کا رخ نہیں کرتا تھا لیکن وہ اب بھی باقاعدگی سے مسجد میں پانچ وقت اذان دیتا اور پھر لوگوں کا انتظار کرتا اور آخر مایوس ہو کر اکیلا ہی نماز کی نیت باندھ لیتا۔ لیکن مسجد کو اس طرح خالی اور ویران دیکھ کر اس کا دل بہت دکھتا تھا یہی وجہ تھی کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو جایا کرتے تھے۔

☆.....☆

کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ مولوی فیاض عشاء کی نماز کے بعد وہیں مسجد میں رات بسر کر لیا کرتا تھا وہ زیادہ وقت عبادات میں مشغول رہتا اور جب آرام کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہیں ایک کونے میں لیٹ کر کمر سیدھی کر لیا کرتا۔ وہ بھی ایسی ہی ایک رات تھی، مولوی عشاء کی نماز کے لیے گھر سے نکلا تو تیز ٹھنڈی ہواؤں نے اس کا استقبال کیا اپنی چادر کو اور اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے وہ تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف بڑھنے لگا، دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو بارش بہت زیادہ تیز ہو چکی تھی ایسے میں گھر جانے کی کوشش کرنا اسے بیمار کر سکتا تھا اور ویسے بھی وہ تو مسجد میں رکنے کے بہانے ڈھونڈا کرتا تھا سو بارش کو اللہ کا اشارہ مان کر اس نے موبائل جیب سے نکالا اور گھر فون کر کے رات مسجد میں قیام کے بارے میں بتا دیا۔ اس کے بعد وہ دیر تک تلاوت میں مصروف رہا اور پھر کچھ دیر کے لیے آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔

تہجد کے وقت وہ وضو کرنے کے لیے باہر نکلا تو اس وقت تک بارش تھم چکی تھی لیکن سردی میں اچھا خاصا اضافہ ہو چکا تھا، اس نے نلکا چلا کر وضو کیا اور پھر اندر آ کر تہجد کے نوافل کی نیت باندھ لی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے ایک بار پھر تلاوت کرنا شروع کر دی تبھی اسے محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی آواز سنی ہے۔ پہلے مولوی نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب اس کو دوبارہ کوئی آواز محسوس ہوئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسجد کے چھوٹے سے صحن میں نکل آیا، ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا تبھی وہ آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس بار مولوی نے واضح طور پر کسی انسان کے کراہنے کی آواز سنی تھی۔

''کون ہے'' مولوی نے اونچی آواز میں پکارا اور مسجد سے باہر نکل آیا۔ ''کون ہو بھائی اور کدھر ہو تم۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا ذرا آواز دو تاکہ میں تم تک پہنچ سکوں'' مولوی نے اس بار پہلے سے زیادہ بلند آواز میں کہا۔ جواب میں ایک طرف سے کراہتی ہوئی آواز سنائی دی کوئی اسے مدد کے لیے پکار رہا تھا مولوی موبائل کی ہلکی سی روشنی میں اس سمت بڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں ایک بوڑھا شخص زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ مولوی فیاض اسے سہارا دے کر مسجد میں لے آیا اور اسے اپنے بستر پر لٹا دیا اور پھر وہ اسی وقت اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا، گھر والے اسے اس وقت دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے لیکن اس نے انہیں تسلی دی اور کھانا، اور مرہم پٹی کا سامان کے ساتھ اپنا ایک سوٹ لے کر وہ واپس مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆.....☆

مولوی فیاض واپس مسجد میں پہنچا تو اس نے دیکھا بوڑھا [illegible] سے بے ہوش ہو چکا تھا، اس نے سب سے پہلے بوڑھے کے کپڑے بدلے اور پھر اس کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے رضائی کو اچھی طرح بوڑھے کے گرد لپیٹ دیا اور گھر سے لائی ہوئی اضافی رضائی بھی بوڑھے کو اوڑھا دی، ان سب کاموں میں صبح کی اذان کا وقت ہو گیا، بوڑھا ابھی تک بے ہوش تھا مولوی فیاض جو [illegible] کا منتظر تھا تبھی وہ بوڑھے کو [illegible] لے جا سکتا تھا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر ایک بار پھر بوڑھے کے پاس آ بیٹھا [illegible] اپنا بندوبست کر دیا تھا یعنی زخموں پر لگنے والی [illegible] شروع کر دیا تھا۔

''نہ جانے کون ہے اس طوفانی رات میں کون سی مجبوری اسے گھر سے باہر لائی ہے، ہمارے گاؤں کا تو نہیں ہے شاید کسی کے گھر مہمان آیا ہوگا یا پھر مسافر بھی ہو سکتا ہے'' مولوی فیاض قیاس آرائی میں مصروف تھا جب بوڑھے کے بدن میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''بابا جی اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟'' بوڑھے کو ہوش میں آتا دیکھ کر مولوی فیاض اس کے چہرے پر جھک کر پوچھنے لگا۔ بوڑھے نے کچھ کہے بنا دوبارہ آنکھیں موند لیں، مولوی فیاض نے جیسے تیسے اسے سہارے سے بٹھایا اور گھر سے لائے ہوئے کھانے میں سے اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے لگا اس کے بعد درد کی گولیاں کھلا کر اس نے بوڑھے کو واپس بستر پر لٹا دیا کچھ ہی دیر بعد بوڑھا گہری نیند میں جا چکا تھا۔

☆.....☆

مولوی فیاض کو بوڑھے کی تیمار داری کرتے ہوئے تین دن گزر چکے تھے اب وہ کافی اچھی حالت میں تھا، مولوی فیاض بڑی لگن سے اس کے کام کرتا، اس کی مرہم پٹی کرتا اور اپنے گھر سے کھانا لا کر دیتا۔ مولوی کی اصرار کے باوجود بوڑھے نے اس کے گھر جانے کی بجائے مسجد میں رکنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کی وجہ سے اب مولوی فیاض کے دن رات مسجد میں بسر ہو رہے تھے۔ اس صبح فجر کی نماز ادا کرتے ہوئے ایک بار پھر خالی مسجد کو دیکھ کر مولوی فیاض کا دل بھر آیا اور وہ سسکیوں سے رونے لگا نماز سے فارغ ہو کر بوڑھے نے مولوی فیاض سے اس طرح رونے کی وجہ پوچھا تو اس نے چوہدری اسد کے بارے میں ساری داستان کہہ سنائی۔

''اللہ اسے ہدایت دے انشاء اللہ اللہ کا یہ گھر بھی جلد آباد ہو گا تم فکر مت کرو'' ساری بات سننے کے بعد بوڑھے نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا اگرچہ اس نے کوئی یقین دہانی نہیں کرائی تھی لیکن پھر بھی جانے کیوں مولوی فیاض کے دل کو ڈھارس سی بندھی تھی۔ یوں جیسے واقعی اب سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہو۔ ایک ہفتے میں بوڑھا پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا۔

مولوی فیاض کی طرح بوڑھے کا بھی زیادہ تر وقت عبادات میں گزرتا باقی کا وقت وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ بوڑھے نے اپنے بارے میں صرف یہی بتایا تھا کہ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا کوئی گھر بار نہیں تھا یونہی ادھر سے اُدھر گھومتا پھرتا تھا، مولوی فیاض نے بھی اسے زیادہ کریدنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی نہ مولوی نے اس سے پوچھا کہ وہ کب جائے گا نہ بوڑھے کے کسی انداز سے لگتا تھا کہ وہ وہاں سے جانے کا کوئی ارادہ رکھتا ہے، بلکہ اس کے آنے سے مولوی فیاض بہت اچھا محسوس کرنے لگا تھا اسے جیسے ایک ہم مزاج ساتھی مل گیا تھا وہ دل سے چاہتا تھا کہ بوڑھا ہمیشہ وہیں قیام کرے۔

☆.....☆

بوڑھے کو گاؤں میں آئے ہوئے دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اس صبح مولوی فیاض ناشتہ لے کے پہنچا تو اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے مسجد میں گاؤں کے تین چار مردوں کو بوڑھے کے پاس بیٹھے دیکھا۔ ان میں سے ایک کی گود میں ایک چھوٹا بچہ تھا۔

''بابا جی بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہم پر رحم کریں ہمارے بچے کو صحت دے دیں'' وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا بابا جی کو اس کے الفاظ خاصے ناگوار گزرے تھے لیکن اس کی حالت اور پریشانی کے پیش نظر انہوں نے اسے اس وقت کچھ کہنے سننے کی بجائے تسلی دی، بچے پر دم کیا اور دو تعویز اس آدمی کی طرف بڑھا دیئے۔

''ایک تعویز کو پانی کی بوتل میں ڈال دو اور وہ پانی تین دن تک بچے کو پلاؤ جب بھی پانی مانگے اسی میں سے پلانا، یہ دوسرا تعویز بچے کے گلے میں ڈال دینا میرے رب نے چاہا تو شفایاب ہو گا'' آدمی نے تعویز ہاتھوں میں تھام لیے اور وہ لوگ بابا جی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

نہ جانے کیسے گاؤں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ نے مولوی فیاض کی مسجد میں ٹھکانہ بنا لیا ہے، اس بچے کی صحت یابی نے گاؤں والوں کے دلوں میں بابا جی کے لیے عقیدت اور

احترام میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ لوگ چوہدری اسد کے ڈر سے وہاں آنے سے کتراتے تھے لیکن جس کو کوئی مشکل پیش آتی وہ چھپتا چھپاتا بابا جی کے پاس حاضر ہو جایا کرتا تھا۔

☆.....☆

چوہدری اسد کا زیادہ وقت شہر کے چکر لگاتے گزرتا تھا جہاں اس نے ایک اور فیکٹری لگالی تھی، باقی کا وقت عیش و عشرت کی نظر ہو جایا کرتا، اب جب کہ چوہدری اسد دو جوان ہوتے بچوں کا باپ بن چکا تھا اب بھی وہ اپنی پرانی روش پر قائم تھا۔

''چوہدری صاحب آپ کو ایک اطلاع دینی ہے'' چوہدری تقریباً تین ہفتوں بعد وہ گاؤں لوٹا تھا جب اس کے کارندہ خاص نے اس سے یہ بات کی اور پھر چوہدری کی اجازت پاتے ہی وہ بابا جی کی آمد اور گاؤں میں ان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے بارے میں بتاتا چلا گیا ساتھ میں یہ بھی بتا دیا کہ اب گاؤں کے کچھ لوگ باقاعدگی سے اس مسجد میں نماز بھی ادا کرنے لگے ہیں۔ یہ سب سن کر چوہدری کے ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلتا چلا گیا۔

''ابھی تو تُو جا مجھے آرام کرنا ہے صبح دیکھ لیتا ہوں اس بابا جی کو بھی اور گاؤں والوں کی تو خیر نہیں۔ دیکھنا صبح میں کیا کرتا ہوں ان کے ساتھ'' چوہدری کی بات پر کارندہ سلام کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا اس کے جانے کے بعد چوہدری گہری سوچ میں گم ہو گیا اسے گاؤں والوں پر بہت غصہ آ رہا تھا جو اس کی حکم عدولی کرتے ہوئے اس مسجد میں جانے لگے تھے۔

☆.....☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب کسی عجیب سے احساس سے چوہدری اسد کی آنکھ کھل گئی اس نے دوبارہ سونے کے لیے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ دیا ہو وہ ایکدم بستر پر اٹھ بیٹھا۔

''کون ہے اوئے'' وہ گرج دار آواز میں پکارا جبھی اس کی نظر اپنے بیڈ پر پڑی اس کے پاؤں کے قریب بیڈ پر ایک بہت بڑا سا سانپ بیٹھا تھا وہ پھن پھیلائے چوہدری کو گھور رہا تھا موت کو اپنے سامنے دیکھ کر چوہدری کی گھگی بندھ گئی تبھی اسے ایک آواز سنائی دینے لگی جو کہ یقیناً سانپ کے منہ سے آ رہی تھی سانپ کو انسانی آواز میں بولتا دیکھ کر چوہدری کا منہ حیرت اور خوف سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''میری بات غور سے سنو چوہدری، تم نے بہت ظلم کیے ہیں ان کا حساب تو تمہیں خدا کے حضور دینا ہی ہوگا لیکن آئندہ اگر تم نے لوگوں کو مولوی فیاض والی مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کیا تو وہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا'' سانپ اپنی بات مکمل کر کے بیڈ سے نیچے رینگ گیا اور پھر اس کے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ چوہدری کا خوف سے برا حال تھا اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ پکار کر کسی ملازم کو بلا سکتا ملازم کو بلانا تو دور کی بات وہ تو بستر کے دوسرے کونے میں سوئی ہوئی اپنی بیوی کو بھی نہیں جگا سکا تھا۔ صبح جب اس کی بیوی نے اسے جگانا چاہا تو پتا چلا چوہدری بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔

☆.....☆

پورا ہفتہ چوہدری بخار میں پڑا رہا گاؤں کے ڈاکٹر اور خاندانی حکیم سے مایوس ہو کر اسے شہر میں ایک بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا، بڑی مشکل سے اس کی حالت میں سدھار آیا تھا، طبیعت سنبھلتے ہی چوہدری نے اپنے کارندوں کو سختی سے ہدایت کر دی کہ وہ پھر کبھی کسی کو مولوی فیاض والی مسجد میں جانے سے منع نہ کریں، سب چوہدری کی اس کایا پلٹ پر حیران تھے ایسا نہیں تھا کہ چوہدری کے اندر کا انسان جاگ گیا تھا یا وہ گناہوں سے توبہ کر بیٹھا تھا بات صرف اتنی تھی کہ جو انسان جتنا ظالم ہوتا ہے اتنا ہی بزدل بھی ہوتا ہے اور ایسے انسان کو موت کا خوف دوسرے لوگوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ اس معاملے سے الگ ہو گیا تھا کہ بہرحال اسے مولوی فیاض سے نفرت سے زیادہ اپنی زندگی سے محبت تھی چوہدری کے اس رویے پر گاؤں والوں نے بھی سکون کا سانس لیا تھا اور اب صبح سے شام تک حاجت مند افراد بابا جی کے پاس جمع رہتے نمازیوں سے بھری مسجد دیکھ کر مولوی فیاض

کے دل میں سکون اترتا چلا جاتا وہ شکر گزاری سے آسمان کی طرف دیکھتا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی جاتی۔

☆.....☆

بابا جی کو گاؤں میں رہتے ہوئے دو سال سے اوپر ہونے کو آئے تھے۔ گاؤں والوں نے مل کر مسجد کے ساتھ ایک کمرہ بابا جی کے لیے بنا دیا تھا اور اس میں چارپائی بستر اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بھی فراہم کر دی تھیں۔ زندگی اسی طرح گامزن تھی، مولوی فیاض بھی اب بہت خوش رہتا تھا۔ اس صبح مولوی فیاض اذان کے ٹائم مسجد پہنچا تو بابا جی کو مسجد میں موجود نہ پا کر اسے حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ اس کے آنے سے پہلے مسجد میں موجود ہوا کرتے تھے اذان کا وقت نکلا جا رہا تھا اس لیے وہ وضو کر کے اذان دینے کھڑا ہو گیا اس کے بعد وہ بابا جی کے کمرے کی طرف آیا تا کہ ان کی خیریت معلوم کر سکے۔

''بابا جی آپ خیریت سے ہیں؟'' مولوی فیاض نے دروازے پر دستک دینے کے بعد بلند آواز میں پوچھا کوئی جواب نہ پا کر اس نے دوبارہ دروازے پر دستک دی اس بار بھی جب اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ بابا جی کمرے میں موجود نہ تھے بلکہ وہ اپنے بستر پر بھی موجود نہ تھے ''بابا جی اتنی صبح بھلا کہاں جا سکتے ہیں؟'' اس نے پریشان ہوتے ہوئے خود کلامی کی اتنے میں کچھ اور نمازی بھی وہاں پہنچ چکے تھے اور اب وہ سب بابا جی کو غائب پا کر پریشان تھے۔

''ارے بستر میں کچھ ہے'' ان میں سے ایک نے کہا تو سبھی لوگ غور سے چارپائی پر پھیلی چادر کو دیکھنے لگے اس کے نیچے واقعی کوئی چیز موجود تھی۔ ایک ڈنڈے کی مدد سے چادر کو ہٹایا گیا تو ان کے اندازے کی تصدیق ہو گئی چارپائی پر ایک بڑا سا سانپ لیٹا ہوا تھا آناً فاناً لاٹھیاں ڈنڈے جمع ہو گئے اور وہ سب سانپ پر ٹوٹ پڑے اور ڈنڈے مار مار کر اسے بے حد زخمی کر دیا کمرے میں ہر طرف سانپ کا خون پھیلا ہوا تھا اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ سانپ نے جوابی حملے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مار مار کر جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب سانپ انہیں نقصان پہنچانے کی حالت میں نہیں ہے تو وہ پیچھے ہٹ گئے تبھی ان کی آنکھوں نے ایک عجیب حیرت انگیز منظر دیکھا سانپ کی جگہ بابا جی لیٹے دکھائی دے رہے تھے اور وہ بری طرح زخمی تھے، لوگ یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بدحواس بھی ہو گئے، بابا جی کو اس حالت میں دیکھ کر مولوی فیاض اپنا خوف بھول گیا اور تڑپ کر چارپائی کی طرف بڑھا۔

''اف یہ ہم سے کیا ہو گیا'' وہ زار و قطار روتا ہوا بار بار یہی فقرہ دہرائے جا رہا تھا۔

''میری بات سنو فیاض'' بابا جی کی مدھم سی آواز پر وہ رونا چھوڑ کر کان ان کے ہونٹوں کے قریب لے آیا ''خود کو دوش مت دو تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا یہی کرتا، قصور میرا ہے کہ میں آج طبیعت کی خرابی کی بنا پر سوتا رہ گیا اور روز کی طرح تمہارے آنے سے پہلے انسانی روپ میں نہیں آیا، لیکن ہر کسی نے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہی ہے تو میری واپسی کے لیے آج کا دن مقرر تھا'' بابا جی کی بات سن کر فیاض پھر زور زور سے رونے لگا۔

''مجھے معاف کر دیں بابا جی مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا'' فیاض ہاتھ جوڑے معافی مانگ رہا تھا۔

''اگرچہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے لیکن تمہاری تسلی کے لیے میں نے تمہیں معاف کیا، فیاض تم ایک اچھے انسان ہو۔ میں امید کرتا ہوں تم زندگی کی آخری سانس تک نیکی کی یہ شمع روشن رکھو گے'' فقرہ مکمل ہوتے ہی بابا جی نے دم توڑ دیا اور بھی کئی لوگ چارپائی کے قریب آ بیٹھے تھے اور بابا جی کی بات سن رہے تھے۔ بابا جی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے گاؤں میں ہر آنکھ اشک بار تھی ہر دل دکھ سے بھرا ہوا تھا لیکن ہر زبان پر بابا جی کے لیے کلمہ خیر تھا، دعائیں تھیں، اس گاؤں میں سانپ اور انسانوں کی دوستی اور محبت کی ایک نئی مثال قائم ہو چکی تھی جسے صدیوں تک یاد رکھا جانا تھا۔

☆☆☆

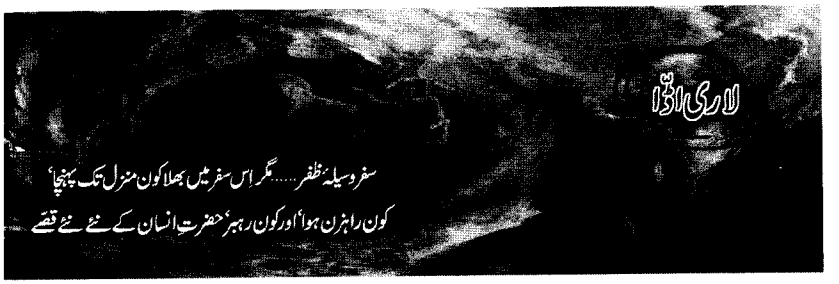

دیوانی میل!

ممتاز احمد

اُس ڈرائیور کی داستانِ حشر، جس نے ایک مسافر کو منزل سے دربدر کیا اور پھر خود بھی دربدر ہوگیا

لاری اڈے پر ایئر کنڈیشنڈ کوچ روانگی کے لیے تیار تھی۔ سواریاں ٹکٹ لے کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکی تھیں۔ صرف چند سیٹیں خالی تھیں۔ بھولا ڈرائیور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ گاڑی کا مالک منور بار بار اس کا موبائل نمبر ملا رہا تھا مگر ہر بار نمبر پاور آف ملتا۔ منور کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ جب پورے آٹھ بج گئے اور گاڑی کا اڈے سے نکلنے کا ٹائم ہوگیا تو منور غصے میں بھولے ڈرائیور کو گالیاں بکتا اور کوستا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اڈے سے نکالی اور روڈ پر لے آیا جہاں سے اس نے ایک دو سواریوں کو بٹھایا اور اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دور اگلے اسٹاپ پر ایک خشخشی داڑھی والے لمبے قد کے بندے نے گاڑی رکوانے کے لیے ہاتھ ہلایا تو منور نے بریک لگا دی اور بٹن پش کر کے ہائیڈرالک دروازہ کھول دیا۔ اس سے پہلے کہ منور اس سے پوچھتا کہ کہاں جانا ہے اس کا موبائل بجنے لگا اور وہ کال سننے میں مصروف ہوگیا۔

بس کا کنڈیکٹر گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھی سواریوں سے کرایہ وصول کر رہا تھا۔ سوار ہونے والا بندہ وہیں ڈرائیور سیٹ کے پاس انجن کے اوپر بنے ٹاپے پر بیٹھ گیا تو منور نے گاڑی چلا دی اور دروازہ بند کر دیا۔ اسی اثنا میں کنڈیکٹر بھی آگے آگیا اور اس نے پوچھا۔ ”بزرگو! کدھر جانا ہے؟“ اس نے کہا۔

”مجھے دو میل (ایک اسٹاپ کا نام) پر اتار دینا۔“

یہ سن کر کنڈیکٹر بک بک کرنے لگ گیا کہ یہ ٹائم والی گاڑی [illegible] نے چھوٹے اسٹاپ کی سواریاں نہیں بٹھانی۔

تو وہ بندہ عاجزی سے بولا۔ ”جناب ناراض نہ ہوں [illegible] مجھے وہاں جلدی پہنچنا ہے۔ آپ مجھے [illegible]“

اس پر کنڈیکٹر کوئی جواب دیتا۔ منور کال سن کر فارغ ہو چکا تھا اس نے ایک دم بریک لگا دی تو وہ بندہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور آگے کی طرف گر گیا [illegible] نے گالیاں بکنی شروع کر دیں کہ چلو دفع ہو [illegible]

اس [illegible] نے منت سماجت شروع کر دی کہ ”یہاں اتار [illegible] دو میل پر اتار دینا۔“

[illegible] نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔ ”چل اوئے اتر نیچے [illegible] کی گاڑی نہیں ہے۔“

[illegible] اپنی لال لال انگاروں کی طرح سرخ آنکھیں اس پر گاڑھ دیں اور کہا۔

”استاد جی گالی نہ دو۔“

اس پر منور اور غصے میں آگیا اور کہنے لگا۔ ”گالی نہیں میں تو گالیاں دوں گا تو کیا بگاڑ لے گا میرا۔“

اس بندے نے کہا۔ ”میں نے کیا بگاڑنا ہے اب وقت خود ہی تیرا سب کچھ بگاڑے گا بہت جلد۔“

اتنا سننا تھا کہ منور نے ایک بڑے زور کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور ساتھ ہی دھکا دیا تو وہ بندہ گاڑی سے باہر گر گیا۔ اس بندے کو شاید گرنے کی وجہ سے چوٹ لگی تھی۔ وہ درد سے کراہنے لگا۔ اس بندے کے گاڑی سے باہر گرتے ہی منور نے گاڑی چلا دی۔ جب گاڑی ضلع کی اختتامی حدود پر پہنچی تو ضلعی ٹیکس وصول کرنے والے عملے نے گاڑی روکوالی اور ادا شدہ ٹیکس کی پرچی طلب کی تو منور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا مگر اس کی کسی جیب سے پرچی نہ ملی اب منور اور عملے کے درمیان تو تکار ہونے لگی۔ منور کا کہنا تھا کہ اس نے لاری اڈے سے پرچی لی تھی جب کہ عملے کا کہنا تھا کہ اگر پرچی لی تھی تو دکھاؤ اس بات پر منور کا جھگڑا بھی ہوگیا۔ بالآخر پرچی نہ دکھانے پر گیارہ گنا جرمانہ منور سے وصول کیا گیا تب گاڑی کو جانے دیا گیا۔

فراٹے بھرتی تیز رفتاری کے ساتھ گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ گاڑی رک گئی۔ منور نے بہت سیلف مارے مگر گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ انجن سے ٹاپا (کور) اٹھا کر بغور چیک کیا مگر بظاہر کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ بار بار سیلف مارنے کی وجہ سے بیٹری کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔ اب گاڑی سیلف بھی نہیں اٹھا رہی تھی۔ مختلف پرزوں اور تاروں کو چھیڑنے ہلانے جلانے کے بعد کچھ

سواریوں کی مدد سے دھکا لگایا گیا تو گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

اسی اثناء میں وہی بندہ جس کو منور نے دھکا دے کر گاڑی سے نیچے پھینکا تھا وہ بعد میں آنے والی گاڑی سے اترا تو منور کی اور اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو وہ بندہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسٹاپ پر بنی ایک دکان میں داخل ہوا تو دکاندار نے خوش دلی کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

''سائیں جمال جی آپ آگئے۔'' ادھر منور نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے گالی دے کر کہا۔

''پتہ نہیں کس منحوس سے واسطہ پڑ گیا۔''

سواریاں اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئیں تو منور نے گاڑی چلادی۔ گاڑی نے ابھی پانچ یا چھ کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا کہ اس کا ایئر کنڈیشنڈ بند ہوگیا۔ کافی کوشش کے باوجود جب اے سی کا انجن نہ چلا اور گاڑی میں سخت گرمی، گھٹن اور حبس ہوگیا، سواریاں بھی بڑبڑانے لگیں تو گاڑی کے چھت پر بنے روشن دان کھول دیے گئے۔ منور نے گاڑی چلادی۔

موٹروے پر منور نے گاڑی اوور اسپیڈ سے چلانی شروع کردی کیونکہ اپنے مقررہ وقت سے وہ کافی لیٹ ہوگیا تھا اور ٹائم ضائع ہونے کی کسر نکالنے کے لیے گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے بھگانی شروع کردی مگر موٹروے پولیس نے اسے پکڑ لیا اور اسپیڈ لمٹ کراس کرنے کے جرم میں بھاری جرمانہ عائد کردیا۔

کچھ سواریوں نے شکایت کی کہ ''سب سے اے سی چار جز ٹکٹ کے ساتھ وصول کیے گئے ہیں مگر اے سی بند پڑا ہے۔''

تو منور کہنے لگا۔ ''میرا کیا قصور ہے اے سی خراب ہوگیا ہے۔''

سب سواریوں نے مطالبہ کیا کہ ''اگر اے سی خراب ہوگیا ہے تو اے سی چار جز کی مد میں کاٹے گئے پیسے واپس کیے جائیں۔'' مطالبہ جائز تھا۔ موٹروے سے پولیس کی مداخلت سے تمام سواریوں کو اے سی چار جز کے پیسے واپس کیے گئے۔

گاڑی پھر چل پڑی۔ گاڑی نے ابھی بمشکل بیس یا پچیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ گاڑی کا ڈیزل ختم ہوگیا۔ گاڑی پھر رک گئی۔ منور سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ ٹنکی فل تھی ڈیزل گیا کہاں؟ جب ٹنکی کا ڈھکنا کھول کر دیکھا گیا تو اس میں ڈیزل کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ موبائل سے کال کر کے موٹروے سے سروس والوں کو بلایا گیا تو انہوں نے دس لیٹر ڈیزل گاڑی کی ٹنکی میں ڈالا۔ ڈیزل کے پیسے اور سروس چارجز وصول کیے اور چلے گئے۔ منور نے گاڑی چلا دی۔ آگے آنے والے قیام وطعام ایریا میں واقع پیٹرول پمپ سے ڈیزل کی ٹنکی بھروائی اور گاڑی چلادی۔ گاڑی نے کوئی دس میٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ٹائر پنکچر ہوگیا۔ ٹائر بدلنے میں بیس سے پچیس منٹ لگ گئے۔ ٹائر کی تبدیلی کے بعد گاڑی کو چلے ابھی پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ گاڑی کا دوسرا ٹائر بھی پنکچر ہوگیا۔ پھر موٹروے سروس والوں کو بلایا گیا تو انہوں نے ٹائر کو پنکچر لگا کر دیا۔

خدا خدا کر کے گاڑی اپنی منزل پر پہنچی۔ پورے دو سے اڑھائی گھنٹے گاڑی لیٹ ہوئی سواریاں بھی کوس رہی تھیں کہ کس گھنیا گاڑی میں بیٹھی تھیں۔ واپسی سے پہلے منور نے گاڑی کا اے سی چیک کروایا تو وہ بالکل ٹھیک تھا اس میں کوئی خرابی نہیں تھی مگر حیرانگی اس بات کی تھی کہ وہ بند کیوں ہوگیا تھا جب کہ اے سی اب ٹھیک چل رہا تھا۔ واپسی کے لیے گاڑی اڈے پر لگادی مگر صرف دس سواریاں بیٹھی تھیں۔ اپنا ٹائم پورا ہونے پر اسے گاڑی اپنے اسٹینڈ سے نکالنی پڑی اور ایسا اتفاق ہوا کہ اسے اور کوئی سواری بھی نہ ملی اب وہ دس سواریوں کو لے کر آرہا تھا۔ وہ موٹروے سے اترا تو آگے ایک اسٹاپ پر آٹھ یا دس اسٹوڈنٹ کھڑے تھے انہوں نے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا مگر منور نے انہیں ایک غلط اشارہ کیا اور گالی دے کر گاڑی روکنے کی بجائے رفتار تیز کردی اور گاڑی ان کے پاس سے گزارتا ہوا فل اسپیڈ سے دوڑانے لگا۔

لاری اڈے آکر اس نے جب حساب کتاب کیا تو پتہ چلا کہ منافع کی بجائے پندرہ ہزار روپے کا نقصان ہوا ہے۔ منور سر پلڑ کر بیٹھ گیا۔ جب بھولا نامی ڈرائیور کو فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ رات سے بیمار ہے اس کا موبائل اس وجہ سے بند تھا کہ بیٹری بالکل نہ ہونے کی وجہ سے چارجنگ ختم تھی تو اس وجہ سے وہ اڈے پر آسکا اور نہ ہی اپنی بیماری کا بتا سکا تھا اب اگلے دن بھولے نے نہیں آنا تھا اس وجہ سے

منور کو اگلے دن خود آنا پڑا۔

اگلی صبح اس نے روانگی سے پہلے گاڑی کو اچھی طرح چیک کیا ہر چیز درست حالت میں کام کر رہی تھی۔ ساری سیٹیں فل تھیں چنانچہ گاڑی کو اڈے سے نکال کر روڈ پر ڈال دیا جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں کل اسوڈنٹ کھڑے تھے انہوں نے روڈ کو اس طرح بلاک کیا ہوا تھا کہ مجبوراً منور کو گاڑی روکنی پڑی۔ منور غصے کا بہت تیز تھا تو گاڑی سے اترتے ہی وہ اسٹوڈنٹس سے الجھ پڑا جس کا نتیجہ یہ نکلا انہوں نے منور کی خوب پٹائی کی مار مار کر برا حشر کردیا۔ کچھ سواریوں نے نیچے اتر کر منور کی ان سے جان چھڑائی تو وہ گاڑی لے کر گیا۔ آج بھی وہ موٹروے پر جارہا تھا تو ڈیزل ختم ہوگیا حالانکہ لاری اڈے کے پیٹرول پمپ سے ٹنکی فل کروا کر چلا تھا تو آج پھر موٹروے سروس والوں کو بلانا پڑا۔ شام کو جب منور گاڑی لے کر واپس اپنے شہر لاری اڈے پر پہنچا تو حساب کے بعد پتہ چلا آج پورے آٹھ ہزار کا نقصان ہوا ہے۔

منور گاڑی اڈے پر کھڑی کر کے گھر آگیا۔ رات کے ایک بجے اچانک گاڑی کو خود بخود آگ لگ گئی گو آگ بجھانے والی ایمرجنسی ریسکیو سروس 112 فوراً پہنچ گئی تھی مگر گاڑی جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔ منور کو اس کی اطلاع کردی گئی تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی پہنچ گیا جلی ہوئی گاڑی کا ڈھانچہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ لاکھوں روپے مالیت کی گاڑی خاکستر ہوچکی تھی۔

بھولا اسی گاڑی کا ڈرائیور تھا وہ صحت یاب ہوچکا تھا اگلے دن جب وہ اڈے پر آیا تو اسے پتہ چلا کہ گاڑی جل چکی ہے اس نے کہیں اور نوکری کرلی۔

منور ایک پسماندہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اسے شہری زندگی بہت اچھی لگی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس کا زیادہ تر وقت شہر میں گزرتا وہ شروع سے ہی بہت تیز طرار اور ہوشیار بندہ تھا گاؤں میں اس کے باپ کی تھوڑی سی زمین تھی مگر اسے زمینوں پر کام کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف شہر آگیا۔ صرف دس جماعتیں پاس تھا اور وہ بھی تھرڈ ڈویژن کے ساتھ..... اب اس تھوڑی سی تعلیم کے عوض اسے کہیں نوکری نہ ملی تو دربدر کی خاک چھاننے کے بعد اسے اپنے ایک دو جاننے والوں کی وساطت سے ایک بس میں کنڈیکٹر کی نوکری مل گئی۔ منور کے خواب بہت اونچے تھے۔ وہ ترقی کرنے کا خواہش مند تھا اسے کنڈیکٹری کرتے دو سال ہوگئے تھے مگر وہ ابھی تک اسی پوزیشن میں کھڑا تھا جہاں وہ دو سال پہلے تھا۔ ایک دن کوئی سواری دوران سفر بس میں اپنا بیگ بھول گئی تھی اور وہ بیگ منور کے ہاتھ لگ گیا رات گئے جب وہ بس کے ساتھ لاری اڈے پر آیا تو چپکے سے وہ بیگ اپنے رہائش والے کمرے میں لے آیا جب اس نے بیگ کھولا تو اس میں نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ وہ لاکھوں روپے تھے اس کے سہانے سپنوں اور خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے تھی۔ اس نے فوری طور پر وہ بیگ ایک خفیہ اور محفوظ جگہ پر چھپا دیا تھا۔ اگلے روز اس بیگ کا مالک تلاش اور پوچھ گچھ کے لیے اڈے پر آیا مگر منور صاف مکر گیا۔ بس کی مکمل تلاشی لی گئی اگر بیگ بس میں ہوتا تو ملتا۔ بیگ کا مالک پریشان، نڈھال اور صدمے کی کیفیت میں چلا گیا۔ تین یا چار ماہ کے بعد منور نے ان پیسوں سے ایک بس خرید لی اور خود چلانی شروع کردی۔ اس نے لاری اڈے میں سب کو یہ ہی بتایا کہ گاؤں کی زمین فروخت کر کے بس خریدی ہے۔ اب کس کے پاس اتنی فرصت تھی کہ وہ اس کے گاؤں جا کر اس بات کی تصدیق کرتا۔ آنے والے آٹھ سے دس سالوں میں منور ترقی کی منزلیں بہت تیزی سے طے کرتا گیا اب وہ چھ بسوں کا بلاشرکت اکیلے مالک تھا۔ جن میں دو بسیں ایئر کنڈیشنڈ تھیں اور چار نان اے سی۔ ان چھ بسوں کے ڈرائیور کنڈیکٹر اس نے رکھے ہوئے تھے۔ اب وہ خود اڈے پر بیٹھتا تھا اور سب گاڑیوں کا حساب کتاب لیتا تھا۔

جوں جوں اس کے پاس پیسہ آتا گیا اور اس کا دماغ خراب ہوتا گیا۔ وہ بد دماغ تو شروع سے ہی تھا مگر پیسہ آنے کے بعد انتہائی مغرور بدتمیز ہوگیا کسی کو خاطر میں نہ لاتا بات بات پر گالیاں دینا اور لڑائی جھگڑے پر اتر آنا اس کا شیوہ تھا۔ اس نے بھی کوئی خیر کا کام نہیں کیا تھا۔ اس کی بدمزاجی، بداخلاقی اور گالی گلوچ کی عادت کی وجہ سے ابھی تک اس کی شادی نہ ہوسکی تھی حالانکہ وہ بتیس سال کا ہو چکا تھا۔ اسے پیسے کی شدید ہوس تھی۔ انسانی رشتوں اور انسانی

قدروں کی اسے پروا تھی نہ قدر بس اس کا دین ایمان صرف اور صرف پیسہ تھا۔

منور کی ایک ایئر کنڈیشنڈ گاڑی بن گئی تھی۔ اس کا بہت بھاری نقصان ہوا تھا۔ آگ لگنے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ گاڑی کو خود بخود آگ لگنا انتہائی پراسرار اور حیرت کی بات تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آگ کیسے لگی۔ منور کو بہت دھچکا لگا تھا۔ کچھ دن گزرے تو منور کی دوسری ایئر کنڈیشنڈ گاڑی کا ڈرائیور اچانک نوکری چھوڑ کر چلا گیا تو سردست منور کو خود ہی گاڑی روٹ پر چلانی پڑی۔ لمبا سفر تھا جب تین گھنٹے کا سفر طے ہو گیا تو منور نے گاڑی ایک ہوٹل پر روکی سب سواریاں اتر کر چائے پانی اور کھانے پینے میں مشغول ہو گئیں۔ یہ وہ ڈرائیور ہوٹل تھا جہاں پر بس کنڈیکٹر اور ڈرائیور کو مفت کھانا دیا جاتا ہے اور چائے پلائی جاتی ہے۔ منور چونکہ گاڑی کا نائیک اور ڈرائیور تھا تو اس کے لیے اسپیشل مٹن تڑاہی کا آرڈر دیا گیا۔ تمام سواریاں حسب منشاء اپنی اپنی ضرورت اور پسند کی چیزیں کھانا وغیرہ کھا کر اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکی تھیں جب کہ منور کھانا کھانے میں مشغول تھا کیونکہ اس کے لیے اسپیشل کھانا تیار ہوا تھا جس میں تھوڑا ٹائم زیادہ لگ گیا تھا۔ رات کا ٹائم تھا منور جوں ہی گاڑی کے ڈرائیور دروازے کی طرف بڑھا گاڑی خود بخود چل پڑی اور چند منٹوں میں ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی منور سر پیٹتا رہ گیا اب وہ بدحواسی اور پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا اس نے کنڈیکٹر کا فون نمبر ملایا تو وہ مسلسل آف جا رہا تھا۔ منور حیران پریشان سکتے کی کیفیت میں بے بسی کے ساتھ اس جانب دیکھے جا رہا تھا۔ جدھر گاڑی گئی تھی۔ چند منٹ کے بعد ایک دوسری گاڑی جس نے منور کے روٹ پر ہی جانا تھا وہ چلنے لگی تو منور اس میں سوار ہو گیا۔

منور والی گاڑی روڈ پر انتہائی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ پہلے تو کسی نے غور نہیں کیا مگر اچانک اگلی سیٹوں پر بیٹھی سواریوں کی نظر ڈرائیور سیٹ پر پڑی تو وہ خالی تھی اور گاڑی بغیر ڈرائیور کے خود بخود چل رہی ہے تو انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا گاڑی میں بیٹھی تمام سواریاں خوفزدہ ہو گئیں ڈر کے مارے عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ کنڈیکٹر جو کہ گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف گیا تھا چند سیکنڈ کے لیے ایک خالی سیٹ پر جوں ہی بیٹھا تو اسے نیند آ گئی۔ عورتوں، بچوں کے چیخنے چلانے اور رونے دھونے کی آوازوں سے گاڑی میں خاصا شور شرابہ ہو رہا تھا۔ یہ آوازیں سن کر کنڈیکٹر کی آنکھ کھل گئی جب اس نے بغیر ڈرائیور کے گاڑی کو خود بخود چلتے دیکھا تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ جوں ہی ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھا تو گاڑی اسی وقت ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ لوگوں نے گاڑی کے رکتے ہی سکھ کا سانس لیا۔ اب کنڈیکٹر نے گاڑی کے ڈرائیور منور کو تلاش کیا منور گاڑی میں ہوتا تو ملتا پھر اس نے منور کا نمبر ملایا تو دوسری طرف بیل پر اس نے کال اٹینڈ کر لی منور سمجھ رہا تھا کہ گاڑی کنڈیکٹر چلا کر لے گیا ہے تو اس نے مغلظات بکنی شروع کر دیں کنڈیکٹر نے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ گاڑی خود بخود چل پڑی تھی اب فلاں جگہ پر خود ہی رک گئی ہے۔

منور نے اسے بتایا کہ وہ دوسری گاڑی پر بیٹھ کر آ رہا ہے۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ پہنچ گیا۔ تمام سواریوں سمیت وہ سخت حیران تھا کہ گاڑی خود بخود چل کر یہاں کیسے پہنچی خیر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور منزل کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چھناکے سے گاڑی کی ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی اور اسی وقت بہت تیز موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کی بوچھاڑ اندر تک آ رہی تھی سواریوں کے کپڑے اور سامان بھیگ گیا بڑی مشکل سے گاڑی اپنی منزل پر پہنچی۔ اگلے دن گاڑی کی نئی ونڈ اسکرین ڈلوائی گئی۔ واپسی پر گاڑی میں کوئی نہ کوئی خرابی ہوتی رہی کبھی ریڈی ایٹر لیک ہو جاتا کبھی ٹائر پنکچر ہو جاتے پھر گاڑی کا انجن سیز ہو گیا تو مجبوراً سواریوں کو ان کا کرایہ واپس کر کے دوسری گاڑی میں بٹھانا پڑا۔ اب منور اور کنڈیکٹر دونوں گاڑی میں رہ گئے۔ کنڈیکٹر نے ایسے ہی گاڑی کو سیلف مارا تو اسٹارٹ ہو گئی۔ اب وہ دونوں گاڑی لے کر اپنے شہر آنے کا اتفاق [illegible] راستے میں کوئی سواری نہ ملی۔ گاڑی [illegible] پہیا [illegible] لرائی تو اس نے انجن کو درست اور [illegible] دیا۔ آج بھی منور کا کافی نقصان ہوا تھا۔ اگلے روز وہ رات [illegible] ٹائم گاڑی لے کر اڈے سے نکلا جب وہ اپنے [illegible] پچاس کلو میٹر دور پہنچا تو گاڑی کا رخ خود بخود [illegible] کی طرف ہو گیا۔

منور اپنی دھن اور سوچ میں مگن تیز رفتاری سے گاڑی چلائے جا رہا تھا۔ تمام سواریاں اپنی اپنی سیٹوں پر سو رہی تھیں جب کہ کنڈیکٹر بھی دروازے کی جانب پہلی سیٹ پر خواب خرگوش کے مزے لوٹتا رہا۔ پانچ گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی ایک شہر میں رات کے بارہ بجے پہنچی تو یہ شہر اس کی منزل سے بالکل متضاد تین سو کلو میٹر کی دوری پر تھا۔ منور اپنا سر پیٹ کر رہ گیا کہ یہ کیسے ہو گیا جانا کہیں اور تھا اور وہ پہنچ کہیں اور گیا تھا۔ اب اس سے پہلے کہ سواریاں شور وغل کرتیں اس نے وہیں سے گاڑی کا رخ اپنی منزل کی طرف موڑ دیا۔ ایک پیٹرول پمپ سے ٹنکی فل کروائی اور گاڑی دوڑا دی۔ صبح چھ بجے وہ اپنی منزل پر پہنچا جب کہ اسے رات بارہ بجے یہاں پہنچنا تھا۔ سواریاں بہت لیٹ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے منور کو خوب لعن طعن کی اور کانوں کو ہاتھ لگایا کہ آئندہ وہ اس کمپنی کی گاڑی میں سفر نہیں کریں گی۔ اب آئے روز منور کی گاڑیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو جاتا بالخصوص جب بھی گاڑی دسویں میل پر پہنچتی گاڑی کی کوئی نہ کوئی چیز ٹوٹ جاتی نتیجتاً گاڑی کی مرمت پر ہزاروں روپے خرچ ہو جاتے اب دن بدن آمدنی کی بجائے خسارہ ہونے لگا۔ پندرہ دن کے اندر اندر منور کا لاکھوں روپے نقصان ہو گیا۔ منور کی گاڑیاں اڈے پر کھڑی رہتیں مگر ان میں کوئی سواری نہ بیٹھتی تو سب گاڑیوں کے ڈرائیور کنڈیکٹر نوکری چھوڑ گئے۔ اب ایک ایک کر کے منور نے تمام گاڑیاں فروخت کر دیں جن کے عوض اسے دو کروڑ روپے ملے تھے۔ اب منور کوئی اور کاروبار کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ شام کے وقت اسے گاڑیوں کے پے منٹ ملی تھی بینک بند ہو چکے تھے اس نے روپوں والا بیگ ٹی وی کے اوپر رکھ دیا اور کمرہ لاک کر کے وہ ٹی وی دیکھنے میں مشغول ہو گیا اس کا پروگرام تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی ساری رقم بنک میں جمع کروا دے گا۔ رات کے بارہ بجے اچانک ٹی وی چلتا چلتا بند ہو گیا۔ جیسے ہی ٹی وی بند ہوا منور بھی گہری نیند سو گیا اور دن چڑھے تک سوتا رہا۔ صبح اٹھ کر اس نے غسل کیا کپڑے بدلے اور پیسوں والا بیگ لے کر بنک پہنچا اس نے دو کروڑ کی سلپ فل اپ کی اور جیسے ہی پیسے نکالنے کے لیے بیگ کھولا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ نوٹوں کی جگہ سفید کاغذوں کی گڈیاں تھیں جسے دیکھ کر صدمے سے وہ بے ہوش ہو گیا اسے فوری طور پر اسپتال شفٹ کیا گیا جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد اسے ہوش تو آ گیا مگر وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی حالت سنبھلتی گئی مگر اکثر وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا۔

لاری اڈے میں ہی اس کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی تو انہوں نے اس کی حالت اور ساری داستان سن کر بتایا کہ وہ بندہ جس کو گالیاں دے کر تھپڑ مار کر گاڑی سے نیچے پھینکا تھا وہ انسان نہیں تھا۔ اس کا تعلق کسی پراسرار مخلوق سے تھا۔ منور کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا یہ سب اس کی بددعا کا نتیجہ تھا اگر ہو سکے تو اسے تلاش کر کے معافی مانگو ہو سکتا ہے اگر اس نے معاف کر دیا تو تمہارے لیے آنے والے وقت میں کچھ بہتری ہو سکے۔ منور کی نگاہوں میں وہ سارا منظر فلم کی طرح چلنے لگا اسے یاد آ گیا کہ دسویں میل پر جب اس کی گاڑی کا انجن خراب ہوا تھا تو وہ بندہ بھی تھوڑی دیر بعد پہنچ گیا تھا اور ایک دکاندار نے اسے سائیں جمال جی کے نام سے پکارا تھا۔ اب حالت یہ تھی کہ منور کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اب وہ دسویں میل کے اسٹاپ پر جانا چاہتا تھا وہ ایک گاڑی میں سوار ہوا مگر کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے کنڈیکٹر نے برا بھلا کہتے گاڑی سے دھکا دے کر اتار دیا۔ اسے کوئی بھی گاڑی والا بٹھا نہیں رہا تھا تو وہ پیدل چل پڑا اور دو گھنٹے کے بعد دسویں میل کے اسٹاپ پر پہنچا مگر اسے نہ تو وہاں کوئی دکان ملی اور نہ ہی دکاندار جس نے اس بندے کو سائیں جمال جی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ منور نے اردگرد کا پورا علاقہ اور آبادی چھان ماری مگر اسے سائیں جمال کا سراغ نہ ملا وہ ہر بندے کے پاس جا کر سائیں جمال کا پوچھتا مگر کہیں سے بھی پتہ نہ چل سکا۔ آج بھی دسویں میل پر منور پرانے کپڑے پہنے بھیک مانگتا نظر آتا ہے اور ہر گزرنے والے کو سائیں جمال سمجھتا ہے اور معافیاں مانگتا ہے لوگ اسے پاگل دیوانہ سمجھ کر بھیک کے سکے اس کے آگے اچھال دیتے ہیں۔

☆☆☆

سفر نامہ

برف کے شہر

قمر علی عباسی

پاکستان کی برف پوش وادیوں کی سیر کراتا ایک منفرد سفر نامہ قمر علی عباسی کے قلم کا جادو

تیسرا حصہ

اکرم خان نے ہمارے لیے پروگرام بنایا۔ ایک جیپ میں وادی ہنزہ کی سیر کریں گے۔

''راستے برف سے بند نہیں ہوں گے۔'' ہم نے پوچھا۔

''جیپ سے آسانی ہوگی۔'' اکرم بولے۔

''آپ دنیا کی چھت پر پہنچ جائیں گے۔'' غلام حسین نے کہا۔

چھت تک ٹھیک ہے اس سے آگے.....'' ہم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اس کے لیے چھت پر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' اکرم خان نے کہا سب ہنسنے لگے۔

ریڈیو اسٹیشن کی عمارت کے باہر آہستہ آہستہ اندھیرا اترنے لگا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ برفباری نہیں ہوئی۔

''آیئے آپ کو یہاں کا سب سے اچھا کھانا کھلواتے ہیں۔'' اکرم خان بلتی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھے کا فیصلہ ہم کریں گے کھا کر۔'' ہم نے کہا۔

ہمارا قافلہ گلگت کے بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت ہم بلتستان میں تھے۔ اس میں اسکردو، کھرمنگ اور کھرمنگ شامل ہیں، جو نومبر 1947ء میں ڈوگرہ راج سے آزاد ہوئے۔ ایک طرف تبت دوسری طرف افغانستان ہے۔ یہاں دنیا کی دوسری بڑی چوٹی کے ٹو ہے۔ زیادہ تر علاقہ پہاڑی ہیں اس کو ماضی میں ''درستان'' کہا جاتا تھا آبادی کا تعلق آریائی نسل سے ہے۔ اس علاقہ میں ہندو، پارسی اور مسلمان حکمرانوں [illegible] بھی یہاں ہندو راجہ آجاتے اور کبھی [illegible] اس علاقے میں انگریزوں نے بھی [illegible] جب برصغیر میں پاکستان قائم ہوا تو [illegible] نے بھی ڈوگرہ راج ختم کیا۔ اس [illegible] آزادی بلند کیا اور اس میں کامیاب [illegible] پاکستان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

شہدائے جنگ آزادی گلگت کی یادگار باغ گلگت میں بنائی گئی ہے جس کے مینار پر مارخور کا مجسمہ لگا ہے۔ یہ ان لوگوں کی یاد تازہ رکھتی ہے جنہوں نے ڈوگرہ راج ختم کرنے میں اپنا خون دیا۔ سلام ان جانبازوں کو۔

اس علاقے میں بلتی، شینا، بروشکی، کھوار، وخی جیسی قدیم زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان سب کے درمیان وہ زبانیں مشترک ہیں ایک ''محبت'' اور دوسری اردو۔ بلتستان کا رقبہ 27 ہزار مربع میل سے زیادہ ہے جہاں رسم و رواج، رہن سہن، شاعری اور قدیم لوک کہانیاں لوگوں کے درمیان آج بھی موجود ہیں۔

وادیٔ ہنزہ

صبح سویرے وادیٔ ہنزہ روانگی تھی۔

آج موسم کے مزاج بدل رہے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ برف باری کا امکان تھا۔ دس بجے جیپ میں سوار ہوئے۔ ہمارے ساتھ غلام حسین، عبدل السلام تھے۔ محمد حنیف ڈرائیور تھا۔ اس کی ماں کی طبیعت خراب تھی۔ پروگرام بنا تھا وہ ہمیں کریم آباد میں چھوڑ کر اپنے گاؤں چلا جائے گا ہم ایک رات ہوٹل میں قیام کریں گے۔ دوسرے دن محمد حنیف والدہ کو دیکھ کر واپس آجائے گا۔ وہ گھر ہو آئے گا ہم وادیٔ ہنزہ دیکھ لیں گے۔

وادیٔ ہنزہ کا آخری شہر کریم آباد ہے۔ گلگت سے اس کا فاصلہ 100 کلومیٹر ہے۔ یہاں شاہراہ قراقرم ہے۔ جو پہلے سلک روٹ کہلاتی تھی۔ ڈھائی تین گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں لیکن راستے کے قصبے، گاؤں، پہاڑ دیکھتے جائیں تو دیر ہو جاتی ہے۔ کریم آباد کی بلندی 2440 میٹر ہے۔ گلگت دریائے گلگت کے کنارے آباد ہے۔ وادیٔ ہنزہ جانے کے لیے اسے پار کرنا ہوتا ہے۔ بازار سے پھل اور بادام خوبانی لے کر دریائے گلگت پہنچے۔ دوسری طرف جانے کے لیے پل لکڑی کے تختوں سے بنا تھا۔ یکطرفہ تھا۔ ادھر سے گاڑی آتی تو اس طرف ٹریفک رک جاتا۔ اس جانب سے روانہ ہوتی تو وہاں گاڑیاں روک لی جاتیں۔

پل تنگ تھا۔ صرف ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔

لوگ موٹر سائیکل پر بھی جا رہے تھے۔ دو چار پیدل بھی نظر آئے۔

ہماری گاڑی دریا کے کنارے پر رک گئی۔ ایک کے بعد دوسری گاڑی آئی تب ہمارا سفر شروع ہوا۔ جیپ آہستہ چل رہی تھی۔ پھر بھی پل ہلتا محسوس ہوا۔ یہاں گاڑی میں یا اللہ خیر نہیں لکھا تھا لیکن دل میں یہ ہی بار بار روشن ہوتا۔

غلام حسین اس علاقے کے بارے میں بتا رہے تھے لیکن ہماری توجہ ہلتے ہوئے پل اور بہتے دریا پر تھی۔

خدا خدا کر کے خوف کے لمحے گزرے ہم دوسری سمت پہنچ گئے۔ وہاں گاڑیاں کھڑی تھیں ان کا سفر شروع ہوا۔

جیپ خشک پہاڑوں کے درمیان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ بیچ میں بڑے بڑے پتھر آجاتے، خودرو جھاڑیاں تھیں اور دور نزدیک آتے پہاڑ۔ ایک بورڈ آیا اس پر لکھا تھا ''رحیم آباد'' اس کے بعد ہلکی برف باری شروع ہوگئی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ پہاڑ پتھر اور سڑک کے دونوں طرف برف جمع ہو رہی تھی۔ ہم برف باری کے علاقے میں تھے۔ کچھ دیر بعد ایک گاؤں آگیا دائیں طرف چھوٹی دکانیں تھیں۔ ڈرائیور نے ایک ہوٹل کے سامنے جیپ روک دی۔ یہاں چائے پی کر تازہ دم ہونا تھا۔ ہم نے ارکر دیکھا پہاڑ پر ایک بڑا گلیشیئر رکھا تھا جس کا ایک سرا نیچے تک آیا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا اس جگہ رہنے والے ہر وقت خطرے سے دوچار ہوتے ہوں گے جانے گلیشیئر اوپر سے سرک آئے۔

ہوٹل کا مالک غلام حسین کا جاننے والا تھا۔ ہمیں ایک میز کے گرد بٹھا دیا جو اس چولھے کے نزدیک تھی۔ جس پر چائے بن رہی تھی۔ یہاں خاصی سردی تھی۔ اچانک ہم نے ایک طرف دیکھا ایک بڑا سا پنکھا لگا تھا۔ جس پر ایک پٹہ پڑا تھا جو

نیچے آکر پتھر کے اوپر رکھی سل سے ملتا تھا ہم نے حیرت سے دیکھا اور پوچھا یہ کیا ہے؟ ''پن چکی'' غلام حسین نے بتایا۔ اس میں چنا، باجرہ پیسا جاتا ہے پھر وہ ہمیں اس کے نزدیک لے گئے اور بتایا کہ اوپر سے پانی پنکھے کے پروں پر گرتا ہے جس سے وہ گھومتا ہے اور پٹے کے ذریعے چکی کو چلاتا ہے اور یوں آٹا پستا ہے ہم نے اس طرح کی چکی پہلی بار دیکھی تھی نہ اس میں بجلی درکار نہ کوئی اور ایندھن جب آٹا پیسا نہیں ہوا تو پٹہ نکال دیا۔

ہم نے اپنے اس ڈر کا اظہار کیا کہ گاؤں والے بالکل گلیشیئر کے زیر سایہ ہیں یہ کسی وقت بھی پگھل سکتا ہے پھر کیا ہوگا؟

ہوٹل کے مالک بھی آگئے تھے انہوں نے غلام حسین کو بتایا کہ یہ گلیشیئر مرد ہے جو کچھ پگھلتا نہیں ٹوٹ جاتا ہے ہم یہ بات پہلے بھی سن چکے تھے۔ ہوٹل کے مالک بتا رہے تھے جب پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم اس کے کسی حصے پر برف ڈال دیتے ہیں اور وہ حصہ پگھل جاتا ہے۔

ہم نے اس گلیشیئر کو ایک بار پھر دیکھا جسے ہوٹل کا مالک ''مرد'' کہہ رہا تھا۔

ہم نے جب پہلی بار سنا تھا کہ گلیشیئر مرد بھی ہوتے ہیں اور اسی وقت پگھلتے ہیں جب نرم و سفید برف اس پر ڈالی جائے۔ یہ سب اچھا لگا مرد کی یہ ہی شان ہے کہ حسن و جمال اور نرم و نازک صنف کی آواز سے بھی نرم پڑ جائے۔

چائے خانے میں حنیف ڈرائیور کو ایک اور ویگن کا ڈرائیور مل گیا جو اس کے گاؤں سے آرہا تھا اس نے بتایا کہ حنیف کی والدہ کی طبیعت بے خراب ہے اور بچنے کی امید نہیں۔ یہ اطلاع پاکر حنیف پریشان ہوگیا۔ ہم سب نے سمجھایا اسی طرف جارہے ہیں کریم آباد پہنچ کر تم اپنے گاؤں چلے جانا خدا سب خیر کرے گا۔

پہاڑی علاقوں میں بڑی سہولت یہ ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لوگ اطلاعات پہنچا دیتے ہیں اور بعض اوقات سامان بھی لاتے لے جاتے ہیں۔

ہم جب تک کریم آباد نہیں پہنچے کئی بار حنیف کو اس طرف سے آنے والے ڈرائیور کی زبانی اپنی والدہ کی طبیعت کا حال معلوم ہوتا رہا۔ ہم سب ان کی خیریت کے لیے دعا کرتے رہے۔

گلگت سے کریم آباد تک چھوٹے بڑے بہت سے ایسے گاؤں آتے ہیں جس میں خوبانی کثرت سے ہوتی ہے خاص طور سے چھلت گاؤں۔ یہ پھل جلدی خراب ہوجانے والا ہے اسی لیے اسے خشک کرلیا جاتا ہے۔ لوگوں نے اپنے گھروں میں اور بعض نے دکانوں میں خوبانی خشک کرنے کی مشین لگائی ہیں لیکن ان کا ایک روایتی پرانا دیسی طریقہ بھی ہے۔ اگست کے شروع میں خوبانی کی فصل تیار ہوتی ہے اسے سوکھنے کے لیے چھتوں پر پھیلا دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کے دو ٹکڑے کر کے اس میں سے گٹھلی نکال لیتے ہیں اور پھر سکھا لیتے ہیں۔ گٹھلی میں سے بیج نکلتا ہے۔ جس کی شکل اور ذائقہ بادام سے ملتے ہیں۔ اس سے تیل نکالا جاتا ہے جو خاصا مہنگا ہوتا ہے۔ اسے خاص خاص کھانوں میں استعمال کرتے ہیں۔

خوبانی تقریباً ہر گاؤں میں سکھائی جاتی ہے جو کھانوں اور مٹھائیوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ گلگت کے علاوہ پاکستان کے دوسرے شہروں کو بھی بھیجی جاتی ہے۔

اس علاقے میں اسماعیلی امام پرنس کریم آغا خاں کو ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ زراعت، صنعت اور تجارت میں مصروف رہتے ہیں۔ پرنس آغا خان نے اس علاقے میں بہت کام کروایا ہے۔ کشادہ سڑکیں بنوائیں بجلی پیدا کرنے کے لیے جنریٹر لگوائے، زراعت کی ترقی اور صنعت کے فروغ کے لیے اس علاقے کی بہت مدد کی۔ ہم نے اکثر ہوٹلوں میں پرنس کریم آغا خان کی رنگین تصویریں نمایاں جگہ پر لگی دیکھی ہیں۔ ہماری جیپ پہاڑوں کے درمیان سے گزر رہی تھی جیسے جیسے آگے بڑھ

رہے تھے برف باری میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک خوب صورت گاؤں آیا جسے دیکھ کر کسی بھی شہر کی صاف ستھری فوجی چھاؤنی سمجھا جاسکتا تھا پھلوں کے درخت برف اوڑھے کھڑے تھے۔ موسم گرما میں جس میں شگوفے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ایسے پھل پیدا کرے گا جو تازگی صحت فرحت دیں گے۔

یہاں ایک ریسٹورنٹ تھا صاف ستھرا ہم سب ٹھہر گئے چائے پی گئی اور پھر جیپ بلندیوں کی طرف روانہ ہوگئی۔ وادیٔ ہنزہ کی آخری بستی ''کریم آباد''

کریم آباد

کریم آباد کا پرانا نام بلتت ہے لیکن اب اسماعیلی عقیدے کے روحانی پیشوا پرنس کریم آغا خان کے نام پر ''کریم آباد'' رکھا گیا ہے۔ اس کی بلندی دو ہزار چار سو چالیس میٹر ہے۔ آس پاس سر اٹھائے پہاڑ ہیں۔ ایک طرف راکا پوشی جس کی بلندی 7780 میٹر ہے دوسری طرف اترکی چوٹی جو 7,388 میٹر بلند ہے۔ ایک طرف ڈارن جس کی اونچائی 7,257 ہے۔ یوں سمجھیں بلند پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی خوبصورت بستی۔ ہم پہنچے تو سنہری دھوپ ہر طرف پھیلی تھی کئی دن پہلے برف باری ہوئی تھی اس کے نشانات تھے۔ موسم خاصا سرد تھا۔

محمد حنیف ڈرائیور نے ہمیں بازار میں اتارا اپنے گاؤں روانہ ہوگیا۔ ہم نے غلام حسین سے پوچھا۔ ''اس کا گاؤں کہاں ہے؟''

وہ ایک دکان کی پشت پر لے گئے جس کے آگے چٹان تھی اور پھر نیچے اشارہ کیا۔ ''وہ دور نظر آیا؟''

ہمیں سوائے دھند کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ نہ جانے اس کا فاصلہ کتنا ہے اور حنیف کو وہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔ ہم لوگ کریم آباد کے بازار سے نکل کر گھروں کی طرف گئے جہاں ایک بڑی عمارت تھی یہ آغا خان اسکول تھا اس پر وہی رنگ تھا جو ہمارے شہر میں آغا خان اسپتال کا ہے۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ آغا خان کے رفاہی اداروں کی عمارتوں کا رنگ دنیا بھر میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ اسکول چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا ہم چکر لگا کر پھر بازار میں آگئے جہاں دکانوں پر ضرورت کی ہر چیز ملتی تھی۔ پھل، سبزیاں، گوشت، خشک میوہ جات، سردیوں کے کپڑے، ایک دکان میں فون کرنے کی سہولت بھی تھی۔ اس کے ساتھ کریم آباد جنرل اسٹور جہاں مختلف رنگ کے پتھر فروخت کے لیے رکھے تھے۔ غلام حسین نے بتایا یہ قیمتی پتھر ہیں اور یہاں سستے مل جاتے ہیں۔ عبدالسلام اپنے لیے منتخب کرنے لگے۔ یہ پتھر رنگ برنگے دلکش تھے۔ ہمیں یاد آیا ریڈیو پاکستان کے ایک ساتھی ظفر کرمانی ایک بار اسکردو گئے تو بہت سے پتھر قیمتی سمجھ کر خرید لائے کراچی آکر معلوم ہوا جو نوٹ انہوں نے دکاندار کو دیے تھے وہ زیادہ قیمتی تھے۔ غلام حسین اور عبدالسلام کے اصرار کے باوجود ہم نے ان پتھروں کو دیکھنے اور ہاتھ لگنے میں صرف دلچسپی لی۔ جب تک عبدالسلام نے مول تول کیا دکاندار نے گرم قہوہ منگوالیا۔ کئی اور اسٹور دیکھے ایک جگہ سے گزر رہے تھے تو سلام نے ایک پرنالہ دکھایا وہ جما ہوا تھا۔ نزدیک جاکر دیکھیں تو اندر سے پانی بہتا نظر آرہا تھا۔ غلام حسین نے بتایا اس وقت ٹمپریچر منفی دس اعشاریہ ہے۔ ہمیں دھوپ کے باوجود سردی محسوس ہونے لگی ہم سب کسی ہوٹل میں کمرہ بک کروانے کے لیے پلٹے تو بازار کے سرے پر ہوٹل ''ورلڈ روف'' مل گیا۔ یہ تقریباً بند تھا۔ استقبالیہ پر ہوٹل کے مالک امجد شاہ موجود تھے انہوں نے ازراہ عنایت ہمارے لیے کمروں کا بندوبست کیا اور ہم لوگوں کو استقبالیہ پر انتظار کرنے کے لیے کہا تاکہ کمروں کے آتش دان گرم کرسکیں اس عرصے میں انہوں نے چائے منگوائی جو اس موسم میں پسند آئی۔

کریم آباد میں سردی بڑھتی جارہی تھی اور

سورج ڈوب چکا تھا۔ بازار میں کچھ دکانیں ابھی کھلی تھیں اور بجلی کی کمی کی وجہ سے جنریٹر سے روشنی کا انتظام کیا گیا تھا پہلے یہ خیال تھا کہ کھانا باہر نکل کر کسی ریسٹورنٹ میں کھایا جائے لیکن ہوٹل کے مالک نے بتایا کہ صرف ریسٹورنٹ کھلا ہے اور وہ بھی ذرا فاصلے پر ہے اس سردی کے موسم میں کوئی بھی باہر نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے اس جگہ کھانے کا پروگرام بنایا اور اپنی پسند امجد شاہ کو بتادی۔ اچانک دیکھا کہ ڈرائیور محمد حنیف واپس آگیا۔ ہم سب حیران ہوئے اس نے بتایا کہ لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے اس کے گاؤں کا راستہ بند ہوگیا ہے اور اسے صاف ہونے میں کم سے کم دو دن لگیں وہ واپس آگیا ہے تاکہ ہمیں گلگت چھوڑ دے اور پھر واپس اپنے گاؤں جانے کا انتظام کرے۔

محمد حنیف کچھ دیر پہلے بھی آجاتا تو ہم واپس نہیں جاسکتے تھے کیوں کہ اندھیرا ہوتے ہی سفر دشوار ہوجاتا ہے۔

غلام عباس نے محمد حنیف کے لیے بھی کمرے کا انتظام کروایا اور ہم سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

سپاہیوں کی آمد

سکندر اعظم یونان کے بادشاہ فلپس کا بیٹا تھا۔ کسی نے اس کے والد کو قتل کردیا اور سکندر کو بادشاہت مل گئی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ تلوار سنبھالی اور سپاہیوں کے ساتھ دنیا کو فتح کرنے نکلا۔ تباہی، قتل و غارت گری ہر طرف مچادی۔ اب اس سے کون پوچھتا تمہارے والد کو قتل کرنے والے ہم لوگ نہیں۔ وہ انسانی بستیاں اجاڑتا لوگوں کا خون بہاتا ایران پہنچا اور شہروں کو تباہ کردیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔

راجا پورس سے جنگ کے دوران اس کا گھٹنا زخمی ہوگیا بس غصے میں آکر بہت سے گاؤں اور وہاں کے لوگوں کو جلادیا۔

ایران میں قتل و غارت گری جاری تھی کہ اس کے تین جنرل ایران کی تین لڑکیوں پر عاشق ہوگئے اور شادی کرلی۔ سکندر شاید اس بات پر برا نہ مانتا لیکن ہوا یہ کہ ان جنرلوں نے محبت کے جوش میں اپنی بیویوں کو سکندر کے لیے حملے کے منصوبے سے آگاہ کردیا۔ یہ بات غداری میں شمار ہوئی۔ سکندر یوں بھی غصے سے بھنایا رہتا تھا جب اسے یہ بھنک پڑی تو جیسے اس کے کسی بھڑ نے کاٹ لیا اور وہ تڑپ کر اٹھا اور تلوار نکال لی۔ جب یہ خبر جنرلوں تک پہنچی تو انہوں نے اپنی اپنی بیویوں سے کہا۔ چلو بھاگو بیویاں پہلے سے ڈری سہمی تھیں وہ ان سے پہلے تیار ہوگئیں جب وہ بھاگے تو ان کے حمایتی فوجی بھی ان کے ساتھ ہولیے۔ یہ لوگ چھپتے چھپاتے ایک پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں کوئی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا تھا، سنا ہے ان لوگوں نے اس علاقے کے بیشتر لوگوں کو قتل کردیا، ہوسکتا ہے یہ افواہ سکندر اعظم کے حمایتیوں نے اڑائی ہو لیکن یہ لوگ تباہی بربادی اور قتل و غارت گری کے عادی تھی کیا خبر سب کو مار دیا ہو۔ جس علاقے میں یہ جنرل سپاہیوں کے ساتھ آئے تھے وہ ہنزہ کا علاقہ ہے۔ یہ بات 320 قبل مسیح کی ہے۔ یہ عرصے تک وہاں حکمرانی کرتے رہے اور کیوں کہ سرحد چین سے ملتی ہے اس لیے ان سے بھی زور آزمائی کرتے رہے اس کے بعد حکمران بدلتے رہے۔

ہنزہ کی سرحدیں افغانستان، روس، چین اور کشمیر سے ملتی ہیں۔ ایک درہ کلک روس سے ملاتا ہے اور دوسرا ''من ٹالو'' چائنا لے جاتا ہے۔ اس علاقے میں جب اسلام کی روشنی آئی تو حکمران بھی مسلمان ہونے لگے اور ان لوگوں نے جنگ وجدال چھوڑ کر پرامن زندگی گزارنے کے لیے آس پاس کے ملکوں سے دوستی کرلی۔ آج بھی ایرانی لوک کہانیوں میں جنگجو بہادروں اور لڑائیوں کا حال پڑھا جاتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں اس علاقے میں انگریز آئے اور اپنی حکومت قائم کی انیسویں صدی

میں کشمیر کی ڈوگرہ فوج نے اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔

1947ء میں جب برصغیر آزاد ہوا تو ہنزہ والوں کو بھی خیال آیا کہ ہمیں بھی آزاد ہونا چاہیے اس لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈوگرہ فوج کو مار بھگایا۔ یکم نومبر 1942ء کو یہ مکمل آزاد ہوگیا اور اس نے پاکستان سے الحاق کرلیا۔

وادی ہنزہ سو میل لمبی اور ایک میل چوڑی ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی 20590 میٹر ہے اس میں بے شمار پہاڑ اور گلیشیئر ہیں۔ راکا پوشی، التر بیک کے علاوہ بھی بہت سی بلند چوٹیاں ہیں جنہوں نے انسان کی ہمت کو للکارا تھا اور کوہ پیما انہیں سر کرنے میں کامیاب ہوگئے اب یہاں کوئی ایسی چوٹی نہیں ہے جو انسانی قدم کے نیچے نہ آئی ہو۔

اس وادی میں گلیشیئر، چشمے اور معدنیات پائی جاتی ہیں۔ جگہ جگہ سانس روکنے والے مناظر ہیں۔ وادی ہنزہ میں رسیلے پھل پیدا ہوتے ہیں خاص طور پر خوبانی کی بہتات ہے۔ اگست کے وسط سے یہاں کے گھر کی چھتیں خوبانیاں خشک کرنے کے کام آتی ہیں۔ یہ روایتی طریقہ ہے اس کی گٹھلی سے بیج نکالا جاتا ہے جس میں سے تیل نکالتے ہیں اور بچا ہوا گٹھلی کا حصہ سردی میں ایندھن کے کام آتا ہے۔

وادی ہنزہ میں خوبانیاں رسیلی، لذیذ اور ذائقے دار ہوتی ہیں۔ یہ مٹھائیاں اور کھانوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ بہت سے رسیلے پھل ہوتے ہیں۔ وادی ہنزہ کے بارے میں کہا جاتا ہے یہاں کے باشندے ڈیڑھ دو سو سال کی عمر پاتے ہیں اور صحت مند رہتے ہیں۔ ہم نے جب یہ سنا تو درازی عمر کی ترکیب پوچھنے لگے تب دو باتوں کا علم ہوا۔ اول تو یہ کہ یہ لوگ اپنی پیدائش کا ریکارڈ نہیں رکھتے، دوسرے یہ کہ جب کوئی آدمی ذہانت کی بات کرتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ بات اس نے لمبی عمر کی وجہ سے حاصل کی ہے اس طرح اگر پچاس ساٹھ سال کی عمر کا شخص کوئی کام کی بات کہتا ہے تو اسے سو سال کا سمجھا جاتا ہے کاش ہم وہاں رہتے تو لوگ ہمیں بھی دو ڈھائی سو سال کا سمجھتے جہاں تک صحت کا سوال ہے اس علاقے کے لوگ کبھی اپنی صحت کا معائنہ نہیں کرتے۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس بیماری کی وجہ سے جان گئی۔ ہمارا خیال ہے انہیں بہت سی بیماریاں ہوں گی کیوں کہ سردی کے موسم میں ان کا زیادہ گزر بسر گوشت پر ہوتا ہے جو بے حد چکنا ہوتا ہے۔ برف باری کے موسم میں وہ لوگ زیادہ چلتے پھرتے نہیں اس لیے جسم میں چربی کی سطح زیادہ رہتی ہوگی۔ ایک شخص کو جو بیماری ہوتی ہوگی وہ نہایت آسانی سے دوسروں کو دے دیتا ہوگا۔ ان باتوں کے باوجود ایک بات ضرور ہے کہ لوگ خوش شکل، خوش مزاج اور خوش گفتار ہیں، مہمان نوازی میں آگے آگے اور ہمیں سفر کے دوران یہی سب کچھ درکار ہوتا ہے۔

وادی ہنزہ میں ہم نے ہر گلیشیئر اور اونچے پہاڑ کی چوٹیوں کو دیکھا۔ وہ بھی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ ہم نے کہا اطمینان رکھیں ہم ان سرپھروں میں سے نہیں جو ابھی آپ کی چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کریں گے اور آپ خوامخواہ انہیں گرانے کی زحمت کریں گے۔

کریم آباد میں برف سے ڈوبی ایک صبح بیدار ہوئی۔ آسمان پر سورج روشن تھا اس کی کرنیں برف پر پڑ کر ہر طرف اجالا پھیلا رہی تھیں، سامنے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ ہے۔

وادی ہنزہ میں ہر گاؤں باکمال ہے ایک رحیم آباد ہے۔ دوسرا خدا آباد ایک کا نام علی آباد اور ایک کریم آباد۔

بلتت قلعہ

کریم آباد کے دائیں جانب کے پہاڑ پر ایک قلعہ بنا ہے۔ بعض کا کہنا ہے یہ نو سو سال پرانا ہے۔ کچھ کہتے ہیں سات سو سال پرانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قلعہ پرانا ہے اور کئی بار اس کی تزئین و

آرائش ہوئی، کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہاں کے لوگ جب کسی سمجھدار آدمی کی عمر ڈیڑھ دوسو سال بتاتے ہیں اس قلعے کی تعمیر میں یہی ہوا ہوگا لیکن قلعہ ہنزہ کے حکمرانوں نے حفاظتی نقطہ نظر سے بنایا تھا۔

پہاڑ پر قلعہ ہونے کی وجہ سے وہ آسانی سے پوری وادی پر نظر رکھ سکتے تھے۔ سولہویں صدی کی بات ہے کہ ہنزہ کے میر آئشو دوئم نے بلتستان کی شہزادی شاہ خاتون سے شادی کی۔ انہوں نے قلعے کو نئے سرے سے تعمیر کروایا کیوں کہ وہ ماہرین بلتی تھے اس لیے طرزِ تعمیر میں بدھ اور تبت نمایاں ہیں۔

ایک زمانے میں یہ قلعہ اقتدار کے لیے بے حد اہم تھا لیکن حکمرانوں کی آپس کی لڑائی اور جھگڑوں نے اسے کمزور کر دیا۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں برطانیہ نے اس علاقے پر قبضہ کرلیا اور میر خاندان کے ایک شہزادے کو کٹھ پتلی حکمران بنا دیا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر کے مہاراجا نے حملہ کیا اور علاقے پر قبضہ کرلیا۔ قلعہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قلعہ بلتت کو ہنزہ کے شاہی خاندان والوں نے چھوڑ دیا اور دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ پھر وہی ہوا جو بدلتا وقت اور موسم کرتے ہیں۔ قلعہ آہستہ آہستہ اپنے وجود کو کھونے لگا۔ اچانک اس کے نصیب جاگے اور لندن کی رائل جیوگرفیکل سوسائٹی نے اس علاقے کا سروے کیا اور ان کی نظر جب قلعے پر پڑی تو اسے دوبارہ سے درست کرنے کا منصوبہ بنایا۔ پرنس کریم آغا خان نے اس میں مدد کی۔ میر آف ہنزہ اور ان کے خاندان نے بلتت ہیریٹیج ٹرسٹ کو اجازت دی کہ وہ اس قلعے کو دوبارہ مرمت کر کے یہاں میوزیم بنائیں۔

ہوٹل ورلڈ روف کے مالک نے بتایا آپ ذرا جلدی کریم آباد آ گئے ہیں۔ ابھی یہ نمائش کے لیے کھولا نہیں گیا ہے۔ نہ جانے وہاں کام کرنے والوں نے دیر کی یا ہم جلدی پہنچ گئے۔ اس لیے صرف سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کت ی اور ہوٹل کے مالک سے وعدہ کیا جب اس قلعے کے دروازے سیاحوں کے لیے کھل جائیں گے تو ہم ایک دن ضرور لوٹ کر آئیں گے فی الحال تو ہمیں گلگت لوٹنا تھا۔

مارکو پولو بھیڑ

دنیا میں جگہ جگہ پولیس اسٹیشن، عدالتیں یقین دلاتی ہیں۔ انصاف کم ملتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ناانصافی ہوئی۔ دیس دیس کا سفر کیا، گھاٹ گھاٹ گھومے، صحرا صحرا گئے، اَن گنت فاصلے طے کیے، جگہ جگہ لب و رخسار گل و گلزار بام و در اور طرح طرح کے کھانوں کی تعریفیں کیں لیکن کسی ظالم نے ہمارے نام سے کچھ بھی منسوب نہیں کیا۔ گلگت پہنچے تو یہ احساس محرومی ہوا کہ مارکو پولو کے نام سے ایک ایک بھیڑ مشہور ہے انہوں نے لے دے کے پندرہ ہزار میل کا سفر کیا، ملک بھی تین چار دیکھے اور ان کے نام سے بھیڑ مشہور ہوگئی۔

مارکو پولو بارہویں صدی عیسوی میں گلگت آئے اور واپس جا کر سفر نامہ لکھا اور ایک بھیڑ ہمیشہ کے لیے اپنے نام کروالی۔ ہم سے کوئی خرگوش کا بچہ بھی منسوب نہیں ہوا حالانکہ ہم برطانیہ کے ایک ڈسٹرکٹ کے علاقے میں ''پیٹر پین'' دیکھنے گئے تھے اور کئی خرگوش کے بچوں کو گود میں لے کر پیار کیا تھا لیکن ہائے زمانہ کبھی مکمل انصاف نہیں ملتا۔

ہم اٹلی کے شہر وینس گئے تھے یہاں صدیوں پہلے ایک گھر میں مارکو پولو رہتا تھا اس کے مکان کے باہر لائنوں پر نہ جانے کتنی دیر تک بیٹھے رہے اس کی [illegible] کرتے رہے۔ گلگت میں اس کا نام ایک بھیڑ کو دیا گیا ہے۔

مارکو پولو بھیڑ بھاری بھرکم ہوتی ہے، پہاڑوں میں پائی جاتی ہے اپنے سینگوں کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے عام طور پر یہ سینگ پچپن انچ کے مڑے ہوئے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس غریب کی جان خطرے میں رہتی ہے۔ شکاری اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور مار کر اس کا سر اپنے ڈرائنگ

روم کی دیوار پر سجا کر مہمانوں کو مرعوب کریں۔ اس بھیڑ کی عمر تیرہ سال ہوتی ہے جس کا اندازہ اس کے سینگوں سے لگایا جاتا ہے۔ اس کی مادہ کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ اس لیے اس کی عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

گلگت کے جانوروں میں مارکو پولو بھیڑ واحد جانور ہے جس کی مادہ کی اصل عمر معلوم نہیں ہو سکتی کاش انسانوں میں بھی کوئی ایسی نمایاں نشانی ہوتی کہ خواتین کو عمر چھپانے کے لیے بناؤ سنگھار اور غلط بیانی سے کام نہیں لینا پڑتا۔

مارکو پولو بھیڑ دودھ دیتی ہے پھر بھی نر اور مادہ دونوں کو بھیڑ ہی کہتے ہیں الگ نام نہیں ہے۔ عام طور سے اس کا وزن 126 کلو ہوتا ہے لیکن لوگ گوشت سے زیادہ سینگوں کی وجہ سے شکار کرتے ہیں۔ یہ بھیڑ اونچے پہاڑوں میں رہنا پسند کرتی ہے ریوڑ کی شکل میں خوراک کی تلاش میں نکلتی ہے۔ شکاریوں کو اسے تلاش کرنے میں خاصی دقت ہوتی ہے بعض وقت انہیں پہاڑی وادیوں میں کیمپ لگا کر کئی کئی دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔

افغانستان، پاکستان، کرختان، تاجکستان اور چائنا کے پہاڑوں میں یہ بھیڑ پائی جاتی ہے۔ ہنزہ میں چائنا سرحد کے نزدیک بھی دکھائی دیتی ہے۔ افغانستان کے بادشاہ شاہ ظاہر شاہ نے اس کا شکار صرف شاہی خاندان کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا سر اور سینگ شاہوں کے محلول کی زینت بن سکتے ہیں۔

مارکو پولو بھیڑ کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے اسے بچانے کے لیے کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔ خنجراب نیشنل پارک میں اس کی افزائش اور دیکھ بھال کا بہت اچھا انتظام کیا گیا ہے۔

مارکو پولو بھیڑ انسانوں سے بات نہیں کر سکتی۔ ورنہ وہ ضرور کہتی ''صرف سینگوں کی وجہ سے میری جان کیوں لیتے ہو؟ مجھے پکڑ کر سینگ لے لو جان بخش دو''، لیکن انسان اگر یہ سن لیں تو اَن سنی کر دیں گے کیوں کہ بھیڑ سے گوشت، اون اور خوب صورت سینگ ملتے ہیں اس لیے مارکو پولو بھیڑ جب بھی کسی شکاری کو نظر آئے گی جان سے جائے گی۔

پہاڑ، ہر طرف پہاڑ

اسکردو، گلگت کی ہر سمت سر اٹھائے پہاڑ کھڑے ہیں۔ کوہ پیمائی کرنے والے مہم جو لوگوں نے ان کے نام رکھ دیے ہیں۔ ہمارے میزبان بار بار ہمیں ان کے ناموں سے متعارف کراتے جاتے لیکن ہم انسانوں کے نام اچھی طرح یاد نہیں کر سکے۔ پہاڑوں کے کس طرح ذہن نشین کریں وہ بھی جن سے رابطہ نہ رکھنا ہو ان کی شناخت سے کیا فائدہ۔ اس علاقے میں 109 پہاڑ اور 80 سے زیادہ گلیشیئر ہیں، بیس جھیلیں ہیں اب اگر کوئی ان کے نام پوچھے تو ہم اس امتحان میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ پہاڑوں، گلیشیئر اور جھیلوں کے عجیب عجیب نام ہیں ہمیں کے ٹو، نانگا پربت اور راکا پوشی کے نام یاد رہ گئے۔ گلیشیئر میں صرف سیاچن کا نام ذہن میں رہ گیا بلکہ یہ تو پاکستان ہندوستان کے ہر شہری کو یاد ہے ہمیں یہ ناپسند ہے پھر بھی کچھ دن اس کے سائے میں رہے۔ جھیلوں میں سدپارہ اور شنگریلا یاد رہ گیا۔ اس کے علاوہ ہمیں بتایا گیا کہ جہاں کی ہم سیاحت کر رہے ہیں وہاں بارہ دریا ہیں ایک تو ہمارا دریائے سندھ، دریائے گلگت، دریائے ہنزہ اور دوسرے دریا ہمیں معاف کریں ان کے نام مشکل بھی ہیں اور ایک بار وہاں سے لوٹ آئے تو پھر ان کے پانی سے واسطہ نہیں رہے گا۔

ہم جب کریم آباد جانے کے لیے علی آباد سے گزر رہے تھے تو جیپ روک کر بتایا گیا کہ یہ نانگا پربت ہے جس کا مطلب ہے ''بے لباس پہاڑ'' ہم نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ بھلا پہاڑ بھی لباس پہنتے ہیں؟ اور کیا انہیں بھی ننگا پربت کہا جا سکتا ہے ممکن ہے کسی زمانے میں اس پہاڑ پر کچھ نہ ہو لیکن اب تو برف سے ڈھکا نظر آتا ہے۔ یہاں جو سیاح بھی آتا ہے مقامی لوگ بڑے فخر سے اسے دکھاتے ہیں۔

''یہ ہے ننگا پربت۔''

غیر ملکیوں کے لیے جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ اسے سن کر چونک کر دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہوگا اس علاقے میں سب قدامت پرست اور بنیاد پرست رہتے ہیں پہاڑ تک کو بے لباس نہیں دیکھنا چاہتے۔ یقین کریں ہمارے علاقے میں واقعی اگر کوئی ''ننگا'' ہو تو ہم اسے کبھی نہ دکھائیں لیکن اس علاقے کے لوگ بھولے ہیں کچھ چھپا کر نہیں رکھتے۔

کریم آباد کے راستے میں نگر وادی میں ہم سے ایک پہاڑ کا تعارف کروایا گیا۔ یہ راکاپوشی ہے مقامی زبان میں اس کا مطلب ہے ''ڈھکا ہوا'' یہ نام بالکل صحیح ہے کیوں کہ وہ برف سے ڈھکا ہوا تھا ممکن ہے جب قدیم زمانے میں لوگوں نے ایک پہاڑ کو ننگا پربت کہا تو دوسرے نے جتنا ممکن ہوا برف اوڑھ لی یوں پہاڑوں کے سلسلے کی عزت بچ رہی۔

ہمالیہ کے پہاڑ اسکردو کے نزدیک آ کر قراقرم کا نام پاتے ہیں اور کئی ہوٹل، ریسٹورنٹ دکانیں اس کے نام سے منسوب ہیں۔

اسکردو، گلگت میں رہنے والے لوگ پہاڑوں سے اپنی دوستی برقرار رکھتے ہیں اور وہ بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنے دامن کا برف، پانی، پھل اور معدنیات اپنے دوستوں کو دینے میں کنجوسی نہ کریں یہاں تک کہ ایک دریا تو لمبا سفر کر کے پانی کراچی تک لاتا ہے اور اگر وہاں اس کی قلت ہے تو اس کا الزام دریا کے سر نہیں آتا۔ اردو میں ایک محاورہ ہے ''گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا'' ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم نے اسکردو گلگت میں قیام کے دوران ہر چشمے، جھیل اور دریا کا پانی پیا۔ اس موسم میں جو پھل ملے وہ کھائے بس معدنیات کو دیکھا کیے حالانکہ کریم آباد کے بازار میں عبدالسلام اور غلام حسین دونوں کا اصرار تھا۔ ہم دکان پر فروخت ہونے والے مختلف رنگوں کے پتھر خرید لیں۔ یہ انتہائی قیمتی ہیں اور اگر انہیں ہم کراچی لے جا کر فروخت کریں تو خاصی رقم ملے گی۔ ہم نے انہیں سمجھایا سچ پوچھیں تو ہم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے اگر قیمتی پتھر ساتھ رکھ لیے تو کیا ہوگا؟ کس کی حفاظت کریں گے اپنی یا پتھروں کی اور یہ ہمارے شہر تک پہنچ گئے انہیں فروخت کر کے بہت سی رقم مل گئی تو پھر خطرہ۔ کوئی لوٹ نہ لے، جھپٹ کر نہ بھاگ جائے، چور نہ اڑا لے بس اس لیے یہی بہتر ہے کہ صرف اپنی قیمتی جان ہی لیے لیے پھریں۔

گلگت میں بہت سے چشمے، جھیلیں اور دریا برف اور ھے لیئے تھے۔ جب بہار پھول کھلاتی ہو گی تو یہ بیدار ہو کر اچھلتے کودتے پھرتے ہوں گے۔ وہ عجیب منظر ہوگا مگر برف کا موسم بھی بڑا رومان پرور ہوتا ہے۔ فطرت کو سفید رنگ زیادہ پسند ہے۔ خاص طور سے پہاڑوں کے لیے ہم نے اکرم خان سے کہا تھا یہ جو پانی پی رہے ہیں دراصل ہمارے سمندر کا ہے جو بھاپ بن کر بادل بنا اور تیرتا ہوا گلگت میں برف بن کر وادیوں پہاڑوں میں آ بیٹھا بس وہی ہم پی رہے ہیں۔

چشمے، جھیلیں اور سارے دریا چھوڑ آئے بس ایک ساتھ لائے کہ وہ جب ایک جھیل سے نکلا تو شیر دریا کہلایا اور پھر دریائے سندھ کے نام سے ہمارے ساتھ چلتا ہوا آ گیا۔

پہاڑوں میں صبح جلدی ہو جاتی ہے کریم آباد دھند میں ڈوبا تھا۔ چند فٹ کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہوٹل ورلڈ روف میں سب سے بڑی سہولت گرم پانی کی تھی۔ باتھ روم میں دو بالٹی گرم پانی رکھا تھا ہم تیار ہو کر نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچے وہاں غلام عباس پہلے ہی بیٹھے تھے۔ ہوٹل کے مالک نے آ کر پوچھا آپ لوگ کیا ناشتا کریں گے؟ ہم نے پوچھا کیا مل سکتا ہے؟ وہ بولے جو آپ پسند کریں، توسٹ، بٹر جام، انڈا پراٹھا، قیمہ۔ ہم نے پراٹھے کے لیے کہہ دیا اسی وقت عبدالسلام بھی آ گئے وہ ٹوسٹ اور انڈا کھانا چاہتے تھے۔ ڈائننگ روم میں آتش دان روشن تھا اور ہلکی ہلکی حدت سے کمرہ گرم تھا۔ غلام عباس نے کہا۔ ''ہمیں گلگت واپسی کے لیے دھند صاف ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''وہ کب ہوگی؟'' ہم نے پوچھا۔

''دعا کریں سورج نکل آئے تو وہ ایک گھنٹے میں مطلع صاف ہو جائے گا۔''

وادیوں پہاڑوں اونچے نیچے راستوں میں ایک دعا ہی ہے جو سلامت رکھتی ہے اللہ تعالیٰ مہربان ہے ہمیشہ مدد کرتا ہے۔

ہم ناشتے اور گرم چائے پینے کے بعد ورلڈ روف کے آفس میں آ بیٹھے جہاں ان کے مالک موسم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ وادی میں بادل برستے ہوئے ایک طرف سے دوسرے طرف چلے جاتے ہیں۔ دنوں تک آسمان سے سفید برف گرتی ہے زندگی جم جاتی ہے بازار میں بیشتر دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ سیاح کم ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہمارا پورا ہوٹل خالی ہوتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ بتا رہے تھے اور ہم سارے موسم محسوس کر رہے تھے۔ اپنے شہر کی وہ تمازت بھری سورج کی کرنیں یاد آئیں جو بہت دنوں تک ایک سا موسم پھیلائے رکھتی ہیں۔ ذرا وقت گزرا تو ایک ایک کپ چائے اور پی گئی اور پھر خوش خبری ملی کہ سورج نکل آیا ہے لیکن دھند ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ سفر پر روانہ نہیں ہوا جا سکتا۔ انتظار کرنا ہوگا دن کے بارہ بج گئے۔ دھند تھوڑی سی کم ہوئی لیکن راستے صاف صاف نظر نہیں آ سکتے تھے۔ غلام حسین نے تجویز دی۔ یہاں بازار میں ایک دکان ہے اگر وہ کھلی ہوئی ہو تو وہاں سے دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں کچھ دیر اور گزر جائے گی اور پھر امید ہے دھند کم ہو جائے گی مجھے اس دکان کی مٹن کڑھائی بہت پسند ہے لیکن ان دنوں شاید وہ بند ہو۔

ورلڈ روف ہوٹل کے مالک کو الوداع کہا۔ انہوں نے اصرار کیا موسم بہار میں ضرور آئیں یہ سبزے اور پھولوں سے بھرا ہوا ہوگا۔

ہم جیپ میں سوار ہو کر نکلے بازار میں کچھ دکانیں بند اور کچھ کھلی تھیں۔ خوش قسمتی سے غلام حسین کی پسند کا ہوٹل کھلا تھا۔ ہم لوگ اندر گئے، مالک غلام حسین سے واقف تھا اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور مٹن کڑھائی بنانے چلا گیا۔

ذرا دیر میں چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں قہوہ آ گیا۔ یہ سبز چائے تھی اس کے بعد چند گرم نان اور پھر ایک بڑی سی کالی کڑھائی جس میں مٹن تھا۔ ہم سب نے کھانا شروع کیا پہلے ہی نوالے پر اندازہ ہو گیا کہ گوشت بے حد چربی والا ہے اور بغیر کوئی چکنائی ڈالے پکایا گیا ہے لیکن اس کا ذائقہ بے حد اچھا تھا نہ جانے ہوٹل والے نے کیا کچھ ڈالا تھا ہم لوگ تو بس گرم گرم نان سے بے خوف کھاتے گئے۔ یہاں تک کہ کڑھائی میں مٹن ختم اور گرم نان آنے بند ہو گئے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس عرصے میں باہر دھند برائے نام رہ گئی۔ ہوٹل کے مالک نے اصرار کر کے ایک بار پھر قہوہ پلوایا اس کا کہنا تھا یہ سب کچھ ہضم کر دے گا۔ قہوہ اچھا تھا، ہوٹل کے مالک سے ہاتھ ملا کر ہم باہر نکلے تو یہ سب کچھ ماضی ہو گیا۔

جیپ کریم آباد سے نیچے اترنے لگی۔ گلگت میں گاڑیوں میں ہیٹنگ سسٹم نہیں ہوتا کیوں کہ جب دروازے بند ہو جائیں تو لوگوں کے وجود سے ماحول خود گرم ہو جاتا ہے۔ ذرا دیر بعد برف باری شروع ہو گئی لیکن زیادہ نہیں تھی کچھ ہی دیر بعد ہم ایسے علاقے میں پہنچے جہاں برف نہیں تھی۔ راستہ صاف تھا اور سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی ہم لوگ گلگت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک گاؤں آ گیا جہاں غلام حسین نے جیپ رکوائی یہاں ہم سب اترے اور قہوہ پیا گیا جو اس علاقے میں بے حد مقبول تھا ہمیں اس میں کوئی خاص ذائقہ محسوس نہیں ہوا لیکن مہمان تھے اس لیے تعریف کی لیکن دوسری بار پینے سے انکار کر دیا۔ جیپ دوبارہ روانہ ہوئی اور پھر گاؤں، دیہاتوں، پہاڑوں سے گزرتے شام کو گلگت جا پہنچے جہاں ہمارا ہوٹل انتظار میں تھا۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز روداد اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

جن دوست

ارم ناز

ایک مصنفہ کی کمال حیرت تحریر، جس کی دوستی آج بھی ایک جن سے ہے

میرا اور قلم کا رشتہ بہت پرانا تھا۔ میں ہر وقت دلچسپ اور انوکھی کہانیوں کی تلاش میں رہتی۔ یوں تو ہر ایک عورت ایک کہانی ہوتی ہے۔ ایک دن مجھے بھی ایک کہانی بن جانا تھا مگر مجھے ایسے اچھوتے موضوعات پر لکھنے کا شوق تھا جو لوگوں کی نظروں سے پہلے نہ گزرے ہوں۔ میں گلی کے کئی ایسے گھروں میں جا کر بیٹھتی جہاں خواتین کا آنا جانا ہوتا۔ وہاں مجھے باآسانی کئی کہانیاں مل جاتیں۔ میں اپنی ایک ایسی ہی ملنے والی کے گھر جب پہنچی تو وہ چند یا پر برقعہ رکھے کہیں جانے کی تیاریوں میں تھیں میں نے پوچھا۔

''خیریت آنٹی! بڑی پریشان لگ رہی ہیں۔''

''ہاں بشریٰ! بس خیر ہی ہے۔ سفینہ کی رات سے طبیعت خراب ہے۔ لگتا ہے نظر لگ گئی ہے۔ دم کرانے لے جا رہی ہوں۔'' میں ہنسنے لگی۔

''ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ موسم تبدیل ہو رہا ہے اسی لیے بچے بیمار ہو رہے ہیں۔ رہی بات دم کرنے کی تو آپ خود چاروں قل پڑھ کر بچی پر دم کر دیں۔'' مگر آنٹی نے تو آستانے سے ہی دم کروانا تھا۔ وہ بچی کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکلنے لگیں۔ میں نے آواز دی۔

''رکیں میں بھی چلی ہوں۔'' مقصد صرف یہ تھا کہ شاید وہاں سے کوئی کہانی ہاتھ لگ جائے۔

میں آنٹی کے ہمراہ آستانے پہنچ گئی۔ وہاں ایک صاحب گدی پر بیٹھے لوگوں کے مسئلے سن کر کسی کو تعویذ دے رہے تھے، کسی کو دم کر رہے تھے۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔ سفینہ کو دم کروا کر آنٹی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ واپس آ گئی۔ اگلے دن جمعرات کو میں پھر آستانے پہنچ گئی۔ کل کے مقابلے میں آج رش ذرا زیادہ تھا۔ میں نے گدی پر براجمان صاحب کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں شناسائی تھی۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ عورتوں کے بڑے عام سے مسائل تھے۔ کسی کی ساس ظالم تھی، کسی کی اولاد نافرمان تھی، کسی کا شوہر دوسری عورت کے چکر میں تھا، کوئی بھی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر کہانی لکھی جا سکے آہستہ آہستہ خواتین کا رش کم ہو گیا۔ اچانک دروازے سے دو خواتین نمودار ہوئیں۔ جو ایک نوجوان لڑکی کو پوری طاقت سے گھسیٹ کر آستانے میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ لڑکی بھی اپنی پوری طاقت لگا کر اندر نہ آنے کی کوشش میں تھی۔ ان کے پیچھے ایک مرد بھی تھا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میرے دل نے کہا بشریٰ کہانی پہنچ گئی۔ گدی پر بیٹھے صاحب نے خواتین کو کہا۔

''پہلے وہ خود آنے کی۔'' خواتین نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ گدی پر بیٹھے صاحب کا نام عابد تھا۔ لڑکی نے باہر سے ہی مردانہ آواز میں کہا۔ ''عابد میں اندر نہیں آؤں گا۔'' عابد صاحب ہنسے۔

''کیسے نہیں آئے گا۔ تُو خود چل کر آئے گا۔'' عابد صاحب کچھ پڑھنے لگے۔ لڑکی اٹھی نپے تلے قدم بڑھاتی عابد صاحب کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ عابد صاحب بولے۔

''نام بتا اپنا۔'' لڑکی مردانہ آواز میں بولی۔

''طلوس۔''

''مسلمان ہے لڑکی۔''

''نہیں۔''

''تم اس لڑکی پر کیوں آئے طلوس؟''

''میری مرضی۔'' عابد صاحب اور طلوس یعنی اس لڑکی سے سوال جواب ہونے لگے۔ مجھے لگتا ہے وہ لڑکی ڈرامہ کر رہی ہے یا پھر شیزوفرینیا کی مریض ہے۔ یہ جن جنات والا معاملہ ہرگز نہیں ہے۔ میں لڑکی سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی۔ نجانے میرے من میں کیا سمائی کہ ایک سوال میں نے بھی لڑکی سے کر لیا۔ ''طلوس کیا تم اس لڑکی کو چھوڑ کر میرے اندر حلول کر سکتے ہو۔'' عابد صاحب نے غصے سے مجھے دیکھا۔

''محترمہ آپ کو اندازہ بھی ہے یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جی عابد صاحب! بس ایک تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔'' ابھی میں عابد صاحب سے یہ بات ہی کر رہی تھی کہ مجھے اپنے کان کے قریب ایک ہلکی سی مردانہ آواز سنائی دی۔

''میں آ گیا ہوں بشریٰ۔'' مجھے خوف محسوس ہوا۔ میرا تجزیہ غلط تھا یہ تو واقعی جن ہے۔ سامنے بیٹھی لڑکی بھلی چنگی دکھائی دینے لگی۔ عابد صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''محترمہ آپ جائیں جب اپنے کہے پر پچھتاوا ہو تو تشریف لائیے گا۔'' میں اٹھ کر گھر کی طرف چل دی۔ آئی تو اکیلی تھی مگر واپسی پر ایک مہمان یعنی طلوس کو ساتھ لیے جا رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے طلوس سے سوال کیا۔

''کیا تم ابھی بھی میرے ساتھ ہو۔'' طلوس نے مختصر جواب دیا۔ ''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''طلوس! مجھ سے کوئی ایسی حرکت نہ کروانا جس کی وجہ سے مجھے کسی کے آگے شرمندہ ہونا پڑے۔'' طلوس نے کہا۔

''بشریٰ! بے فکر ہو جاؤ۔ آج سے میں اور تم دوست..... ملاؤ ہاتھ۔'' میں نے ہوا میں ہاتھ آگے بڑھا دیا چند ثانیوں میں مجھے ایسا لگا جیسے میرا ہاتھ جلتے توے سے ٹکرا گیا ہو۔ طلوس کا قہقہہ بلند ہوا۔

''بشریٰ تم خاکی اور میں آتشی۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''طلوس تم بھول رہے ہو۔ میں اشرف المخلوقات ہوں۔'' طلوس نے فوراً ہی معذرت کی۔

''بشریٰ! میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہ تھا۔'' طلوس نے بتایا اس کا تعلق مصر سے ہے۔ مصر جو رازوں سے بھرا ایک ملک ہے۔ طلوس جن ہونے کی وجہ سے سرحدوں کی قید سے عاری ہے۔ طلوس ہر موضوع پر بہترین بات کرتا تھا۔ اسے بہت معلومات تھی۔ وہ گھنٹہ گھنٹہ مجھ سے بحث کرتا اور بحث

میں جیت جاتا۔ طلوس کی سیاست پر گہری نظر تھی۔ وہ ہر ملک کی سیاست پر بات کر لیتا تھا۔ طلوس کی اور میری دوستی بڑی گہری ہے۔ طلوس کسی بھی انسان سے زیادہ اچھا دوست ہے۔ آج میں ملک کی مشہور رائٹر ہوں۔ میری لکھی کہانیاں افسانے ڈرامے لوگ سالوں یاد رکھتے ہیں اور یہ کہانیاں مجھے طلوس دیتا ہے۔ طلوس نے اور میں نے مل کر کئی نیکی کے کام کیے میرے ایک دور کے رشتہ دار چچا واحد اپنے مکان کے کاغذات کے بارے میں بہت پریشان تھے۔ آفس سے گھر آتے ہوئے کاغذات کہیں گر گئے تھے۔ ایف آئی آر درج کرادی تھی بہت ڈھونڈا مگر کاغذات مل کے نہیں دے رہے تھے۔ ان کاغذات کا اگر کوئی غلط استعمال کرتا تو چچا مصیبت میں آسکتے تھے۔ چچا کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

میں نے طلوس کو کہا۔ ”اگر تم کسی طرح مدد کر سکتے ہو تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی۔“

طلوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی سپرمین یا اسپائڈر مین نہیں ہوں، جن ہوں۔“

میں بولی۔ ”طلوس! جن ہی تو یہ کام با آسانی کر سکتے ہیں۔“ پھر طلوس نے پتا لگایا کے کاغذات کہاں ہیں تو معلوم ہوا کہ کاغذات پولیس کے پاس پہنچ گئے ہیں مگر وہ واپسی کے عوض بھاری رقم کے مطالبے کا ارادہ رکھتے تھے۔ طلوس نے فون پر ایک پولیس کے بڑے آفیسر کی آواز نکالی اور حکم دیا کے واحد نامی صاحب کو ان کے کاغذات ان کے گھر جا کر دے دیئے جائیں۔ ایک پولیس والا چچا کے گھر آیا اور کاغذات دے گیا۔ یوں چچا واحد کی مدد طلوس نے کی۔ اسی طرح محلے کے ایک نہایت شریف بزرگ علیم الدین کی بیٹی آسیہ کو ایک لڑکے سے محبت ہوگئی۔ آسیہ معصوم اور کم عمر تھی جب کہ وہ لڑکا بہت شاطر اور چالاک تھا۔ آسیہ کو نجانے کیا کیا خواب دکھائے کہ وہ اس کے ساتھ فرار کا منصوبہ بنا بیٹھی اس لڑکے نے آسیہ کو نقدی اور زیور بھی چرا کر لانے پر راضی کر لیا۔ ایک دن مذاق مذاق میں طلوس نے کہا۔

”بشریٰ! آج رات تمہارے محلے کی ایک لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو جائے گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”کس کی بات کر رہے ہو۔“

طلوس نے بتایا۔ ”علیم الدین کی بیٹی آسیہ ایک مردود کے بہکاوے میں آگئی ہے۔“

میں نے طلوس کو کہا۔ ”جب آسیہ گھر سے نکلے گی تو ہم اسے کسی طرح روک لیں گے۔“

طلوس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بی بی بشریٰ! مجھے جن ہی رہنے دو فرشتہ نہ سمجھو ہر روز نہ جانے کتنے واقعات ہوتے رہتے ہیں، میں کس کس پر پہرے لگاؤں گا۔ میں تمہارا دوست بنا ہوں تمہارے محلے کا چوکیدار نہیں۔“ میں نے کہا۔

”طلوس! علیم الدین صاحب اس بڑھاپے میں یہ ذلت برداشت نہیں کر پائیں گے۔ معصوم آسیہ بھی برباد ہو جائے گی اور پھر تم ہی تو کہہ رہے ہو کہ وہ لڑکا برا ہے۔ تم میرا ساتھ نہ بھی دو تو میں یہ سب جانتے بوجھتے نہیں ہونے دوں گی۔“

طلوس نے کہا۔ ”بشریٰ! تم ہی بنو خدائی فوجدار۔“

طلوس وہاں سے چلا گیا مگر رات اس نے مجھے سوتے سے اٹھا کر کہا۔ ”آسیہ بھاگ رہی ہے روکنا ہے تو روک لو۔“ میں نے جلدی سے دوپٹہ لپیٹا اور چھپک سے باہر نکل گئی۔ لڑکا گھر سے تھوڑا دور کھڑا تھا جب کہ آسیہ گھر سے نکل کر لڑکے کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سفری بیگ تھا۔ بیگ بھاری تھا۔ اس لیے آسیہ کی رفتار چیونٹی جیسی تھی۔ میں پل بھر میں آسیہ کے سر پر پہنچ گئی۔ میں نے آسیہ کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور اسے گھر کی طرف واپس دھکیلا۔ لڑکا میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ میں اندر سے ڈر گئی مگر بظاہر مضبوطی سے کھڑی رہی میں نے لڑکے کو للکار کے کہا۔ ”خبیث دفع ہو جا یہاں سے ورنہ ابھی شور مچا کر محلہ اکٹھا کر لوں گی پھر تو جانتا ہے کہ تیرا کیا حشر ہوگا۔ خوف یہ تھا کہ خبیث کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر دے کیوں کے شور مچانے پر آسیہ کی بھی بدنامی ہوتی۔ طلوس نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔ ”پنجابی فلموں کی ہیروئن لگ رہی ہو بس تمہارا وزن تھوڑا کم ہے۔“ طلوس کی اس بات پر میں ان حالات میں بھی مسکرانے لگی۔ آسیہ واپس گھر کی طرف پلٹ گئی آسیہ کا پلٹنا تھا کہ طلوس نے اس لڑکے کو گالیاں اور لاتیں رسید کرنی شروع کر دیں وہ گھبرا گیا کہ سامنے تو کوئی نہیں پھر کون بری طرح پیٹ رہا ہے۔ طلوس اس کی دھلائی کر کے میرے ساتھ ہی واپس آگیا۔

”مردود اب کسی لڑکی کو نہیں ورغلائے گا۔“

”طلوس تم نے اتنا مارا ہے کہ اس کے عشق کا جن اتر گیا ہوگا۔“ طلوس نے زور دار قہقہہ لگایا۔

”اچھا ہوا اس نے جن اتار دیا۔“ اس طرح میں اور طلوس مل کر نیکی کا کام کرتے ہیں۔ آج بھی طلوس میرا [illegible]

☆☆☆

کچھ یاد رہا، کچھ بھول گئے

نیئر شفقت

مدرسے کے رستے میں اُس دن پو پھٹتے ہی اتنے بینگن کہاں سے آگئے تھے

یہ دنیا اسرار و رموز سے بھری پڑی ہے۔ ہر نئے دن دنیا میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسا مافوق الفطرت واقعہ ضرور رونما ہوتا ہے جو انسانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے اور وہ سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

ہر انسان کے ساتھ تو نہیں مگر بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھ ایسے عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے ہیں۔ کچھ حیران ہوتے ہیں کچھ پریشان ہوتے ہیں۔ کچھ ڈر جاتے ہیں کچھ مر جاتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایسے واقعات کو بھی زندگی کا ایک معمول سمجھ کر گزار دیتے ہیں۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس وقت تو میں ڈر گیا تھا مگر عمر کے اس حصے میں جب میں واپسی

کی تیاریوں میں ہوں مجھے وہ بات ایک معمولی واقعہ محسوس ہوتا ہے۔

میرے اسکول جانے کی عمر آئی تو والدین نے مجھے اسکول کے بجائے قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے مدرسے میں ڈال دیا۔ مدرسہ ہمارے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مگر چونکہ ہمارا گھر غلہ منڈی کے اندر تھا اس لیے رات کے وقت منڈی کے گیٹ بند کردیے جاتے تھے۔ صرف بازار کی طرف کھلنے والا ایک گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے قریبی گیٹ کے بجائے بازار والے گیٹ کی طرف سے جانا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے فاصلہ تھوڑا بڑھ جاتا تھا۔

آپا جی (امی) مجھے صبح فجر کی اذانوں سے پہلے اٹھا کر مدرسے بھیج دیا کرتی تھیں۔ اس وقت سبھی گھر والے خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے تھے۔ اس لیے کوئی بھی (بھائی یا کزن) میرے ساتھ آنے کو تیار نہ ہوتا۔ چنانچہ میں اکیلا ہی مدرسے جاتا رہا، ویسے بھی گرمیاں تھیں اس لیے زیادہ سناٹا محسوس نہیں ہوتا تھا۔

وقت گزرا اور سردیاں آگئیں۔ اب صبح کے وقت جاتے ہوئے مجھے کچھ کچھ ڈر بھی محسوس ہونے لگ گیا تھا۔ کچھ موسم کی شدت تھی اور کچھ سناٹے کی گہرائی۔ اس دن بھی میں صبح سویرے کپکپاتا ہوا گھر سے نکلا۔ میرا جانے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا مگر حافظ صاحب ہمارے استاد اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ کسی بچے کو چھٹی نہیں کرنے دیتے تھے۔ ویسے بھی ضیاء بھائی (میرے کزن) کے ساتھ ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔ انہوں نے فوراً انہیں بتا دینا تھا اس لیے بھی میں چھٹی کرنے کے معاملے میں محتاط ہی رہتا تھا۔

بازار والے گیٹ سے نکل کر میں مدرسے کی طرف مڑ گیا۔ سردی رگوں میں اترتی جارہی تھی۔ میں کچھ نیند میں کچھ غصے میں چلتا چلا جارہا تھا کہ اچانک کوئی چیز میرے سامنے آگری۔ میں ایک دم چونکنا ہو گیا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر زمین سے وہ شے اٹھائی تو ایک بڑا سا ٹینگن تھا۔ اس جگہ پر جہاں سے میں گزر رہا تھا وہاں صبح کے وقت کچھ سبزی والے اپنا ٹوکرا لے کر سبزی بیچا کرتے تھے۔ وہاں ایک گردوارہ بھی تھا جہاں وہ سبزی فروش جو شاید آپس میں رشتے دار بھی تھے وہاں رہائش پذیر تھے۔ چونکہ دن کے وقت کمیٹی والوں کے آنے کا خدشہ ہوتا تھا اس لیے میں یہ سمجھا کہ دن کے بجائے وہ اس وقت رات کے اندھیرے میں گلی سڑی سبزیوں سے چھٹکارے کے لیے پھینک رہے ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور ٹینگن میرے پاس گرا۔ اب کی مرتبہ میں نے کوئی پروانہ کی اور مدرسے کی جانب قدم بڑھا دیے جو اب تھوڑا ہی دور رہ گیا تھا۔ میرے قدم بڑھانے کی دیر تھی کہ میرے آس پاس ٹینگنوں کی بارش ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا راستہ ٹینگنوں سے اٹ گیا۔ گیارہ سال کی عمر ہی کیا ہوئی ہے۔ لہٰذا میرا خوفزدہ ہونا اچنبھے والی بات نہ تھی۔ ایسی صورت حال میں تو بڑے بڑوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ میں تو پھر بچہ تھا اور پو پھٹنے سے پہلے پراسرار تاریکی تنہائی کا عالم.....!

جیسے تیسے کر کے میں نے ٹینگنوں کو پیروں سے اِدھر اُدھر کر کے رستہ بنایا اور ہانپتے کانپتے مدرسے پہنچا تو پسینے سے تر تھا۔ حافظ صاحب بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور فوراً ہی اپنے پاس بلایا۔

''کیا ہوا ہے بیٹے؟'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

''ڈر گئے ہو؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔ میں نے سر ہلایا تو انہوں نے ایک بچے کو بلا کر پانی منگوایا۔ پانی پی کر میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے اٹکتے اٹکتے ساری روداد انہیں سنائی۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، مجھے گلے لگایا اور اوپر پھونک ماردی۔ پھر نسبتاً ایک بچے کو بلایا اور اسے میرے ہمراہ کرتے ہوئے [illegible]

''[illegible] جاؤ اور وہ جگہ دیکھ کر آؤ جہاں ٹینگن [illegible]''

[illegible] ہمراہ بے کوف و خطر چل پڑا۔ [illegible] اندر کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا۔

[illegible] قریب پہنچے تو دیکھا سڑک صاف ستھری تھی۔ وہاں کسی ایک بھی ٹینگن کا نام و نشان تک نہ تھا۔

وہ کیا مخلوق تھی۔ جس نے میرے اوپر ٹینگن پھینکے تھے اور کیوں پھینکے تھے اس کا مجھے آج تک پتا نہیں چل سکا لیکن یہ ہے کہ حافظ صاحب نے جو میرے اوپر دم کیا تھا اس کے بعد میرے اندر سے ڈر خوف نکل گیا۔ کوئی سنسان رستہ ہو یا قبرستان کی اندھیری رات، مجھے کبھی ڈر خوف محسوس نہیں ہوتا۔

حافظ صاحب کے پاس بہت سے بچے قرآن پاک حفظ کرنے آتے تھے۔ کچھ مدرسے میں ہی رہائش پذیر تھے اور کچھ آس پاس سے آتے تھے۔ انہی بچوں میں سے دو بچے بڑے پیارے تھے۔ ہم سبھی بچوں کا دل چاہتا تھا کہ ان سے دوستی کریں اور ان سے بات چیت کریں مگر حافظ صاحب نے سب بچوں کو بڑی سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ ان سے کوئی فالتو بات چیت نہیں کرنی۔ چنانچہ سلام دعا یا ضروری بات کے علاوہ ان سے کبھی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ بچے ہم سے سینئر تھے۔ لہٰذا قرآن پاک حفظ کر لینے کے بعد وہ وہاں سے چلے گئے۔ پتا نہیں کہاں سے آئے تھے۔ روٹین کا حصہ سمجھ کر ہم بھی بھول گئے۔

وقت مزید آگے سرکا، میں نے بھی قرآن پاک کی دولت اپنے سینے میں محفوظ کر کے مدرسہ چھوڑ دیا اور اپنی دنیاوی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد ابا جی اور ضیاء بھائی کے ساتھ مدرسے جانا ہوا۔ باتوں باتوں میں حافظ صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس جنات بھی قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے آتے ہیں۔

''نہیں وہ گول مٹول اور گورے چٹے بچے یاد ہیں وحید جو تمہارے ساتھ پڑھتے تھے۔'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آ گیا۔

''جی حافظ جی جی! مجھے یاد ہیں وہ بچے۔'' میں نے بڑے ادب سے کہا۔

''وہ دونوں جنات بچے تھے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا تو میں دنگ رہ گیا۔ ''جنات کے بچے ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔'' یہ خیال ہی بڑا سنسنی خیز تھا۔

حافظ صاحب بہت نیک اور اللہ والے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ ان کے قبضے میں جنات اور موکلات بھی تھے اور کئی جنات تو ان کے دوست بھی تھے۔ وہ جنات زدہ یا آسیب گزیدہ لوگوں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ شاید چیچہ وطنی سے ایک آدمی حافظ صاحب کے پاس آیا۔ اس کی بیٹی پر کسی جن نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ بہت علاج کروایا، عاملوں، مولویوں کے پاس بھی گئے مگر جن نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کسی نے حافظ صاحب کا پتا بتایا تو وہ اپنا دکھ لے کر آ گئے۔ حافظ صاحب نے ماجرا سنا اور کہا۔

''اُسے کہو کہ آرام سے واپس چلا جائے ورنہ تیری خیر نہیں ہے۔'' اس زمانے میں فون تو ہوتے نہیں تھے وہ خود ہی پیغام لے کر واپس چلا گیا۔ دوسرے دن وہ پھر آیا اور کہنے لگا۔

''حافظ صاحب میں نے اسے آپ کا پیغام دے دیا تھا مگر وہ کہہ رہا ہے کہ جو مرضی کر لو میں جانے والا نہیں ہوں۔'' حافظ صاحب بولے۔

''کیا تم نے اسے میرا نام بتایا تھا۔''

''نہیں حافظ صاحب میں نے آپ کا نام نہیں بتایا تھا۔'' اس نے کہا تو حافظ صاحب کہنے لگے۔

''اس کے سامنے میرا نام لے کر کہنا کہ جاتا ہے یا پھر میں خود آؤں۔''

''وہ آدمی پیغام لے کر چلا گیا اور اگلے ہی دن پھر آ گیا۔ اب کی مرتبہ پریشانی اس کے چہرے سے غائب تھی اور وہ خوش نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا۔

''حافظ صاحب میں نے اسے آپ کا نام لے کر پیغام دیا تھا۔ آپ کا نام سن کر کہنے لگا۔ ''نہ.....نہ.....انہیں نہ بلانا۔ مجھے ابھی اپنی زندگی عزیز ہے۔ میں جارہا ہوں۔'' اس کے بعد بچی کل سے بھلی چنگی ہے۔''

آج جب یہ واقعات یاد آتے ہیں تو جہاں خدا کی قدرت پر دل و دماغ عش عش کر اٹھتا ہے وہیں تشنگی بھی سر نہیوڑے بین کرنے لگتی ہے کہ ہم خدا کے کسی بھی اسرار کا پا سکے اور بس اپنی زندگی جی کر واپس جارہے ہیں۔

☆☆☆

وہ شادی کس کی تھی؟

عصمت پروین عظیمی

بڑے بھیا کے ساتھ پیش آنے والے پراسرار واقعات' جو آج بھی اُن کی یاد دلاتے ہیں

یہ اگست کا مہینہ تھا۔ مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ امی جان اور گھر کے دیگر افراد کسی رشتے دار کی شادی میں گئے ہوئے تھے جہاں سے انہیں دوسرے دن آنا تھا۔ کافی عرصے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے گھر میں اکیلا رہنا تھا۔ آسمان پر بجلی چمک رہی تھی اور تیز بارش ہو رہی تھی۔ میرے دل میں نامعلوم سا خوف پھیلا ہوا تھا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ اتنی تیز بارش ہو رہی تھی دکانیں بھی بند ہو گئی تھیں۔ تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ گھر میں میرے علاوہ بھی کوئی اور موجود ہے مگر نظر کوئی نہیں آیا، پھر اچانک لائٹ چلی گئی۔ مجھے دو آنکھیں اپنی طرف گھورتی ہوئی نظر آئیں۔ سرخ انگارہ آنکھیں ایسے لگا کہ یہ انگارے مجھے جلا کر بھسم کر دیں گے۔ اسی اثناء میں لائٹ آگئی دیکھا تو وہ ایک کالی بلی تھی جو مجھ کو گھور رہی تھی۔ میں نے دل میں جتنی دعائیں یاد تھیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اچانک ایسا معلوم ہوا جیسے بجلی چمکی ہو بہت تیز روشنی چمکی اور ایک سفید بلا نمودار ہوا۔ سفید بلے کے آتے ہی کالی بلی نے چیخ ماری اور یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے بہت ساری بدروحیں چیخ رہی ہیں۔ کالی بلی غائب ہو چکی تھی اس کے پیچھے سفید بلا بھی غائب ہو گیا۔

بارش مسلسل جاری تھی۔ بادل بھی خوب گرج چمک رہے تھے۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا۔ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ بدن پسینہ پسینہ ہو چکا تھا۔ پھر میرے کانوں میں اذانوں کی آواز آنی شروع ہو گئی تو میری جان میں جان آئی کیونکہ اب صبح ہو چکی تھی اور خوفناک کالی رات گزر چکی اور صبح ہو گئی۔ امی وغیرہ شام میں آ گئے۔

اسی دوران میری شادی ہو گئی۔ دن گزرتے رہے، کوئی خاص بات نہیں ہوئی پھر ملیر میں اچانک حالات خراب ہو گئے۔ ہر جگہ ٹائر جلائے جا رہے تھے۔ دہشت گردی عام تھی جس کی وجہ سے میں اپنی [illegible] ملیر سے سرجانی ٹاؤن شفٹ [illegible] سرجانی میں ہی رہتی رہیں۔ سرجانی میں، میں [illegible] بار لایا۔ ہمارے گھر کے اردگرد [illegible] میں اکثر شام کو گھومنے کے لیے [illegible] شام میں سڑک پر کافی دور تک چلتا [illegible] ایک پہاڑی کچھ بڑی نظر

آ رہی تھی۔ میں اس کی طرف چل دیا۔ اس پہاڑی تک پہنچنے میں مجھے ایک گھنٹہ لگا۔ پہاڑی کے اوپر پہنچ کر میں نے دور تک کا ماحول دیکھا جو مجھے بہت اچھا لگا۔ پہاڑی کے دوسری طرف کچھ جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر کافی لوگ جمع تھے شاید شادی وغیرہ تھی کیونکہ دیگیں پک رہی تھیں۔ میں بھی سلام کر کے ان لوگوں میں بیٹھ گیا۔ وہ لوگ سندھی اور زبان میں باتیں کر رہے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے کانوں میں گانے بجانے کی آواز آنی شروع ہو گئی۔ میں اس طرف چلا گیا مجھ کو کسی نے نہیں روکا کچھ دور ایک میدان میں کچھ لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔ تھوڑے فاصلے جھاڑیوں میں چھپ کر میں ناچ دیکھنے لگا۔ کتنا ٹائم گزر گیا مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اب کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ اب میں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ نہ کوئی شادی کی تقریب نہ ہنگامہ تھا اور تاحد نظر پہاڑیاں اور جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں جس پہاڑی سے آیا تھا وہ بھی کالی نظر آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی سی کالی دیوار رستے میں تان دی گئی ہو پھر میں جلدی جلدی گھر چلا آیا۔ گھر پر سب پریشان تھے میں بدحواس اور گھبرایا ہوا تھا۔ گھر والوں نے آتے ہی سوال شروع کر دیے۔ ''کہاں گئے تھے؟'' اتفاق سے امی بھی آئی ہوئی تھیں۔ سب بہت پریشان ہو گئے تھے ایسے اور بہت سے واقعات ہیں جو زندگی میں آئے اور گزر گئے پھر بھی میں اپنی سیلانی طبیعت سے باز نہ آیا۔

☆☆

ایک اور واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔

میرے محلے میں کسی کا انتقال ہو گیا تھا جس کے جنازے میں، میں بھی شریک ہوا تھا۔ جنازے کو کھوکھرا پار قبرستان ملیر میں دفن کرنا تھا۔ جب ہم لوگ جنازہ دفنا کر فاتحہ وغیرہ پڑھ چکے تو میں اپنی سیلانی عادت سے مجبور ہو کر حسب عادت قبروں کے

درمیان چلتا گیا۔ اس وقت میری عمر کوئی 18 یا 19 سال ہوگی۔

قبروں کے درمیان چلتے ہوئے میں نے ٹوٹی ہوئی قبروں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ میں کافی آگے چلا گیا۔ جنازے میں شریک لوگ تو سب جا چکے تھے۔

آگے جا کر ایک قبر کافی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ میں نے اندر جھانکا تو اس میں ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے غور کیا تو ہڈیوں میں ہلچل ہو رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ میں چکرا کر گرنے ہی والا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے سہارا دیا ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

ہوش آیا تو دیکھا کہ میں گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک پارک تھا۔ میرے سر کے پاس ایک نورانی چہرے والے بزرگ بیٹھے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے اپنا نام یوسف بتایا اور کہا کہ میں وہاں سے گزر رہا تھا جب میں نے تمہیں گرتے ہوئے دیکھا تو اٹھا کر یہاں لے آیا۔ تم جس قبر کے اندر جھانک رہے تھے وہ بلاخن کی ہے اور سنو اپنی اس عادت کو ختم کر دو۔ کبھی کسی قبر میں نہیں جھانکنا۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے وعدہ کر لیا کہ آئندہ میں کبھی کسی قبر میں نہیں جھانکوں گا۔

''مگر آپ بلاخن کو کیسے جانتے ہیں؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔

''آئندہ آپ سے جب ملاقات ہو گی تب بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر بزرگ ہستی نے مجھے ٹال دیا۔

میری طبیعت اب بہتر تھی لیکن میرے دماغ پر خوف چھایا ہوا تھا کہ ہڈیاں خواب اور خیالوں میں لہراتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

میں جب محلے میں پہنچا تو لوگ قرآن خوانی میں مصروف تھے۔ میں اپنے گھر چلا آیا۔ کھانا وغیرہ کھایا اور آرام کرنے لیٹ گیا۔ لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میرے ذہن میں قبرستان والا واقعہ تھا۔ امی بھی بار بار پوچھتی بیٹا چپ کیوں ہو۔ اب میں امی کو کیا بتاتا۔ وہ ناراض ہوتیں۔

آہستہ آہستہ سب بھولتا گیا۔ وقت کے ساتھ میں آگے بڑھتا رہا اور میں نے توبہ کر لی آئندہ قبرستان میں کسی ٹوٹی قبر میں نہیں جھانکوں گا۔

☆☆☆

سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول 'تاشون' کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ
ان کے ذاتی تجربات اور اصل حقائق واثرات
سعادت ونحوست کا حساب، حیرت وتجسس پر مبنی ناول

تاشون

تحریر: شازلی سعید مغل

۴۵۰ صفحات

برصغیر میں علمِ تسخیر کے بانی حضرت کاش البرنیؒ کی
عاملیت وکاملیت، روحانیت، محبت، تصوف اور دوسری دنیا
کے تجربات ومشاہدات پُراسراریت کے بنت نئے راز کھولتا ایک
سحر انگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش البرنیؒ ''بنام''
''تاشون'' ہیں

Postage Rs: 50

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کرائیں یا اپنے قریبی بکسٹال پر اپنا آرڈر بک کروائیں۔

Auraq Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800

ادھورا اچلّہ

مجید احمد جائی

اُس نوجوان کا قصہ جو محبوبہ کو پانے کے لیے ادھورا اچلّہ کاٹ بیٹھا تھا

میں اُن دِنوں شدید علیل تھا۔ کوئی دوا سود مند نہیں ہو رہی تھی۔ روز کیپسول، گولیاں حلق سے اُتار رہا تھا لیکن مرض بڑھتا جاتا تھا۔ جسم سوکھ سوکھ کر لکڑی ہوا جاتا اور رنگت پیلی زرد پڑتی جاتی تھی۔ میری عیادت کے لیے رشتے دار، عزیز واقارب آ جا رہے تھے۔ اُن میں وہ بھی عیادت کرنے آئی۔ اُس نے ہی کہا کہ مریض کا روحانی علاج کروایا جائے۔ مجھے یوں لگتا ہے اِسے کوئی مرض نہیں ہے لیکن کوئی نادیدہ طاقت اس پر قابض ہے۔

دُوسری صبح بھائی مجھے کار میں ڈال کر ایک پیر جی کے پاس لے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو لوگوں کا اژدھام تھا۔ جیسے مرد وزن کا میلہ لگا ہو۔ ان پڑھ، پڑھے لکھے سبھی اُسی کے محتاج تھے۔ عورتوں کے لیے پردہ کا انتظام تھا لیکن پیر کے حجرے تک راستہ ایک ہی تھا۔ مجھے چارپائی پر لٹایا گیا اور تقریباً ایک گھنٹے بے آس وامید خاموش پڑا رہا لیکن میری نظریں آرام سے نہیں بیٹھتی تھیں۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر سیر و سیاحت کرتی تھیں۔ میں علیل ضرور تھا لیکن میرا دِل تو علیل نہیں تھا۔ میری نظریں ہر فریادی پر پڑتی تھیں۔ کمال لوگ ہیں۔ ڈاکٹر تو ان کے دِل میں بیٹھا ہے اور یہ دوسروں کے پاس مارے مارے پھرتے ہیں۔ اُن کا حال بھی میرے جیسا ہے یا شاید میری طرح بے بس مجبور ہیں۔ ایک گھنٹہ بعد میری باری آئی۔ میں چل پھر تو نہیں سکتا تھا۔ اِس لیے پیر جی کو خود چل کر آنا پڑا۔

جب میری پہلی نظر پیر پر پڑی تو اُس کے ہاتھ میں تگڑی چھری دیکھی۔ مونچھیں ایسے جیسے دہشت گردوں کے ٹوٹے سے ہوا اور داڑھی کے بال غائب تھے۔ سر پر پگڑی اُلجھی تھی۔ گلے میں بڑے بڑے دانوں والی بڑی سی تسبیح لٹک رہی تھی۔ کپڑوں میں سٹوٹیں تھیں۔ مجھے تو وہ کہیں سے بھی پیر نہ لگتا تھا یا میرا دِل اُسے عامل نہ مانتا تھا۔ میرے لب خاموش تھے۔ جسم ساکت تھا۔ میرا بھائی تفصیلات بتا رہا تھا۔ پیر جی نے سبز کدو منگوائے جو ہم ساتھ لے کر ہی گئے تھے۔ ہاں مجھے یاد آیا وہ عامل ''کدو پیر'' کے نام سے مشہور تھا۔ بھائی سے تازہ سبز کدو لے کر اُس پر کچھ پڑھ کر پھونک مارتا پھر چھری سے اُس کے ٹکڑے کرتا جاتا۔ پھر مریض پر پھونک مارتا۔ اور بتا دیتا کہ اس مریض کو کیا ہے۔؟ کوئی مرض ہے یا جادو۔ لیکن جب تک میں جاتا رہا، میرے کانوں نے یہ نہیں سنا کہ کسی کو کوئی مرض ہو۔ ہر آنے والے پر جن، پری عاشق تھیں۔ کالا علم کروایا گیا تھا۔ مریضوں میں سے کسی نے جنوں کے بچوں کی ٹانگیں توڑ دی تھیں، کسی نے ان کے آرام میں خلل ڈالا تھا۔ کسی نے ان کی رہائش کو نقصان پہنچایا تھا اور کئی لڑکیوں پر جن عاشق تھے۔ میری اُلجھن اُس وقت ختم ہوئی جب کدو پیر نے کہا کہ اس پر جن زادی عاشق ہو چکی ہے۔

کدو پیر اپنے منتر پڑھ رہا تھا اور میں اپنے عاشق ہونے والی جن زادی کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کے منتر کہاں کام کرتے؟ جب ڈاکٹر اور مریض کا آپس میں رابطہ ہی نہ تھا

۔وہ میرے لاشے پر پھونکیں مارتا رہا اور میں تصور کی دُنیا میں جن زادی کی تلاش کرتا رہا۔ یکا یک کدو کے ٹکڑے میرے اوپر ایسے گرے جیسے پہاڑ کی چوٹی سے کسی نے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے میرا نشانہ باندھ کر پھینکے ہوں۔ میں خیالات کی دُنیا سے باہر آیا۔

کدّو پیر اپنے منتر سے فارغ ہو کر بھائی سے مخاطب ہوا۔ اِس پر جن زادی عاشق ہے اور آسانی سے اس کی جان نہیں چھوڑے گی۔ یہ کام ہی ایسے کرتا ہے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''جوان! جو عملیات کرتے ہو ترک کر دو۔ ورنہ سزا موت تک پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ یہ شریر ہیں۔ اُڑا لیں گے۔''

مجھے کدّو پیر پر غصہ آیا۔ ''کون سے عملیات؟ کس نے کیے؟'' میں زیر لب بڑبڑانے لگا۔ ہاں مجھے یاد آیا۔

میں ماضی کے اُس ماحول میں چلا گیا جب میں نے چلے کاٹنا شروع کیا تھا۔ شہر کا بہت بڑا پرانا قبرستان تھا۔ کچی پکی قبروں سے یہ قبرستان آباد تھا۔ جال کے پرانے پرانے درخت اپنی شاخیں زمین پر بچھائے ہوئے تھے۔ اور خار زار جھاڑیاں زمین پر چپکی ہوئی تھیں۔ یہ واحد جگہ تھی جہاں کوئی نہیں آتا تھا۔ دن کی روشنی میں کوئی ادھر کا رُخ نہیں کرتا تھا تو رات کو کس نے آنا تھا۔ لیکن میرا ٹھکانہ یہی تھا۔ یونہی چاند آدھا سفر کر چکا ہوتا۔ میں اپنی بیٹھک سے اُٹھ پڑتا اور شہر خموشاں کی طرف چل پڑتا۔ میرا ٹھکانہ قبرستان کے درمیانی جال کے درخت کے نیچے بوسیدہ قبر تھی۔ یہ قبر بہت پرانی تھی۔ اُس کی تربت میں کیڑوں، مکوڑوں نے سوراخ کر کے اپنا جہاں آباد کر لیا تھا۔ اُس قبر کے ساتھ ہی غار نما سوراخ تھا۔ جو قبر کے اندر زمین کی تہہ در تہہ چلا گیا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ یہ کسی موذی جانور کی کارستانی تھی یا کوئی اور وجہ لیکن مجھے ایسی جگہ سے تلاش تھی۔ جو قبرستان میں با آسانی مل بھی جاتی ہے۔ کیونکہ حضرت انسان قبرستان میں عبرت کے لیے جاتا ہی نہیں۔

میں رات کے درمیانی حصے میں اپنے سامان کے ساتھ یہاں آجاتا اور اپنا کام شروع کر دیتا۔ میرا کام کسی اور کے لیے نہیں تھا۔ نہ آج کے دَور میں کوئی شخص بنا لالچ کے کسی کے کام آتا ہے۔ میں ایک مہ جبیں کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا نام ثانیہ تھا۔ بلا کی حسین تھی۔ اُس کے نین نقش قدرت کا حسین شاہکار تھے۔

میں اُس کی خوبصورتی پر مرمٹا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اُس کا خاندان اور تھا اور میرے خاندان سے اُن پر پرانی دُشمنی چلی آ رہی تھی۔ بس میں ثانیہ کو چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا وہ میرے پاس بیٹھی رہے اور میں اُسے دیکھتا رہوں۔ لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ سماج دُشمن کالے ناگ کی طرح پھن پھیلائے سامنے راستے کی دیوار بنا ہوا تھا۔ مجھ میں برداشت نہیں۔ میں دُوری برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بے قراری بڑھتی چلی گئی۔ دِل مچلتا تھا۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ بس محبوب اور محبوب کی یادیں غذا بنی ہوئی تھیں اور میں زندہ تھا۔ میری حالت میرے لنگوٹیے دوست نے دیکھی تو پریشان ہوا۔ مجھ سے اصرار کیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ساری داستان سنانی پڑی۔ ''بڑا بے وقوف ہے۔ یہاں بڑے بڑے کام منٹوں میں ہو جاتے اور تُو ہے چھوٹے سے مسئلے میں اُلجھا ہوا ہے۔''

''کیسے؟'' میں پھٹ پڑا۔ اور اُس نے مجھے لاہور کے عامل کا پتا دیا۔ صبح ہوتے ہی میں لاہور کے لیے نکل پڑا۔

وہ عامل بھی داتا کی نگری میں داتا کے بازار میں اپنا کاروبار چمکا رہا تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر میں پہنچ ہی گیا۔ مجھ پہ جنون سوار تھا۔ ایک نشہ تھا۔ جس میں پُور پُور ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے محبوب کے سوا کچھ دکھتا ہی نہیں تھا۔ محبوب..... محبوب..... ثانیہ..... ثانیہ کا نام دل اور زبان پہ مچلتا تھا۔ آنکھیں اُسی کی راہیں تکتی تھیں۔ لب اُس کے تعریف کرتے تھے۔۔

عامل داتا بازار کی تاریک سی گلی میں اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھا پھر بھی لوگ جوق در جوق چلے آتے تھے۔ میں نے جا کر اپنا حال بیان کیا۔ ''ہو جائے گا..... ہو جائے گا۔'' کی آواز اُس کے حلق سے نکلی۔ ''کیا ہو جائے گا..... بابا.....؟''

''مقصد پورا ہو جائے گا۔ محبوب قدموں میں ہوگا۔ دُنیا دیکھے گی..... مگر.....''

''مگر.....؟'' میں نے بے تابی سے لفظ دُہرایا۔

''مگر تھوڑی سے مشکل ہے۔'' ''وہ کیا؟ اور کیسے مشکل دُور ہوگی۔''

''چلہ..... چلہ کاٹنا پڑے گا تمہیں۔ تم اِس میں کامیاب ہو گئے تو محبوب تمھارا ورنہ محبوب تو کیا اپنا سُراغ بھی نہ پاؤ گے۔ غور سے سنو! تمہیں پرانے قبرستان میں، پرانی قبر میں بیٹھ کر رات کی تاریکی میں چلہ کرنا ہوگا۔ ہاں! اُس کے پاؤں کی مٹی بھی لینی ہوگی۔ یہ اُس مٹی میں ملا کر اُس قبر میں چلہ کی آخری رات دفن کرنی ہے۔'' اس نے سفوف کی پڑیاں دیتے ہوئے حکم صادر کیا۔

''اگر تم یہ سب کر لو گے تو کامیاب۔ تمہیں ضرور کامیاب ہونا ہے کامیاب۔''

میں نے بابا سے فیس پوچھی۔ ''بابا جی فیس کتنی ہے۔؟''

''بچہ فیس نہیں نذرانہ کہو نذرانہ۔ سات ہزار دے دو۔ ہاں تجھے بھی عمل کرنا ہوگا۔ راتوں کو جاگنا ہوگا۔ معاملہ بڑا اُلٹ ہے۔ زیادہ محنت کرنی ہوگی۔ بتاؤ دے سکتے ہو تو میں آج سے ہی کام شروع کرتا ہوں۔ ورنہ.....''

ورنہ..... کا مطلب میں سمجھتا تھا، میں نے فوراً کہا۔ دیتا ہوں۔ میرے پاس پانچ ہزار تھے۔ دو ہزار اُسی دوست سے منگوائے جس نے اِس عامل کا بتایا تھا۔ یہ الگ کہانی ہے کہ دوست کو کیسے قائل کیا۔ سات ہزار روپے عامل کو دیئے اور سفوف کی پڑیاں لے کر واپسی کی راہ لی۔

اگلے دن گھر پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ مجھے محبوب کو حاصل کرنے کی جلدی تھی۔ مزید انتظار نہیں ہوتا تھا۔ میں ثانیہ کا دیدار چاہتا تھا۔ ثانیہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا چاہے مجھ سے میری جان کی قربانی بھی لے لی جاتی۔ چلہ بھی زیادہ دن کا نہیں تھا۔ صرف گیارہ دن تھے۔۔ جان جوکھوں میں ڈال کر، کر لیتا۔

میں رات کی تاریکی میں غار نما قبر میں جاتا اور اپنے اردگرد حصار ڈال کر بیٹھ جاتا اور وظیفہ شروع کر دیتا۔ بڑی مشکل سے میں نے ثانیہ کے پاؤں کی مٹی بھی حاصل کر لی تھی۔ جس کالج میں وہ پڑھتی تھی۔ میری کزن بھی وہاں پڑھتی تھی۔ کزن کے سو سو نخرے اُٹھائے اور پھر اپنا مقصد حاصل کیا۔

مٹی بھی حاصل ہو گئی تھی اور اب صرف گیارہ دن کا چلہ پورا کرنا باقی تھا۔ بس اتنا سا کام۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ میں حصار میں رہ کر کام کرتا تھا۔ جس سے کوئی بلاء، کوئی خوف میرے نزدیک نہ آتا۔

یہ چلہ کی نویں رات تھی۔ جنوری کی یخ بستہ راتیں تھیں۔ اُس رات بارش موسلا دھار شروع ہو گئی۔ بارش کی وجہ سے ٹھنڈ بڑھ گئی۔ تیز ہوائیں بھی چل رہی تھیں اور پھر سردی کے ان دِنوں مغرب ہوتے ہی سب لحافوں میں دبک جاتے تھے۔ میں اپنی بیٹھک میں، لحاف میں دبا بے آب مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ موسم نے سردی کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ منزل کو پا لینے کا جنون، محبوب کو حاصل کرنے کا جنون سر پر سوار تھا۔ بارش، میرے جذبے ٹھنڈے نہیں کر سکتی تھی۔ بارش نے میرے اندر آگ لگا دی تھی۔ میں مقررہ وقت پر تیار ہوا۔ برساتی پہنی، جوتے پہنے اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔ آج تو کتے بھی کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ وہ بھی بارش کی وجہ سے محفوظ جگہ میں دب گئے تھے۔ ماحول میں خوفناکی پھیلی ہوئی تھی۔ بارش کی بوندیں ارتعاش پھیلا رہی تھیں اور زمین سے عجیب سی مہک اُٹھ رہی تھی۔۔

میں گھر سے قبرستان کی طرف رواں دواں تھا۔ ابھی آدھا سفر طے ہوا تھا کہ آسمانی بجلی کڑکی۔ ایک دھماکہ سا ہوا۔ یہ بجلی مجھ سے تھوڑی دُور گھنے لیکر پر گری تھی۔ بس مجھے اتنا یاد ہے۔۔ اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ کسی نادیدہ ہستی نے میرے اعصاب پر قبضہ کر لیا تھا اور میں دُنیا سے بیگانہ ہو گیا۔

بے ہوش ہونے سے پہلے میرے پاؤں کسی شئے سے ٹکرائے تھے اور میں زمین کے فرش پر اوندھے منہ گرا تھا۔ تب سے لے کر آج تک بستر مرگ پر پڑا ہوں۔ اُس رات دھماکے کی آواز سُن کر میرے بھائی، میری بیٹھک میں آئے تھے۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ اُنہوں نے مجھے نہ پا کر خوف اور حیرانگی میں مجھے ڈھونڈنے لگے۔

گھر سے ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر مجھے اوندھے منہ بے ہوش پڑا دیکھا تو اُٹھا کر گھر لے آئے۔ اُس رات سے آج تک بیمار پڑا ہوں۔ دوا، دارو کر کر تھک سے گئے ہیں اور پیروں فقیروں کے چل بھی چل رہے ہیں۔ لیکن اب کدّو پیر کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ جس نے جن زادی کا عشق بتایا تھا۔ جس کی شکل وصورت سے واقف نہ تھا۔ میں کسی کے عشق میں بیمار تھا اور وہ میرے عشق میں پاگل تھی۔ دونوں ہی عاشق تھے۔ وہ میری عاشق تھی اور ثانیہ کا۔

میری کزن نے ثانیہ کو بتا دیا تھا کہ احمد تم پہ مرتا ہے اور تیرے عشق میں بیمار پڑا ہے۔ پھر ایک دن میری محبوبہ، میری عیادت کرنے آئی۔ میں اُس کا دیدار کر چکا۔ وہ چلی گئی تھی لیکن میری تشنگی ابھی باقی تھی۔ من کی حسرت قدرے کم ضرور ہو گئی تھی۔

میں چار سال سے بستر مرگ پر پڑا ہوں۔ کدّو پیر۔ کالے بکرے کے کُرروپوش ہو چکا ہے۔ اور اُس جن زادی کا آسیب میرے ذہن میں ڈال گیا ہے۔ شاید وہ میرا دیدار کر لی ہو گی لیکن میرے جلوے دیکھنے کے لیے تڑپائے جا رہی ہے۔ ثانیہ کی شادی کہیں نہیں ہوئی۔ راز دان ذرائع سے خبر ملی ہے کہ وہ میری سوا کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ جانے وہ بھی میرے عشق میں گرفتار ہے۔ دِلوں کے بھید رب ہی جانے۔ میں کیا۔ میری اوقات کیا۔ دُعا کریں کہ میں صحت پا کر ثانیہ کو حاصل کر لوں اور جن زادی سے ملاقات ہوئی تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔

☆☆☆

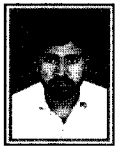

میں زندہ ہوں

مور شاہد حسین

وہ نوجوان اچانک ہی ایک بدروح کے ہتھے چڑھ گیا تھا

میں ایبٹ آباد سے اپنے دوست اشفاق احمد رفیق کے پُرزور اصرار پر فراغت کے دنوں اس کے گاؤں جانے کو تیار ہوا۔ اشفاق احمد رفیق راولا کوٹ (آزاد کشمیر) کے قریب ایک گاؤں سنگولہ کا رہائشی ہے۔

ایبٹ آباد سے راولا کوٹ اور پھر سنگولہ جانے والی گاڑی بھی جلدی مل گئی۔ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھی کہ اچانک ایک جھٹکے سے رکی۔ معلوم ہوا کہ انجن میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔ انجن کی خرابی کی وجہ سے کافی تاخیر ہوگئی۔ گاڑی بمشکل ہاڑولی تک پہنچی۔

میں نے اِدھر اُدھر نظریں گھما کر سواری کا جائزہ لیا۔ کسی مقامی آدمی سے معلوم ہوا کہ اس وقت سنگولہ تک کسی سواری کا ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ پھر میں نے مرے ہوئے قدموں سے پیدل چلنے میں ہی عافیت جانی اور شارٹ کٹ کچی سڑک پر چلنا شروع ہوگیا۔ سنسان سڑک اردگرد پھیلے جنگل کی وجہ سے کچھ اور سنسان ہوگئی تھی۔ اس وقت شام جھکنے لگی۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج آہستہ آہستہ دھوپ سمیٹتا دور پہاڑوں کی اوٹ ڈوب رہا تھا۔ جھکتی ہوئی شام تیزی سے ماحول پر مسلط ہوتی جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ میں نے اپنے چاروں اطراف نگاہیں دوڑائیں دور دور تک ہولناک سناٹا تھا۔ دور کہیں آوارہ کتوں کے بھونکنے اور گہرے سناٹے نے کافی ڈراؤنا ماحول بنایا ہوا تھا۔ سڑک تاحدِ نگاہ سنسان اور تاریک تھی۔ دونوں کناروں پر دیوقامت درخت جھکے ہوئے تھے جو اس سناٹے کو مزید وحشت ناک بنا رہے تھے۔ اس سڑک پر اکیلے جانے کا تصور ہی ہولناک تھا۔ چاروں طرف گہری خاموشی کا راج تھا۔ اس حالت میں سرد تیز ہوائیں ماحول کو ڈراؤنا بنا رہی تھیں۔ یوں انجانا سا خوف مجھ پر سوار ہوگیا۔ خوف سے میرا برا حال تھا۔

اس رات سردی اپنے عروج پر تھی۔ موٹے کپڑے پہننے کے باوجود بھی مجھے سخت سردی محسوس ہورہی تھی۔ قریب ہی سرسراہٹ سی ابھری تو میں نے چونک کر اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں۔ آہٹ کچھ دیر سرسراتی رہی اور پھر [illegible]

[illegible] میں [illegible] ٹھٹک کر رہ گیا جیسے کوئی ڈراؤنا اور بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے اچانک آنکھ کھل گئی ہو۔ سامنے کا منظر ہی کچھ ایسا تھا۔ خوف کی شدید سرد لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ [illegible] منظر دیکھا وہ میرے ہوش اڑا دینے [illegible] تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں راستہ بھول کر کسی قدیمی [illegible] آ نکلا ہوں۔ اپنے اردگرد کچی پکی قبریں دیکھ [illegible] خوف و دہشت سے میرے بدن [illegible] اور میری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ [illegible] ایک ہی جگہ پر جن ہوکر رہ گیا۔

قبرستان کے ماحول اور اس کے پھیلے خوف سے مجھے اپنی موت سامنے ناچتی محسوس ہوئی۔ یوں میری حالت دیر بہ دیر بگڑتی جارہی تھی۔ میں سر پکڑ کر ایک قبر سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا کچھ دیر ستالوں پھر چلتا ہوں میں تھکن سے چور چور اوپر سے قبرستان کی دہشت نے بری طرح قبضہ کرلیا تھا۔ دوسرے لمحے میں آہستہ آہستہ اندھیرے میں احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے قبرستان کے داخلی دروازے تک پہنچا تھا کہ دور کہیں آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آواز نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں قبرستان کی حدود سے جلد از جلد دور جانا چاہتا تھا کہ یکدم ہی کسی کتے کی غراہٹ نے میرے رہے سہے بھی اوسان خطا کردیئے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ آواز میرے بہت قریب سے آرہی ہے۔ خوف سے میرا خون رگوں میں خشک ہونے لگا۔ خوف دہشت سے میری حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ تب میں وہیں بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں موندھے بیٹھا رہا۔ میں بہت خوف زدہ تھا۔ اچانک کوئی آواز سن کر مزید خوفزدہ ہوگیا اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں آنکھیں کھول دیں یہ دیکھ کر میں بری طرح چونکا کہ میرے بہت قریب چشمے سے پانی ابل رہا ہے۔ دوسرے لمحے وہشت ناک منظر میری نگاہوں کے سامنے رونما ہوگیا۔ مجھے عجیب سی بدبو کا احساس ہوا۔ غور کرنے پر محسوس کیا کہ وہ شدید ناگوار قسم کی بدبو چشمے کے پانی سے آرہی تھی۔ میں فوراً گھبرا کر سیدھا ہوگیا اور آگے کی طرف بے تحاشا بھاگنے لگا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ میں کہاں اور کس طرف بھاگ رہا ہوں۔ خاردار جھاڑیاں جگہ جگہ اگی ہوئی تھیں جن کے نوکیلے کانٹے بھاگنے کی وجہ سے میرے جسم کے مختلف حصوں سے ٹکرا کر مجھے زخمی کررہے تھے۔ میرے جسم سے خون رسنے لگا اور میں نڈھال ہوکر گرا پڑا لڑکھڑایا بھی تھا مگر ہمت اور حوصلہ کرتے ایک سمت بھاگتا ہی چلا گیا۔ موت کا خوف میرے دل میں سمایا ہوا تھا۔ میرے قدم چلتے چلتے ایک گھنی جھاڑی میں ایسے الجھے کہ میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور جھاڑی میں ہی جا گرا۔ میں دم سادھے جھاڑی میں کسی بے جان کی طرح پڑا رہا۔ جب میرے حواس بحال ہوئے میں نے آہستگی سے سر اٹھا کر اردگرد کا جائزہ لیا، وہ علاقہ بڑی بڑی جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اکا دکا درخت ہی کھڑے تھے جن کی لمبائی آسمان کو چھو رہی تھی۔ پہلے پہل میں نے سوچا کہ یہیں رات بتادی جائے مگر زمین

پر بے تحاشا رینگتے ہوئے کیڑوں مکوڑوں اور زہریلے حشرات کی بھرمار تھی۔ قصہ مختصر چند لمحے میں نے وہیں کھڑے سانس درست کی اور پھر تھکے ہوئے قدموں سے اردگرد کا بغور جائزہ لیتا ہوا سست رفتاری میں آگے بڑھ رہا تھا کہ مجھے دور کہیں روشنی محسوس ہوئی۔ تو میں اس طرف لپکا پہلے مجھ میں بھاگنے کی بالکل سکت نہ تھی مگر سامنے روشنی دیکھ کر میری جان میں جان آگئی اور باقاعدہ اس روشنی کی طرف بھاگ پڑا قریب جانے پر وہ روشنی مجھے صاف دکھائی دی وہ کوئی مکان تھا۔

وہاں کا سارا ماحول بہت پراسرار اور سنسنی پھیلا دینے والا تھا۔ میں نے مکان کے بیرونی دروازے پر کئی بار زور زور سے دستک دی مگر دروازہ کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے مکان کے اندر جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا اور اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ خستگی کی وجہ سے میرے گلے میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ میں مکان کے بیرونی دروازے کے بہت قریب پریشانی کے عالم میں کھڑا کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہا تھا۔ یوں کافی دیر گزر گئی۔

میں مکان کے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک مکان کا داخلی دروازہ کھلا۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر میں بھاگ کر اندر داخل ہو گیا۔ یہاں تک کہ میں نے دروازہ کھولنے والے کے متعلق نہیں سوچا۔ مجھے دو کمرے نظر آئے۔ ایک کمرے سے ہلکی سی روشنی آرہی تھی جب کہ دوسرے کمرے میں گپ اندھیرا تھا۔ روشنی والے کمرے سے قدموں کی آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے چونکنا نظریں گھمائیں چرچراہٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھل گیا اور میں اس کمرے کی طرف لپکا اور پھر کمرے میں داخل ہو گیا۔

ایک لڑکی دروازے کی طرف پشت کیے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے لمحے وہ میری طرف مڑی میری نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنی خوب صورت لڑکی کیا حسن و جمال تھا۔ وہ کوئی حور تھی شاید راستہ بھول کر زمین پر اتر آئی تھی۔ وہ میرے دل پر قیامت ڈھاتی نظر آرہی تھی۔ انتہائی باریک اور نہایت ہی مختصر کپڑوں سے اس کے چاند کی طرح چمکتے ہوئے جسم کا انگ انگ جھلک رہا تھا۔ وہ حسن و رعنائی میں اپنی مثال آپ تھی۔ وہ گھنی زلفوں کی مالک تھی اور اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں جادو تھا۔ لمبی لمبی پلکوں کی جھالر نے اس کی روشن آنکھوں کو مزید خوب صورت بنایا ہوا تھا۔ دلکش سراپا، سرخ گال، اونچی ناک، گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک ہونٹ، اس کی خوب صورتی بیان کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے بس وہ خوب صورتی کا مکمل شاہکار تھی۔

''یہاں بیٹھ جاؤ!'' اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے لال گلابی ہونٹوں کو جنبش دی اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرے دماغ میں مختلف سوچیں گردش کر رہی تھیں۔ میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ عجیب سے مشروب کی بوتل اور گلاس میرے سامنے میز پر رکھے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

''یہ پی لو۔'' اس نے رسیلی آواز میں کہا تو میرا دل بے ترتیب دھڑکنے لگا۔ میں نے لمحے کی تاخیر کیے بغیر عجیب سے مشروب سے بھری وہ بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دی۔ مشروب کا ذائقہ عجیب مگر انتہائی لذت بخش تھا۔ ایک عجیب سی ترنگ میرے رگ و پے میں سرائیت کر گئی۔ مدہوشی کے عالم میں میری نگاہیں اس کا طواف کر رہی تھیں اور میرا دل خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو نبیل احمد؟'' اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں بری طرح چونکا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا یا یہ پوچھتا کہ میرا نام کیسے معلوم ہوا وہ خود ہی میری طرف پشت کیے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے بڑھ کر اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا تو میری [illegible] اختیار نہیں نکلتی چلی گئیں۔ میں دیوانہ وار چیخنے لگا۔ وہ ایک انتہائی خراش منظر تھا۔ وہ کوئی چڑیل تھی اس کی صورت اتنی بھیانک تھی کہ میری جان نکلنے والی ہو گئی۔

اس کی [illegible] انتہا ڈراؤنی شکل تھی۔ اف کس قدر بھیانک چہرہ [illegible] مدت سے میرا دل پھٹ رہا تھا۔ ڈر سے میرا دل [illegible] اس کی آنکھیں لال انگارے جیسی ہو رہی تھیں [illegible] آنکھوں میں قہر و غضب دیکھ کر دہشت کے مارے [illegible] رہ گیا۔ روح تک کانپ اٹھی۔

اس کی [illegible] سرخ تھیں اور دو لمبے دانت منہ سے باہر نکل [illegible] سرخ انگارہ آنکھیں، بڑے بڑے دانت [illegible] لمبے ناخن اور اس کے ہاتھوں بلکہ پورے [illegible] بال تھے اسے دیکھ کر میرے دل کی

دھڑکنیں تیز ہو گئیں جیسے دل سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا۔

وہ چڑیل مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔ میں چند قدم پیچھے کھسک گیا۔ تب اس نے ایک جست لگائی اور مجھے دبوچ کر حملہ آور ہو گئی۔ وہ خبیث میری گردن میں اپنے نوکیلے دانت گاڑ کر میرا لہو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی گرفت میں اتنی سختی تھی کہ میں اس کی طرف سے خوف کو آزاد نہ کرا پا رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے اپنی زندگی کے بچاؤ کی تدبیر سوچ رہا تھا اور پھر میں نے اپنے جسم کو پورا زور لگا دیا اور اس طرح کرنے سے میں اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

دوسرے لمحے وہ کسی بھوکے درندے کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑی۔ اس کی گرفت دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ آج کی رات میرے لیے آخری رات ہو سکتی ہے۔ بس موت کا فرشتہ میری گردن دبوچنے آپہنچا ہے اور بے وقت موت میرا مقدر بن چکی ہے۔ پھر ہمت کر کے یا اللہ کہتے ہوئے پوری قوت سے اس پر حملہ کیا۔ یوں اس کی گرفت نرم ہوتی چلی گئی اور میرے ایک ہی جھٹکے سے کئی فٹ دور جا پڑی۔

اس نے بہت ہیبت ناک شکل اختیار کر لی اور شعلہ بر ساتی نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ جیسے کچا کھا جائے گی۔ وہ خبیث بہت غصے کے عالم میں تھی اس کی ہیبت دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ واقعی میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ مجھے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں اس سے پہلے کہ میری حالت غیر ہو جاتی اس وقت بالکل غیر ارادی طور پر میں نے آیت الکرسی کا دم اپنے سینے پر کر کے اپنے اردگرد حصار کر لیا اور پھر ایک دم کثرت سے قرآن مجید کی جتنی سورتیں مجھے یاد تھیں صدق دل کے ساتھ انہیں پڑھنا شروع کیا تو وہ بری طرح چلانے لگی۔ خوفناک آوازیں نکالنے لگی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جہاں تھی وہاں ساکت ہوتی چلی گئی اور دوسرے لمحے مجھے دو مہربان ہاتھوں نے اٹھایا اور میں فضا میں بلند ہونے لگا۔ میں فضا میں پرواز کر رہا تھا لیکن مجھے اپنے آس پاس کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کہاں جا رہا ہوں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں خوف سے سمٹا ہوا تھا۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں مر چکا ہوں اور میری روح اڑا لے جائی جا رہی ہے۔ معلوم نہیں کتنی دیر فضا میں پرواز کرنے کے بعد مجھے زمین پر اتار دیا گیا۔

وہ ایک مجیب سنسان سی جگہ تھی [illegible] تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چند کمرے نمایاں تھے جہاں ہلکی پھلکی روشنی آرہی تھی۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مجھے اپنا جسم بہت بھاری لگ رہا تھا اور میرا رواں رواں کانپ رہا تھا کہ اچانک میری سماعت سے مہربان آواز ٹکرائی۔

''آج تمہاری زندگی بچ گئی ہے، تمہیں نئی زندگی مبارک ہو۔''

میں نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ ایک نورانی چہرے والے بزرگ بہت وقار سے چلتے ہوئے میرے قریب بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ نور سے اس قدر چمک رہا تھا کہ اس پر نظریں نہیں ٹھہر رہی تھیں اور پھر انہوں نے میرے رستے ہوئے زخموں پر مرہم لگا کر آرام کرنے کا حکم دیا۔

بزرگ نے بے پناہ محبت سے لبریز لہجے میں کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا اور یوں گہری نیند میں چلا گیا۔

صبح کی کرنیں آہستہ آہستہ چاروں طرف اپنے پر پھیلا رہی تھیں۔ دن نکل رہا تھا میں نے چونک کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں جہاں تھا وہاں اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ میں اپنے گھر کے قریب سڑک پر تھا۔ بڑی مشکل سے گرتا پڑتا وہاں سے ایسا بھاگا کہ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ میں گھر میں داخل ہو کر سیدھا کمرے میں چارپائی پر گر گیا۔ مجھے شدید سردی لگ رہی تھی۔ میرا پورا بدن بری طرح کانپ رہا تھا اور مجھے اتنا شدید بخار آیا کہ خدا کی پناہ۔

☆.....☆

یہ ایک حقیقت تھی جو برسوں پہلے مجھ پر گزری تھی۔ اس رات میں نے اپنی موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا مگر رب رحمٰن کی رحمت نازل ہوئی ایسا معجزہ ہوا کہ میری زندگی بچ گئی۔ آج بھی اس رات کے کسی بھی منظر کا خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی یوں بھی لگتا ہے کہ وہ ایک خواب تھا کوئی بے انتہا ڈراؤنا بھیانک خواب اور خود کو زندہ دیکھ کر دن میں کئی بار خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اگر اس رات خدا نے اپنی غیبی امداد نہ کی ہوتی تو..... شاید میں یہ کہانی نہ لکھ رہا ہوتا۔

☆☆☆

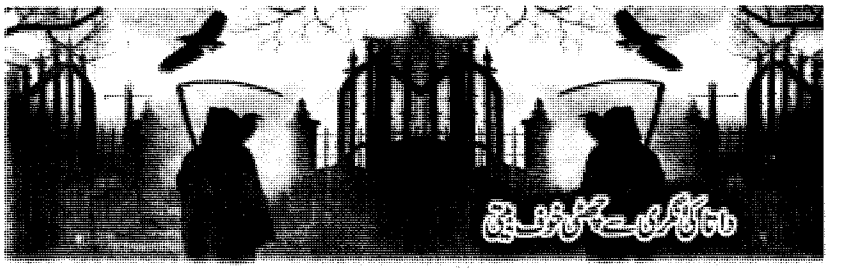

روٹی دے دو

شیما عبدالقیوم

آج بھی ہمارے محلے میں اُس مقتول کی بھوکی روح بھٹکتی ہے

بعض دفعہ انسان اتنے عجیب وغریب واقعات کی زد میں آجاتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان پر یقین لانا پڑتا ہے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ بھی کئی دوسری مخلوقات اتاری ہیں جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں بھی ملتا ہے جن میں جنات، شیاطین کا بھی ذکر شامل ہے۔ میں آج جو واقعہ آپ کو سنانے جارہی ہوں یہ سو فیصد حقیقت اور سچائی پر مبنی ہے اور اس میں کہیں بھی مبالغہ آرائی شامل نہیں۔ ہم جس علاقے میں رہا کرتے ہیں وہ کراچی کا سب سے قدیم اور ہجرت کے بعد آنے والے مہاجروں کی پہلی رہائش گاہ بنا پیرالٰہی بخش کالونی ہے۔ ہماری گلی کے اختتام پر ایک ندی تھی جو لیاقت آباد سے جا ملتی۔ لوگ بتایا کرتے کہ اس ندی کے کنارے ایک بوڑھی بیوہ عورت رہا کرتی تھی جس کا ایک نوجوان بیٹا بھی تھا۔ وہ بھی کوئی مزدوری تو کبھی بھیک مانگ کر اپنا گزر اوقات کیا کرتے۔ ایک بار لڑکا شدید بیمار ہوگیا۔ بوڑھے ماں جتنی محنت کر کے روکھی سوکھی روٹی لاسکتی تھی لے آیا کرتی یہاں تک کہ وہ خود بھی بیمار ہوگئی۔ اب دونوں بیمار ایک جھونپڑی میں پڑے تھے۔ انہی حالات میں ماں کا انتقال ہوگیا۔ لڑکا جو پہلے ہی نڈھال تھا وہ یہ برداشت نہ کرسکا اور گلے میں پھندا ڈال کر جھول گیا۔ کافی دنوں بعد دونوں کی اموات کا پتا چلا۔ اس کے بعد سے کچھ پراسرار واقعات ہونے لگے۔ آدھی رات کو اکثر گلی میں کسی کے چلنے، رونے اور روٹی مانگنے کی صدا سنائی دیتی مگر دروازہ کھولنے پر کچھ دکھائی نہ دیتا۔

میں ان دنوں دس بارہ سال کا تھا۔ ایک دن ابو کے بہت عزیز دوست گھر آئے باتوں اور کھانے میں بارہ بج گئے۔ ابو انہیں سڑک تک چھوڑنے اور امی کے لیے میٹھے پان بنوانے چلے گئے۔ باقی بھائی بہن سو رہے تھے مگر میں پان کے لالچ میں جاگ رہا تھا۔ امی نے مجھے کہا۔ ''یاسر بیٹا دروازہ بند کرآؤ۔''

میں جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا تو خوف کے مارے میرے اوسان خطا ہوگئے۔ کوئی شخص دروازے کے بہت نزدیک سر جھکائے کھڑا تھا۔ جیسے ہی میں نے دروازے کو بند کرنا چاہا وہ دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔ ''بھوکا ہوں روٹی دے دو۔''

سردیوں کے دن تھے۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور بھاگتا ہوا امی کے قدموں کے پاس آگرا۔ امی نے مجھے یوں خوفزدہ دیکھا تو میں نے انہیں سارا قصہ سنایا۔ وہ مجھے بازوؤں میں لیے لیے کمرے میں آگئیں۔ کچھ عرصے بعد میری خالہ

اور خالو کراچی آئے خالو یہاں روزگار کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ ہمارے ہی پاس رہائش اختیار کیے ہوئے تھے۔ اکثر وہ راتوں کو دیر سے گھر آیا کرتے۔ رات ساڑھے بارہ بجے کا ٹائم تھا۔ میاں بیوی کھانا کھانے بیٹھے۔ ابھی انہوں نے پہلا نوالہ ہی توڑا ہوگا کہ باہر سے وہی صدا سنائی دی ''بھوکا ہوں روٹی دے دو''۔ خالو نے روٹی اٹھائی اور باہر نکلے تو پوری گلی سنسان پڑی تھی۔ وہ حیران حیران پلٹ آئے۔ ایسا تین چار بار ہوا۔ وہ ہر بار باہر نکلتے مگر کوئی نظر نہ آتا۔ پھر انہوں نے امی سے ذکر کیا تو امی نے انہیں سختی سے تاکید کی کہ ہرگز دروازہ نہ کھولا کریں۔ میں کیا ہر بچہ بچپن میں پرتجسس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ اب مجھ میں یہ تجسس بڑھ گیا کہ ایک بار اسے دیکھوں۔ میں اس رات دیر تک جاگتا رہا۔ خالو گھر آئے، خالہ نے کھانا گرم کیا تبھی میں بھی ان کے کمرے میں آگیا۔

''کیا بات ہے یاسر ابھی تک سوئے نہیں؟'' خالو مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

''بس نیند نہیں آرہی خالو۔'' میں وہیں بیٹھ گیا۔

''آؤ کھانا کھالو۔'' خالہ نے پکارا۔

''نہیں آپ لوگ کھائیں۔''

میں باہر کی آوازوں پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ تبھی کسی کے ہلکے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔

''کیا ہوا نیند آگئی۔'' خالہ نے پکارا۔

''جی خالہ۔'' یہ کہتا میں دروازے کی طرف لپکا۔

ہلکی سی کمزور آواز آرہی تھی ''بھوکا ہوں روٹی دے دو'' میں نے دروازہ کھولا ایک سایہ سا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے پکارا۔ ''یہ لو روٹی۔'' میں نے ہاتھ میں دبا روٹی کا ٹکڑا آگے بڑھایا۔ وہ پلٹا اور میں جیسے وہیں گڑھ گیا وہ ایک مردہ تھا سفید کفن میں لپٹا بے جان چہرہ بھیانک پھیلی آنکھیں۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے سر کو جھٹکا دیا۔ اس کی گردن آگے لٹک گئی جیسے گردن اور جسم میں کوئی جوڑ ہی نہ ہو۔

میری چیخوں نے سب گھر والوں کو جگا ڈالا اور میں کئی دن بخار میں تپتا رہا۔ بعد میں امی اور خالہ نے جو میری کلاس لی وہ الگ قصہ ہے۔ آج میں شادی شدہ ہوں مگر وہ رات

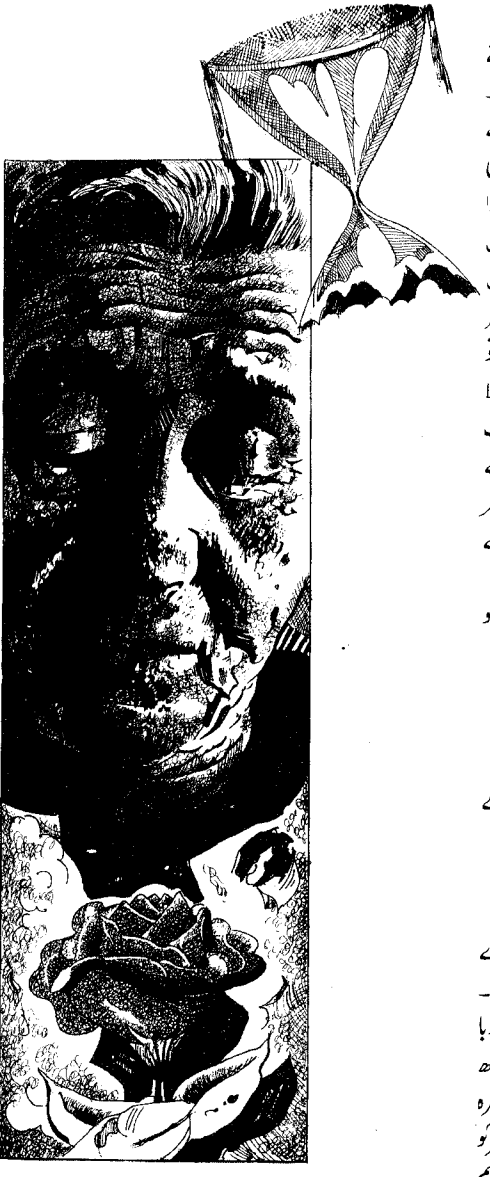

اور وہ آواز آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے اور میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ واقعی کچھ قصے صرف قصے نہیں ہوا کرتے حقیقت سے جڑے ہوتے ہیں۔

☆☆☆

قوسِ قزح

راوی: چوہدری وسیم

تحریر: رانا حبیب الرحمٰن

جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے فیوڈل سسٹم کے شکار اُس نوجوان کی سرگزشت

جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

(تیسرا حصہ)

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بول بھی سکتی ہو۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ تم گونگی ہو۔ اب صبر کرو اور یہیں بیٹھ جاؤ۔'' وہ ایک جھاڑی کے قریب ہی بیٹھ گئی اور میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا لیکن مجھے کوئی آدمی نظر نہ آیا میں سیدھا خربوزے کے کھیت میں جا گھسا اور جو تین چار خربوزے پکے ہوئے نظر آئے انہیں توڑ کر سونیا کے پاس لے آیا اور اسے کھانے کو کہا اور خود بھی ایک خربوزہ کھانا شروع کر دیا تو وہ بولی۔ ''ایک بات بتاؤ تم ہو کون اور ڈاکوؤں سے چھین کر اب مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''سونیا اصل میں، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں میں بھی جس طرح تم اغوا ہو کر یہاں آئی ہو اسی طرح میں بھی اغوا ہو کر آیا تھا لیکن بعد میں ان کے چھوٹے سردار جی کا حکم بڑے سردار سے بھی زیادہ چلتا ہے وہ اچھا آدمی ہے اس نے مجھے چھوڑ دیا اور ساتھ ہی تمہیں بھی لے جانے کو کہا تھا۔ میں ڈاکوؤں کے سردار کے کہنے پر ہی تمہیں اپنے ساتھ لایا ہوں تاکہ تمہیں تمہارے گھر تمہارے باپ کے پاس پہنچایا جائے ویسے بھی چانڈیو صاحب کافی پریشان ہوں گے۔''

وہ حیران ہوتی ہوئی بولی۔ ''کیا تم میرے والد کو جانتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں جانتا ہوں لیکن تمہیں نہیں جانتا تھا۔ آج صبح مجھے سردار نے ہی تمہارے متعلق بتایا تھا۔''

کہنے لگی۔ ''تمہیں اغواء کیوں کیا تھا انہوں نے؟''

میں نے کہا۔ ''اسی نے ان کو موٹی رقم دی تھی کہ مجھے قتل کر دیں لیکن میں ان کا مطلوبہ آدمی نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔''

ایک جگہ پانی تھا۔ کپڑا رکھ کر سونیا کو پلا دیا تھا جس چیز کی [illegible] اس چیز کی قدر کی جاتی ہے عام حالات میں ماتلاں کے نواحی علاقے شبیر آباد میں [illegible] پانی بیٹی شاید یہ پانی پینا گوارہ نہ [illegible] لیکن انسان کچھ سوچتا ہے اور ہوتا کچھ اور ہے یہی قدرت ہے ہم اپنی ہر خواہش اپنی مرضی سے پوری نہیں کر سکتے لہٰذا اب ہم اسی روڈ پر جا رہے تھے کہ آگے راستے میں ایک پولیس ناکہ لگا ہوا تھا رکشہ والے نے گزر جانا چاہا لیکن پولیس کے ایک سپاہی نے اسے روک لیا میں اترا اور اس سے کہا۔

''آپ نے ہمیں کیوں روکا ہے؟ تمہیں پتا نہیں ہمارے ساتھ چانڈیو صاحب کی بیٹی ہے۔''

سی بات تھی لیکن میرے لیے عام بات نہ تھی۔

کھاپی کر ہم دوبارہ چل پڑے تھوڑا چلنے کے بعد ہمیں ایک پختہ سڑک دکھائی دی جس کے اوپر سے گاڑیاں گزر رہی تھیں ہم پکی سڑک پر جا پہنچے اور ایک رکشہ والے کو ہاتھ دے کر روکا جو اس وقت خالی تھا۔ ہم اس پر بیٹھ گئے اور شبیر آباد کی طرف جانے کے لیے کہا وہ چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے چوہدری کرم دین اور ڈاکوؤں کی پہنچ سے ہم کافی دور آ گئے ہیں لیکن انسان کچھ سوچتا ہے اور ہوتا کچھ اور ہے یہی قدرت ہے ہم اپنی ہر خواہش اپنی مرضی سے پوری نہیں کر سکتے لہٰذا اب ہم اسی روڈ پر جا رہے تھے کہ آگے راستے میں ایک پولیس ناکہ لگا ہوا تھا رکشہ والے نے گزر جانا چاہا لیکن پولیس کے ایک سپاہی نے اسے روک لیا میں اترا اور اس سے کہا۔

''آپ نے ہمیں کیوں روکا ہے؟ تمہیں پتا نہیں ہمارے ساتھ چانڈیو صاحب کی بیٹی ہے۔''

ان کا یہ سننا تھا کہ پولیس والے ہم دونوں کی طرف بڑھے رکشہ والا منت سماجت کرتا ہوا چلا گیا لیکن ہم کو پولیس والوں نے پکڑ لیا تھا۔ اسی وقت انہوں نے کال چلا دی کہ ''چانڈیو صاحب کی بیٹی مل گئی ہے اور اسے اغواء کرنے والا لڑکا بھی مل گیا ہے۔''

میں یہ سنتے ہی بولا۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں نے اسے اغواء نہیں کیا بلکہ اسے ڈاکوؤں نے اغوا کیا تھا۔''

ایک موٹا سا پولیس والا بولا۔ ''کا کے ہر مجرم یہی کہتا ہے کہ میں نے یہ جرم نہیں کیا لیکن جب ہمارا مہمان بنتا ہے نا تو اس جرم کے ساتھ وہ جرم بھی قبول کر لیتا ہے جو اس کے پیدا ہونے سے بھی پہلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو تاکہ ہمیں پتا چلے کہ تم کس گینگ سے تعلق رکھتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن پہلے مجھے ایک

فون کال کروا دو یا پھر خود ہی چانڈیو صاحب سے بات کروا دے۔''

کہنے لگے۔''چانڈیو صاحب خود ہی تھانے آئیں گے تو انہیں اپنی رام کہانی بتا دینا۔''

سونیا نے بھی کہا۔''یہ مجھے اغوا کرنے والا نہیں یہ تو مجھے واپس گھر لے کر جا رہا تھا۔''

پولیس والوں نے یہ کہہ کر اسے چپ کروا دیا تھا کہ''تم چپ کرو تمہیں نہیں پتا ہمیں پتا ہے مجرم اغوا کرنے والے کو یہی دھمکی دیتے ہیں کہ وہ اسے چھوڑنے جا رہے ہیں تاکہ راستے میں کوئی پرابلم نہ ہو۔ ہم تو مجرم کو دور سے پہچان لیتے ہیں۔''

پھر ایک سپاہی نے میری تلاشی لے کر میرے پاس سے سائیلنسر لگا ریوالور نکال لیا تو پہلے والا سپاہی بولا۔''دیکھا مجرم پکا ہے۔ ریوالور بھی برآمد ہو گیا ہے اور وہ بھی سائیلنسر لگا ہوا۔ بیٹا چلو۔''

مجھے ہتھکڑیاں لگ گئی تھی سونیا کو بھی ساتھ لیا اور ملتان کی جانب چل پڑا۔

☆.....☆

شبیر آباد تھانے کے تو کئی سپاہی میرے واقف کار تھے کیونکہ میٹرک پاس کرنے پر چانڈیو سمیت پورے تھانے کی نفری کو دعوت پر بلوایا گیا تھا لیکن اب پتا نہیں یہ کس تھانے کی بات کر رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا کہ نیکی گلے پڑ گئی ہے۔ خیر ابھی اتنا ناامید نہیں ہوا تھا کہ میں زیادہ پریشان ہوتا کیونکہ معاملہ چانڈیو صاحب کی بیٹی کا تھا اور چانڈیو صاحب مجھے بیٹے جیسا سمجھتے تھے اور میرے ہر راز سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس کے علاوہ بھی میرے پاس ان کے لیے ایک خاص داؤ تھا جو صرف انہیں ہی بتایا جاتا کیوں کہ پولیس والے تو سب حرام کھانے والے معلوم ہو رہے تھے۔ سب رشوت خور تھے کیونکہ میں نے دیکھا تھا۔ غریب رکشے والے سے بھی انہوں نے منت سماجت کے علاوہ اس کی جیب بھی خالی کر دی تھی اور وہ بے چارہ رفو چکر ہو گیا۔ رکشے کا نمبر میں نے دیکھ لیا تھا وہ بعد میں بھی مل سکتا تھا اور یہ میں نے سوچ کر ہی نمبر دیکھا تھا کہ جب چانڈیو صاحب آئیں تو اپنے رشوت خوروں سے بے چارے رکشہ والے کی رقم دلواؤں گا جو ہماری وجہ سے بلاوجہ عتاب میں آ گیا تھا۔

پولیس والے بہت خوش تھے کہ انہوں نے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے اور اب ان کی مزید ترقی ہو جائے گی۔ جب ہم تھانے پہنچے تو معلوم ہوا یہ تھانہ ملتان کے قریب قصبہ نور پور کا تھانہ ہے۔ تھانہ نور پور میں بھی چوہدری کرم دین کے راتب خور موجود تھے جو پل پل کی خبر چوہدری کو دیتے تھے۔ تھانے میں ایک اکرم نامی سپاہی پہلے سے موجود تھا اور وہ مجھے صرف اس حد تک جانتا تھا کہ جب میں چاند پور درویش کی لاش لے کر گیا تھا اور سب گاؤں والوں کے ساتھ مل کر دفنایا تھا اکرم نامی سپاہی کو میں نے حویلی میں دیکھا تھا۔ اس اکرم نامی سپاہی نے بھی مجھے حویلی میں پوچھ گچھ کی تھی کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ مرنے والا درویش بیگم صاحبہ (ثریا بیگم) کا کزن ہے اور یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کسی گاڑی کی ٹکر سے ہی ہلاک ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے تم خود ہی مار کر یہاں لے آئے ہو اس میں بھی تمہاری چال ہوسکتی ہے جیسے کئی سوالات کیے تھے اب وہ مجھے دیکھ کر بہت زیادہ اچھل کود کر رہا تھا۔ چاند پور کی ہر اطلاع اسی تھانے نور پور میں ہی آتی تھی۔ یہی وجہ تھی ہمارے تھانے لانے کے بعد یہ اطلاع آئی۔ چاند پور گاؤں کے قریبی جنگل سے دو لاشیں برآمد ہوئی ہیں جس میں دو آدمی جو کہ چوہدری کے خادم تھے قتل ہوئے ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ ریسٹ ہاؤس میں قتل ہونے والے آدمی کو بھی دوسرے مرنے والے ساتھ ہی اٹھا کر جنگل میں کسی دوسری جگہ پھینک دیا تھا تاکہ انہیں جانور کھا لیں لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی لاشیں پھینک کر ہی آئے تھے کہ ادھر سے کسی شکاری کا گزر ہوا تو اس نے بالکل تازہ لاشیں دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو بلایا پھر انہوں نے شکار چھوڑ کر ان لاشوں کو کاندھوں پر اٹھایا اور گاؤں چاند پور میں لے آئے۔ وہاں کے چوہدری کرم دین کو بتایا کہ یہ لاشیں انہیں جنگل سے ملی ہیں اور یہ آپ کے گاؤں

کے رہنے والوں کی ہی معلوم ہو رہی ہیں اور ان کے وارثوں کو اطلاع دیں تاکہ وہ اپنے پیاروں کو آخری بار دیکھ کر تجہیز و تکفین کر لیں۔ لیکن جنگل سے لاشیں لانے والوں کو گاؤں کے کئی افراد نے دیکھا تھا اور لاشوں کو پہچان کر ان کے وارثوں تک اطلاعات بہت جلد پہنچ گئی تھیں۔ اس پر گاؤں والوں نے مل کر کسی آدمی کو چپکے سے نور پور تھانے میں بھجوا دیا تھا۔

چوہدری کرم دین کو یہ اطلاع بھی مل گئی تھی لیکن وہ خوش تھا کہ معاملات صرف پولیس تک ہی رہیں گے۔ آخر کار گاؤں والوں کو بھی خوش رکھنا تھا۔ مجھے وہ حوالات میں بند کر کے فوراً ہی چاند پور کی طرف گاڑیوں میں روانہ ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی ایس پی علاقہ بھی شامل تھے۔ لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال پہنچا کر آئے تو شام ہو چکی تھی کچھ اندھیرا اور بڑھا تو علاقے کے ایس ایچ او نعیم صاحب میرے پاس حوالات میں آئے اور پوچھا۔''کیا تمہارا نام حماد علی ہے؟''

میں سمجھا شاید چانڈیو صاحب جو ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے شاید انہوں نے ایس ایچ او نعیم کو میری رہائی کے بارے میں اطلاع دی ہو میں نے کہا۔''جی ہاں میں ہی حماد علی ہوں۔''

ایس ایچ او نعیم کہنے لگا۔''کیا تم ہی چانڈیو صاحب کی بیٹی کو اغوا کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔''

میں نے جواب دیا۔''نہیں جناب، پولیس والوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اغوا کر کے نہیں بلکہ اسے اغوا کاروں سے بچا کر گھر چھوڑنے جا رہا تھا کہ آپ کے ماتحت پولیس والوں نے مجھے لا کر یہاں بند کر دیا ہے۔''

ہوئی ہے، میں اغوا کر کے نہیں بلکہ اسے اغوا کاروں سے بچا کر گھر چھوڑنے جا رہا تھا کہ آپ کے ماتحت پولیس والوں نے مجھے یہاں لا کر بند کر دیا ہے۔''

وہ کہنے لگا۔''اور جو تمہارے پاس سے ریوالور برآمد ہوا ہے اس کے بارے میں کیا کہو گے؟''

میں نے کہا۔''وہ میں نے ایک ڈاکو سے چھینا تھا۔''

کہنے لگا۔''یہ سچ نہیں ہے بلکہ تم نے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر اسے اغوا کیا تھا۔ پھر جنگل میں لے گئے اور تمہیں چاند پور کے دو آدمیوں نے دیکھ لیا اور تم نے ان پر اس ریوالور سے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں وہ ہلاک ہو گئے اور تم سونیا کو لے کر کہیں دور جا رہے تھے۔''

میں ایس ایچ او کے منہ سے جھوٹی کہانی سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے جواباً کہا۔''ایسا نہیں ہے۔''

اس نے ایک حوالدار کو اشارہ کیا۔ اس نے حوالات کا تالا کھولا اور مجھے ایک کمرے میں لے آیا، باہر سے ایک اور سپاہی آیا تو دونوں نے مل کر مجھے چھت کے ساتھ لگے کنڈے پر جھولتے ہوئے رسے سے باندھ دیا اور میں ٹانگوں سے الٹا ہو کر لٹک گیا۔ نیچے رسا انہوں نے ایک کھونٹے کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ پھر انہوں نے ایک چمڑے کے بنے ہوئے چھتر سے مارنا شروع کر دیا۔ میری چیخیں اب اس کمرے میں گونج رہی تھیں، ظالموں کو مجھ پر رحم نہیں آ رہا تھا۔ الٹا لٹکا کر چھترول کرنے سے میں زخمی بھی ہوا تھا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میں الٹا ہی لٹکا ہوا تھا۔ ایک سپاہی کے ساتھ ایس ایچ او آیا تو اس نے پوچھا۔

''ہاں بھئی اب بتاؤ تم نے چانڈیو صاحب کی بیٹی کو اغوا کیوں کیا اور یہ قتل کیوں کیے۔''

میں نے اسے بہت سے واسطے دے کر کہا۔''میں نے نہ تو قتل کیے ہیں نہ ہی اغوا کیا ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو تم چانڈیو صاحب کی بیٹی سے پوچھ لو یا چانڈیو صاحب سے میری بات کروا دو، وہ خود تمہیں بتا دیں گے۔''

اس پر بھی اسے یقین نہ آیا تو اس نے سپاہی کو حکم دیا کہ اسے نیچے اتارو۔ میں نے سوچا شاید مجھ پر اب تشدد نہیں کیا جائے گا لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ مجھے نیچے اتار کر وہ دوسرے کمرے سے ایک رولر لے آئے اور میری ٹانگوں پر چلانا شروع کر دیا۔ میں تکلیف سے چیختا ہوا ایک بار پھر بے

ہوش ہو چکا تھا۔ دوبارہ جب ہوش آیا تو میں حوالات کے سیلن زدہ فرش پر پڑا تھا اور حوالات میں میرے ساتھ ایک اور مجرم بند تھا جسے وہ رات ہی کو پکڑ لائے تھے۔ اس نے مجھے ہوش میں آتا دیکھا تو مجھے ایک بوتل سے پانی پلایا، بھوک مجھے ستا رہی تھی، کل سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا، نئے مجرم کا نام اسد تھا۔ اس نے میری تمام کہانی سن کر مشورہ دیا اور کہا۔

''تمہاری گرفتاری کاغذوں پر نہیں آئی۔ تم ایسا کرو کہ اقبال جرم کرلو اور گرفتاری ڈلوالو، اس کے بعد جب جج کے سامنے جاؤ تو وہاں صاف انکار کر دینا کہ میں نے جرم نہیں کیا، تب تم بچ سکتے ہو، ورنہ یہ پولیس والے بہت سے جھوٹے مقدمے بنا کر عدالت میں پیش کرتے ہیں اور آدمی پوری زندگی جیل سے باہر نہیں آتا۔''

اسد پکا مجرم تھا اور پہلے بھی کئی وارداتیں کر چکا تھا، اب بھی وہ کئی ماہ سے پولیس کو مطلوب تھا۔ رات میں کسی ہوٹل سے پکڑا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں سپاہی اور حوالدار آئے اور ہمیں حوالات سے نکال کر گاڑی میں بٹھایا تو اسد بہت پریشان نظر آیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولا۔ ''پتا نہیں کہاں لے کر جا رہے ہیں۔'' ہماری گاڑی کے پیچھے بھی کئی گاڑیاں تھیں جن میں کم از کم سات آٹھ پولیس والے تھے۔ یعنی ہم دونوں مجرموں کے علاوہ گیارہ بارہ پولیس والے تھے۔ پھر وہ ایک ایسی آبادی میں لے کر داخل ہوئے جہاں ابھی تعمیرات کا کام جاری تھا۔ کئی مکان بن چکے تھے اور کئی ابھی زیر تعمیر تھے۔ ہم دونوں کو ایک نامکمل کوٹھی کے سامنے اتار لیا پھر اسد کو لے کر کوٹھی کے دروازے تک لے گئے۔ مجھے انہوں نے گاڑیوں کے پاس ہی رکھا تھا اور پھر اسد کو بھگانے کے لیے کہا۔ اسد اب ان کی منت سماجت کر رہا تھا کہ میری جان بخشی کر دیں لیکن پولیس والوں کو کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ آخر انہوں نے وہیں اسے گولیاں چلا کر ہلاک کر دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ جعلی مقابلہ ہے جو بعد میں ٹیلی ویژن اور اخبارات کی شہ سرخیوں میں شائع ہوگا۔ میں دل ہی دل میں بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا لہٰذا کبھی ایسی صورت حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

واپسی پر اسد کی لاش بالکل میرے قریب گاڑی کے فرش پر پڑی تھی۔ تھانے واپس آکر انہوں نے مجھے حوالات میں بند کر دیا، لہٰذا میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا کیونکہ پولیس کے ظالم سپاہیوں نے بے دردی سے مجھ پر تشدد کیا تھا، تھوڑی دیر بعد ہی سو گیا۔ رات کے کسی حصے میں میری آنکھ کھلی لیکن جسم کے درد کی وجہ اور بھوک کی نقاہت کی وجہ سے جلد دوبارہ سو گیا اور خواب میں کئی بار ڈر کر اٹھا تھا۔ ہر بار خواب میں وہی پولیس کا جعلی مقابلہ ہی ہوتا دیکھتا تھا۔

☆.....☆

خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو ایک سپاہی نے حوالات کے نیچے سے ایک سوراخ کے ذریعے مجھے سالن اور روٹی دی، یقین کریں سالن ایسا تھا کہ جیسے گندے جوہڑ کا پانی اور روٹی کچی ہی اتاری گئی تھی۔ میں نے زندگی میں ایسا کھانا کبھی نہ کھایا تھا لہٰذا اب کافی دیر بعد کھانا ملا وہ بھی نہ کھانے کے لائق تھا، مرتا نہ کیا کرتا لہٰذا بھوکا مرنے کی بجائے وہی سالن کے ساتھ کچی روٹی کے دو چار لقمے زہر مار کئے اور سوچ رہا تھا کہ چانڈیو صاحب کو پتا کیوں نہیں چلا۔ اگر انہیں اس کی بیٹی سونیا کے ذریعے یہ خبر مل چکی ہے تو وہ میرا حال تک کیوں نہیں پوچھنے آئے، میرے پاس ایک ایسا راز بھی تھا جو میں کسی اور کو نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ تھانہ نور پور میں تمام پولیس والے چوہدری کرم دین کے راتب خور کتے تھے۔ میرے پاس ان کو دینے کے لئے بھی کچھ نہ تھا اور ابھی تک ظالم علی چانڈیو کی بھی کوئی خبر نہیں آئی تھی، حالانکہ میں نے سونیا کو بتایا تھا کہ تمہارے باپ کے لئے ایک خاص خبر میرے پاس موجود ہے، جب ملے تو انہیں بتا دے کہ وہ مجھے مل لیں، ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ تھانے میں ایس ایچ او ایک اخبار کا صفحہ پکڑے داخل ہوا اور سیدھا میرے پاس حوالات کے سامنے آ کھڑے ہوا اور بولا۔

''کل تم نے جو کچھ دیکھا اسے پڑھ لو اور آج فیصلہ کرلو کہ تم نے اقبال جرم کرنا ہے یا پھر اسد نامی غنڈے کی طرح.....'' یہ کہہ کر وہ اخبار میری طرف پھینکتا ہوا تھانے کے اندر چلا گیا۔ میں نے اخبار کے بیچ پر اسد کی تصویر دیکھی اور خبر پڑھنا شروع کر دی، لکھا تھا اسد نامی ٹاپ ٹین غنڈہ پولیس مقابلے میں ہلاک۔ نیچے تفصیل درج تھی۔ کل دن کے دو بجے نامعلوم کال پر اسد نامی غنڈے اور اس کے تین ساتھیوں کی اطلاع ملی کہ وہ نئی آبادی کے ایک مکان میں جمع ہیں۔ پولیس نے موقع پر کارروائی کرتے ہوئے مطلوبہ مکان پر چھاپہ مارا تو تمام مجرموں نے پولیس پر فائرنگ کر دی۔ پولیس کی جوابی فائرنگ کے نتیجے میں اسد نامی غنڈہ موقع پر ہلاک ہو گیا اور باقی تمام مجرم بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ تمام مجرم کئی ماہ سے مختلف وارداتوں جن میں قتل، اغوا برائے تاوان جیسی درجنوں وارداتوں میں مطلوب تھے۔

مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور پھر میں نے سوچا کہ اقبال جرم کرنے میں عافیت ہے۔ بعد میں اسد کی بات پر عمل کروں گا یعنی عدالت میں جا کر جج کے سامنے صحت جرم سے انکار کر دوں گا۔ لہٰذا جب دوبارہ مجھے ایس ایچ او کے کمرے میں لے جایا گیا تو میں نے اقبال جرم قبول کرلیا جس پر ایس ایچ او نے خوشی میں مجھے بریانی اور دیگر کھانا کھلایا اور پھر مختلف کاغذوں پر میرے انگوٹھے لگوائے، یعنی میری تھانے میں مکمل گرفتاری اندراج کر دی۔ شام تک انہوں نے میری خوب میزبانی کی۔ دوسرے دن مجھے باقاعدہ عدالت لے جا کر جج سے تین دن کا ریمانڈ حاصل کرلیا۔ ان تین دنوں میں میرے پاس کوئی جاننے والا نہ آیا تھا، نہ ہی چانڈیو صاحب جس کی اب مجھے امید نہ رہی تھی۔ انہی دنوں سننے میں آیا کہ چانڈیو صاحب کراچی چلے گئے ہیں اور ان کی واپسی دو ہفتے بعد ہوگی۔

چوتھے دن مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ ملتان جیل میں مجھے ایک سیل میں بند کر دیا، وہاں سیل میں پہلے سے دو آدمی موجود تھے۔ انہوں نے سلام دعا کر کے میرا انٹرویو شروع کر دیا۔ کون ہو، کہاں سے آیا ہوں، کیوں آیا ہوں۔ یعنی کون سا جرم کیا۔ میں نے تمام کہانی بتا دی اور کہا اب لڑکی اغوا کے ساتھ دوہرے قتل میں جیل آ گیا ہوں۔ اس پر انہوں نے افسوس کیا اور مجھے جیل میں اونچ نیچ سمجھانے لگے۔ جیل کا کھانا بھی تھانے کی حوالات جیسا ہی تھا۔ میں نے کھانے کی طرف دیکھا تو وہ بولے اب یہی کچھ کھانے کو ملے گا۔ جب تک یہ مقدر میں لکھا گیا ہے۔ اسی پر شکر صبر کے کھاؤ پیو، دو تین دن میں، میں کھانا کھانے لگ گیا تھا۔

☆.....☆

چار دن بعد ایک سنتری میری کوٹھڑی کے سامنے آیا اور بولا تم میں حماد علی اور وجاہت علی کون ہے؟ میں اٹھ کھڑا ہو گیا تو وہ بولا تمہاری ملاقات آئی ہے۔

میں پریشان ہو گیا تھا کہ میری ملاقات پر اب کون آ گیا ہے۔ جب سنتری سے پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''مجھے کیا پتا کون ہے۔ ویسے وہ ایک جوان لڑکی ہے اور اپنا نام سونیا بتاتی ہے۔''

میں فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑا تا کہ سونیا سے مل کر اصل صورت حال کا اندازہ ہو جائے۔ جب میں ملاقات والی جگہ پہنچا تو سونیا مکمل نقاب میں تھی۔ سلام دعا کے بعد بولی۔ ''میں نے پاپا کو تمہارے متعلق سب فون پر بتا چکی ہوں۔ انہوں نے بھی کہا ہے کہ میں تمہاری ملاقات پر جاؤں اور کہوں کہ گھبراؤ مت، میں کراچی سے واپسی پر جیل میں ملاقات پر آؤں گا اور عدالت کی پہلی پیشی پر وکیل کی مدد سے تمہاری ضمانت ہو جائے گی۔ پھر مجھے نور پور تھانے میں نفری کے متعلق بتانا، ان سے بھی پوچھ گچھ کر لی جائے گی۔ اب وہ تیسرے دن بدھ کو تمہارے پاس آئیں گے۔ تم انشاء اللہ رہا ہو جاؤ گے اور یہ تمہارے لئے کچھ رقم لے کر آئی ہوں اور یہ کھانا میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ صرف تمہارے لئے۔ مجھے پاپا نے تمہارے متعلق سب بتا دیا ہے۔

اس لئے پریشان نہ ہونا۔'' اس طرح کی کئی باتیں کرتی رہی پھر ملاقات کا وقت ختم ہونے پر سپاہی مجھے واپس میرے سیل میں لے آیا۔

کئی دن بعد گھر کا پکا کھانا کھایا تو مزہ آ گیا اور کھانا کھاتے وقت مجھے عاتکہ کی بھی یاد ستا رہی تھی کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی اگر اسے پتا چلا تو وہ میرے بارے میں کیا خیال کرے گی لیکن مجھے سونیا حوصلہ دے گئی تھی اور مجھے پتا تھا کہ چانڈیو صاحب اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے مجھے رہا کروالیں گے۔

☆.....☆

ایک رات کو اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھا ان دونوں سے ایک آدمی جس کا نام فہد سلیم تھا اور وہ اوکاڑہ کا رہنے والا تھا وہ رو رہا تھا۔ میری آنکھیں بھی اس کے رونے کی وجہ سے کھلی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور فہد سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم کیوں رو رہے ہو؟''

کہنے لگا۔ ''یہاں ہر آدمی دکھی ہے۔ کس کس سے اس کا دکھ پوچھو گے۔'' پھر رمیز کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''اگر یہ نہ ہوتا تو میں اب تک خودکشی کر چکا ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''مانا کہ ہر انسان دکھی ہوتا ہے لیکن اگر بتانا مناسب سمجھو تو اپنا دکھ مجھے سنا کر ہلکا کر سکتے ہو۔ تمہارا دل ہلکا ہو جائے گا۔''

دوسرا قیدی رمیز گہری نیند میں تھا۔ فہد ایک نظر رمیز کی طرف ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں پہلے بھی ایک بار جیل آ چکا ہوں۔ میں بھی پہلے تمہاری طرح ایک شریف آدمی تھا لیکن زمانے کی ستم ظریفی کی وجہ سے ایک موٹر سائیکل چوری میں آیا تھا جو کہ میں نے نہیں کی تھی لیکن برآمد میرے پاس سے ہوئی تھی اور یہ جو مجھ پر مقدمہ ہے یہ بالکل انوکھا ہے ویسے بھی چند دنوں میں میں رہا ہو جاؤں گا۔ حماد صاحب انوکھا اس لیے کہ میں خود کو بہت دیر سمجھتا ہوں ایک بار میں ساہیوال گیا ہوا تھا اور جب واپس اپنے شہر اوکاڑہ جا رہا تھا تو راستے میں دو ڈاکو ایک موٹر سائیکل والے کو لوٹ رہے تھے میں نے ایڈونچر کرنے کا سوچا اور ان ڈاکوؤں سے بھڑ گیا اور اس راہ گیر موٹر سائیکل والے کی ڈاکوؤں سے گلو خلاصی کروائی اسی وقت گشت کرنے والی پولیس کی گاڑی آئی تو دونوں ڈاکو بھاگ کھڑے ہوئے میں نے موٹر سائیکل والے آدمی کو سنبھالا اور پھر سائیکل اس کے قریب لے جانے لگا تو اسی وقت پولیس کے چند سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا اور بولے، کیا ماجرا ہے جس پر اس راہگیر آدمی نے ڈاکوؤں والا معاملہ بتا دیا سیدھی سیدھی بات تھی میں نے ڈاکوؤں سے اس آدمی کو بچایا تھا لیکن پولیس والے نہیں مانے آخر انہوں نے موٹر سائیکل والے آدمی کو تو چھوڑ دیا لیکن مجھے ڈاکوؤں کے ساتھی کے طور پر پکڑ کر تھانے لے گئے۔ پھر انہوں نے مجھے موٹر سائیکل کی چوری کے الزام میں جیل بھجوا دیا چند دن بعد ایک جج کا دورہ جیل آیا تو اس نے معمولی نوعیت کے 12 مجرم رہا کیے تو اس 12 آدمیوں کی لسٹ میں میرا نام بھی تھا۔ میں جیل سے رہا ہو گیا تھا لیکن اب میں نے چند دن میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ ایک دن کاروبار کی تلاش میں جا رہا تھا کہ ان ہی ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو کی نظر مجھ پر پڑی وہ تنہا تھا اس لیے وہ میرے طرف بڑھا، دعا سلام ہوئی تو اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس دن موٹر سائیکل والے سے رقم چھیننے والے تھے اور اب میرا ساتھی ایک بار پھر پولیس والوں نے پکڑ لیا ہے اب وہ جیل میں جا چکا ہے اس نے ہی تمہارے بارے میں مجھے بتایا تھا کہ تم جیل میں ہو اور دوسرے دن تم جیل سے رہا ہو چکے تھے جو آدمی جیل میں ایک بار آ جائے اسے کالج یا یونیورسٹی کی ضرورت نہیں رہتی اور تم بہت کچھ دیکھ چکے ہو اس لیے تم پر اعتماد کر کے تمہیں اپنی پہنچان کروادی ہے۔ تم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں وہ اس لیے کہ تم جی دار آدمی ہو۔ پھر میں نے اس کے ساتھ مل کر ایک گروپ بنایا اور چھوٹے موٹے کئی جرائم کرنے لگے۔ پھر ایک دن جیل والا آدمی بھی رہا ہو کر آ گیا تھا وہ بہت ہوشیار اور چالاک آدمی تھا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا۔

''فہد کیا چھوٹے چھوٹے کام کر رہے ہو، میں نے ایک بنک میں ڈاکا ڈالنے کا منصوبہ بنایا ہے اس پر عمل کر کے ہم راتوں رات امیر ہو سکتے ہیں۔ پھر ہمیں پیسوں کے بل بوتے کسی دوسرے ملک کی نیشنلٹی بھی مل سکتی ہے۔''

میں تو صرف گزارے لائق ہی ایسے کام کرتا تھا لہٰذا میں نے صاف جواب دیا کہ تم جاؤ۔''

اس کے کئی مجرموں سے رابطے تھے لہٰذا ایک دن اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے مل کر میری پسند کی لڑکی کو اغواء کر لیا اور اسے ایک محفوظ ٹھکانے پر لے آئے۔ وہاں میں پہلے سے موجود تھا۔ وہ لڑکی میرے ماموں کی بیٹی تھی لہٰذا میں اسے اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

فہد جب اپنی اسٹوری سنا رہا تھا تو اس وقت رمیز بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سگریٹ سلگا لی اور ہماری باتیں سننے لگا۔ فہد کہنے لگا۔ ''میرے دو بہن بھائی ہیں اور میرے ماموں کی صرف ایک اکلوتی بیٹی تھی جو مجھ سے صرف ایک سال ہی چھوٹی تھی پہلے تو سب آپس میں اکٹھے رہائش پذیر تھے پھر ماموں نے علیحدہ مکان لے لیا اور وہاں رہنے لگا۔ میں بچپن سے ہی آسیہ کو پسند کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ میری پسند محبت میں بدل گئی۔ کئی بار آسیہ کو میں نے اشارتاً بتایا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن ہر بار وہ مجھے ٹھکرا دیتی تھی اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر سب کچھ بھول گیا تھا اسی خوشی میں انہوں نے بینک ڈکیتی کے لیے مجھے راضی کر لیا تھا جس کمرے میں آسیہ کو رکھا گیا تھا میں اس کے سامنے آیا تو وہ مجھے دیکھتے ہی چلا اٹھی اور مجھے ہزاروں باتیں سنا ڈالیں میں نے پیار سے اسے سمجھایا کہ شور مچانے سے کچھ نہ ہوگا۔ اب تم مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ وہ روہانسی سے ہو کر بولی تمہیں پتا ہے کہ ابو کتنے پریشان ہوں گے کیوں کہ تمہارے نامراد گھٹیا دوستوں نے مجھے اغواء کیا ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم کب سے ان کے ساتھ برے کام کرنے لگے ہو میں کسی برے انسان کے ساتھ شادی ہرگز نہیں کر سکتی اور کسی بری نیت والے قریب آنے سے پہلے اپنی جان دے دوں گی۔ لیکن قدرت کے فیصلے عجیب ہوا کرتے ہیں اور اس کے فیصلے انسان کبھی بدلنا چاہے بھی تو نہیں بدل سکتا۔ حماد علی صاحب! یہ میری جیل میں آنے کی داستان صرف بڑوں کی ہی غلطی ہے یہ سن کر ہر انسان اپنے کان پکڑ کر توبہ کرے گا جو بھی سنے گا اس کے لیے عبرت ہوگی کیوں کہ بے بس عبرتناک ان لوگوں کے لیے جو اپنے بچے بیچ دیتے ہیں۔ کسی ایسی مجبوری کے لیے ان لوگوں کے لیے جو اپنے بچوں پر گہری نظریں نہیں رکھتے ان لوگوں کے لیے جو اپنے غموں کو آدھا کرنے کے لیے رشتہ داروں کے بچے لے کر پالتے ہیں اور ان کے لیے جو ماں باپ اپنے بچے کو کسی قریبی رشتہ دار کو جس کے یہاں اولاد نہیں ہوتی دے دیتے ہیں یہ آج سے تمہارا بچہ ہوا اور بچے کو معلوم یہی ہوتا بلکہ بتایا بھی یہی جاتا ہے کہ وہی پالنے والے اس کے والدین ہیں۔ اصل حقیقت کسی نہ کسی وجہ سے چھپالی جاتی ہے میں نے کہا نا کہ قدرت کے فیصلے کبھی غلط بھی نہیں ہوتے وہ ہر انسان کے لیے جس کو اس نے پیدا کیا ہے اس کے لیے اچھے فیصلے کرتی ہے جو اسے فائدہ بھی دیتا ہے۔ یہی بات تھی کہ جب میں آپ کے ساتھ اس کمرے میں بیٹھا تھا وہ ہماری بہت ہی محفوظ آماجگاہ تھی ہم جو بھی واردات کرتے اس جگہ جا پہنچتے اس لیے وہ محفوظ جگہ تھی جہاں کسی کو محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ ہم کوئی غلط کام کرتے ہیں۔''

اسی وقت ہمیں باہر سے گاڑیاں رکنے کی آواز آئی لیکن زیادہ توجہ نہ دی کیوں وہ باقاعدہ ایک روڈ تھا جہاں دن میں کئی بار گاڑیاں گزرتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بھی باہر بھاری بوٹوں کی آوازیں آئیں میں یہ آوازیں پہنچانتا تھا۔ انہوں نے آتے ہی دروازہ کھول دیا اور مجھے فوراً ہی ہینڈ زپ کر دیا میرے پاس پستول تھا اور اس کے دو راؤنڈز باقی تھے میں پہلے حماد تمہیں بتا چکا ہوں کہ میری بڑی وارداتیں یا قتل وغارت یا اغواء کرنے کو بھی اچھا نہ سمجھتا تھا نہ

یہی دوسرے کے ساتھ کیسی بڑی واردات کرنے جاتا تھا اس لیے جس وقت انہوں نے آسیہ کو اغواء کیا وہاں سے ایک لڑکا دیکھ رہا تھا آسیہ کالج میں پڑھتی تھی اور چھٹی کے وقت گھر جانے کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کالج وین ابھی نہیں آئی تھی، اسی وقت ان لڑکوں نے گاڑی اس کے قریب روکی اور فوراً ہی اسے گاڑی میں پھینکا اور گاڑی تیز رفتاری سے بھگا کر لے گئے۔ وہ لڑکا اسٹاپ سے تھوڑی دور کھڑا تھا اپنی بائیک کے قریب اس نے اس گاڑی کا نہ صرف نمبر دیکھ لیا، بلکہ وہ پیچھا بھی کرنے لگا اور وہ سیدھا ہمارے محفوظ ٹھکانے تک آ پہنچا۔ ٹھکانہ دیکھ کر وہ سیدھا پولیس چوکی پہنچا وہاں سب اغواء کی تفصیل بتا کر پولیس کو اپنے ساتھ لایا اس طرح پولیس نے جب چھاپا مارا تو دوسرے ساتھی بھاگ گئے لیکن مجھے پتا نہ چلا کہ کیا ہو رہا ہے، ویسے بھی محبوبہ چھوڑ کر میں کیسے بھاگ سکتا تھا، بھاگ کر میں اپنی ماموں کی بیٹی کو دوسروں کے رحم وکرم پر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ کیونکہ میں ابھی اتنا برا انسان نہیں ہوا تھا، اب انہوں نے مجھے پکڑ کر ہتھکڑیاں لگا دیں اور مجھے اپنے ساتھ تھانے لے آئے پھر آسیہ نے بھی یہی بیان دیا کہ اسے اغواء کرنے والے اس کے ساتھی تھے لہٰذا کامران مجاہد جس نے اس واردات اغواء کا بھانڈا پھوڑا تھا اب چشم دید گواہ ہونے کے علاوہ، مدعی بھی بن چکا تھا پھر وہ آسیہ کو گھر بھی پہنچا کر آیا تھا باعزت طور پر۔ میں اسے خدا کی طرف سے بھیجا جانے والا فرشتہ سمجھتا ہوں جس نے موقع پر پہنچ کر ہماری عزت رکھ لی اور ہمیں گناہوں کے عذاب سے بچا لیا ورنہ ہم دنیا کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہتے ہر آدمی ہم دونوں پر انگلیاں اٹھاتا۔ مجھے 14 دن پولیس چوکی پر رکھنے کے بعد اغواء برائے تاوان میں جیل میں بھجوا دیا گیا۔ گھر میں میرے والدین کو آسیہ نے غصے کی وجہ سے نہیں بتایا تھا لیکن گھر والے بہت پریشان تھے ویسے میں زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اب پورے چھ ماہ ہو چکے ہیں میں اسی جیل میں ہوں اور تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔ بابا حماد عرف ہادی صاحب یہاں ختم نہیں ہوئی بلکہ یہ دوسرا رخ اختیار کر گئی ہے ایک [illegible] اور ممانی میری طرف سے زیادہ پریشان تھے آسیہ کو ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے گئے تو اس نے غصہ بھلا کر ان کو تمام قصہ بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اسے اغواء کروانے والا فہد تھا جو اب ساہیوال سینٹرل جیل میں ہے اوکاڑہ سے ساہیوال جانے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ آسیہ کی تمام بات سن کر ماموں ممانی نے میرے والدین کو بلوا لیا تھوڑی دیر میں ہی آسیہ کو بھی تمام پرانی خاندانی راز کی باتیں سننے کو مل گئی تھیں ہوا کچھ یوں تھا کہ جب میرے پیدا ہونے کے بعد آسیہ پیدا ہوئی تو میرے ماں باپ نے آپس میں مشورہ کر کے میری پھوپی کو بلوایا اور مجھے اس کے حوالے کر دیا وہ میری پھوپی اپنے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھی اس کے ساس سسر بھی اسے بے اولادی کا طعنہ دیتے تھے اس لیے جب میں ان کو ملا تو انہوں نے اس کو راز رکھنے کے لیے میرے ماں باپ سے کہہ دیا کہ وہ کسی کو یہ نہ بتائیں کے یہ ہماری اولاد نہیں ہے۔ پھوپی کے ساس سسر دوسرے شہر پاکپتن میں رہتے تھے لہٰذا وہ کبھی کبھار ہی آتے تھے اس لیے انہیں بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ دادا، دادی بن گئے ہیں جب وہ ملنے آئے تو مجھے دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی دادی تو میری جان نہ چھوڑتی تھی۔''

ابھی یہ فہد اپنی گزرے دنوں کی باتیں سنا رہا تھا کہ باہر سے ایک سنتری کی آواز آئی وہ ہمیں باتیں کرتا دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔ ''کیوں بھئی تم سوئے نہیں ہو کوئی پرابلم تو نہیں نا؟'' ہم نے کہا۔

''نہیں ہمیں اب کون سی پرابلم ہوگی، کیونکہ اب ہم خود پرابلم بن گئے ہیں۔'' اس پر سنتری بولا۔

''میری تم لوگوں کے لیے دعا ہے کہ اللہ تمہیں مزید مشکلات سے بچائے۔'' اتنے میں فہد کو پیاس لگی۔ وہ جیل کے ایک کونے میں رکھے پانی کے گھڑے کی طرف بڑا اور پانی پینے لگا سنتری آگے چلا گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ دنیا میں مجھے کیا کیا تماشے دیکھنے کو ملیں گے۔ کالج میں موجود لائبریری سے کبھی کبھی کوئی ناول پڑھنے سے وہ لائبریری داستانیں ہوتی تھی اس وقت سوچتا تھا یہ جھوٹ اور جعلی داستانیں ہیں جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا لیکن اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں یہاں سے جا کر اپنی داستان ضرور رقم کروں گا۔ ساتھ ہی دوسرے لوگوں کی باتیں اور ان کے خیالات، زندگی کے کمالات بھی تحریر کروں گا۔ اس لیے جب فہد پانی پی کر واپس آیا تو میری سوچوں کا محور ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ رمیز دوبارہ سو چکا تھا۔ ہم ایک بار پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔ فہد جہاں سے بات چھوڑ کر گیا تھا وہیں سے شروع ہوگیا۔

''حماد میرے اس طرح پھوپی کے پاس جانے پر کئی لوگ خوش تھے۔ اس خوشی کو دیکھتے ہوئے میرے والدین نے آج تک اس راز کو راز رکھا اور کسی کو بھی ہوا نہ لگنے دی اور اب پھر راز میری آزادی کے لیے کھولنا ان سب کی مجبوری بن چکی تھی پھوپی جسے میں ماں کہتا تھا اس کے ساس اور سسر چند سال پہلے وفات پا چکے ہیں اس لیے اپنے اس راز کے کھل جانے پر کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے اسی وجہ سے آسیہ کو پتا چلا وہ میری سگی بہن ہے اور میں اصل میں اس کا بھائی ہوں چند دن پہلے وہ تمام لوگ ملاقات کرنے اوکاڑہ سے ساہیوال جیل میں آئے تھے اور آسیہ بہن بھی آئی تھی۔ انہوں نے مجھے دلاسہ دیا ہے کہ اب وہ کوششیں تیز کر کے مجھے رہا کروالیں گے۔ وہ وکیل کو بھی لائے تھے آسیہ نے مجھے بتایا تھا کہ اب وہ مجھ سے بالکل ناراض نہیں ہے بلکہ پہلے بھی وہ مجھے دل ہی دل میں چاہتی تھی اور چاہتی تھی کہ ہماری شادی ہو جائے لیکن قدرت نے اپنا فیصلہ غلط نہ ہونے دیا اور مجھے آسیہ کا بھائی بنا دیا۔

آسیہ بھائی بھائی کہتی نہ تھک رہی تھی لیکن میری آنکھوں میں شرمندگی کے آنسو تھے اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے بھائی کے ملنے کی خوشی کے آسیہ مجھے کہہ رہی تھی۔

''بھائی فہد آپ کی میں کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرواؤں گی آپ جلدی باہر آ جاؤ۔ حالانکہ وہ یہ نہیں سوچ رہی تھی کہ اسی کے اغواء پر میں جیل میں ہوں، ایڈووکیٹ معین بھنڈر نے بتایا کہ آسیہ کے بیان کی عدالت میں بہت اہمیت ہے کیونکہ اسی کے اغواء پر ایف آئی آر درج ہوئی ہے۔ معین بھنڈر نے اپنا وکالت نامہ میرے انگوٹھے لگوا کر عدالت میں جمع کروا دیا اور اسی ہفتہ کو عدالت میں پیشی کے دوران میری ضمانت ہو جائے گی پھر دو چار تاریخوں پر کیس ختم ہو جائے گا۔''

صبح ہو چکی تھی ساری رات جاگتے ہوئے گزر گئی تھی۔ رمیز بھی جاگ گیا تھا، کہتے ہیں خود سے بڑا دکھ دوسرے کا ہوتا ہے اس وقت مجھے ایک گانا یاد آ رہا تھا۔

کسی کا دکھ دیکھا تو اپنا دکھ بھول گیا۔

میں بھی اس وقت اپنے دکھ کو کچھ دیر کے لیے بھول گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہمارے ساتھ والے سیلوں میں بھی قیدی بند ہیں لہٰذا اس طرح تو ہر کسی کو کوئی نہ کوئی دکھ ضرور ہوتا ہے اور کوئی کوئی مجبوری کے تحت وہ شریف آدمی سے مجرم بننے تک کتنے اذیت ناک لمحوں سے گزرتا ہے یہ بس وہی جانتا ہے کسی دوسرے کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس کے دکھ کا مداوا کر سکتا ہے سوچوں کے دوران ہی میں عاتکہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس حال میں ہوگی کیا کر رہی ہوگی۔ میں کالج بھی جا پاؤں گا یا نہیں مجھے قاتل کے روپ میں لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اچانک میں نے فہد سے پوچھا۔

''تو تم اوکاڑہ کے رہائشی ہو لیکن ساہیوال جیل سے یہاں ملتان جیل میں کیسے آ گئے؟'' وہ کہنے لگا۔

''دراصل چند دن پہلے ساہیوال جیل میں لڑائی ہوئی قیدی سیل میں آپس میں ہی لڑ پڑے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو زخمی کیا تھا اسی سیل میں ہم بھی بند تھے۔ جیل انتظامیہ نے ہمیں بھی عتاب میں لا کر تشدد کر کے ہمارا چالان ملتان نکال دیا اب میں

اور رمیز اس سیل میں بند ہیں اور رمیز بھی ساہیوال کا رہنے والا ہے ورنہ جیل میں دو آدمی اکٹھے ایک سیل میں نہیں رکھتے۔ تین کر دیتے ہیں اسی وجہ سے کل تک ہم تین ہی تھے ایک رہا ہو کر چلا گیا ہے اس کی جگہ پر تم ہمارے ساتھ بند ہو، باقی سیلوں میں پانچ یا چھ کی تعداد میں گنتی ہے جو کہ بہت زیادہ ہے۔'' میں سوچ رہا تھا کہ قانون کیا ہے حقیقت میں مجھے قانون کی کوئی سمجھ نہیں آئی تھی بس اب تک یہی سمجھ میں آیا تھا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔

☆.....☆

جیل میں مجھے آج چودھواں دن تھا چودھویں دن یعنی آج عدالت میں پہلی پیشی تھی جیل کی گاڑی پر مجھے عدالت میں لے جایا گیا۔ کمرہ عدالت کے اندر جب میری باری آئی تو وہاں سب لوگ جس میں میری طرف سے وکیل اور ڈپٹی چانڈیو صاحب بھی تھے وہیں سونیا بھی آئی تھی کیونکہ اسے ہی اغواء کیا تھا پھر جو قتل ہوئے ان کے وارث بھی آئے ہوئے تھے۔ کمرہ عدالت بھرا ہوا تھا چانڈیو صاحب اور ان کی بیٹی سونیا بھی ملے تھے جج کمرے میں آیا تو میری فائل پکڑ کر اس کی اسٹڈی شروع کر دی اور وکیل کو اشارہ کیا تو وہ بحث کرنے لگا۔ جج ضروری نکات نوٹ کرتا گیا مجھ سمیت سونیا اور دوسرے لوگوں سے بھی سوال وجواب ہوئے اور آخر میں جج نے میری ضمانت قبول کر لی اور پانچ لاکھ کا مچلکہ مانگا جو اس وقت چانڈیو صاحب نے اپنے مکان کی رجسٹری کی صورت میں دے دیا۔ جج نے چیک کر کے فائل میں کچھ لکھا اور پھر ایک فارم پُر کر کے مجھے لے جانے والوں کو دے دیا اور وہیں عدالت میں ہی میری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ ہم سب لوگوں یعنی میں چانڈیو صاحب اور وکیل سمیت سونیا بھی بہت خوشی سے ملی۔ عدالت سے باہر آ کر سب مجھے گلے ملے۔ باہر آ کر میں ایک نئی زندگی محسوس کر رہا تھا۔ میں اپنی محبت عاتکہ کے پاس اڑ کر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر ہم بھی یعنی میں اور سونیا، چانڈیو صاحب کی گاڑی میں بیٹھ کر ان کے گھر آ گئے وہاں چانڈیو کی بیوی یعنی سونیا کی والدہ بھی پڑے تپاک سے ملیں اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس چانڈیو صاحب کے لیے جو خبر ہے وہ انہیں بتا کر ان کے احسان [illegible] دینا مجھ پر بچھی جا رہی تھی کھانا تیار ہو کر آیا تو سب مل کر کھانے لگے چانڈیو صاحب نے بتایا کہ انہیں ایک ضروری کام سے کراچی بندرگاہ پر جانا پڑا تھا وہیں کسی وجہ سے چند دن لگ گئے تھے وہیں سونیا نے فون کے ذریعے بتایا تھا لیکن جب میں نے تھانہ نور پور میں کال کی تو پتا چلا کہ تمہیں جیل شفٹ کر دیا گیا ہے۔ میں نے اس وقت سونیا سے تمہاری ملاقات کے لیے کہا تھا لیکن اب تک نہ میں حشمت اور عظمت کی کوئی خبر ہے اور نہ چوہدری کرم دین کی عاتکہ کو لیکن وہ تمہارے اچانک گم ہونے پر پریشان ضرور ہیں۔ انہوں نے تمہارے گم ہونے کی خبر مجھے دی تھی اور کہا تھا کہ اسے ہر صورت تلاش کیا جائے انہیں بھی چوہدری کرم دین پر شک تھا لہٰذا جب تمہارے بارے میں مجھے پتا چلا کہ تم تھانے میں ہو تو میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہادی مل گیا ہے لیکن وہ کسی کام میں مصروف ہے جو میں نے اس کے ذمے لگایا ہے۔ انہیں آج صبح بھی بتایا تھا کہ آج وہ آ جائے گا اس لیے وہ تمہارے بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ عاتکہ نے تو دس بار فون کر کے مجھ سے پوچھا ہے کہ تم کب آؤ گے سونیا نے عاتکہ کے بارے میں پہلی بار سنا تھا لہٰذا تجسس تھی کہ یہ عاتکہ کون ہے اور اس کا ہادی سے کیا رشتہ ہے۔ ایک بار چانڈیو صاحب تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تو سونیا کو تنہائی مل گئی اور پوچھنے لگی۔ ہادی، عاتکہ کون ہے تو میں نے کھل کر اسے بتا دیا کہ اس سے محبت کرتا ہوں اور عنقریب شادی کر لوں گا۔ اس بات پر وہ مرجھا گئی تھی لیکن پھر فوراً ہی پہلے جیسی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد چانڈیو صاحب اندر آئے اور انہوں نے مجھ سے میرے اغواء ہونے سے لے کر اور سونیا کے ساتھ پولیس ناکے تک ہر ایک بات بتا دی یہ بھی بتا دیا تھا میرے ساتھ سونیا کو بھیجنے میں سردار منگی کا بڑا ہاتھ ہے اور دوسرا احسان اس کا یہ بھی ہے کہ اس نے آپ کی رکی ہوئی ترقی کا راستہ بتا دیا ہے بلکہ ایک برائی کو ملک کی خاطر ختم کرنے کی اپیل بھی کی ہے اس لیے کہ آپ ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ ورنہ

پورے ملتان کے تھانوں میں لگی ہوئی پولیس ڈیپارٹمنٹ رشوت خور ہے وہ ایسا بڑا کام نہیں کر سکتے باقی رہا جنگل کے محل وقوع کا مسئلہ تو وہ میں خود وہاں آپ کو لے جا سکتا ہوں۔ میں جیل میں چوہدری کرم دین کے ڈرگ نیٹ ورک اور اس کی ڈرگ لیبارٹری کا نقشہ تیار کیا تھا۔ وہ نقشہ میں نے اس وقت نکال کر چانڈیو صاحب کو دیا۔ وہ نقشہ دیکھنے کے بعد بولے۔ بیٹا ہادی میں یہ کام تنہا بھی نہیں کر سکتا اس کے لیے تو باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پڑے گی اور جنگل میں بڑا آپریشن کرنا پڑے گا اور اس میں پولیس ڈیپارٹمنٹ بالکل انوالو نہیں ہو گی بالکل اس آپریشن کے اسپیشل فورس اور آرمی سے مدد لینا پڑے گی کیوں کہ اتنے بڑے نیٹ ورک سسٹم کو ختم کرنا بہت مشکل کام ہے بہت سی ایجنسیاں حرکت میں آئیں گی اور جب تک میں اسپیشل والوں سے اور خفیہ آرمی سے مدد نہیں لے لیتا اس وقت تک بات صرف ہم تینوں کے درمیان رہے ورنہ ہمیں وہاں سے کچھ نہیں ملے گا اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اور ابھی تم جیل سے آئے ہو چند دن اپنے گھر والوں اور دوستوں سے ملو اور کالج سے تمہارا نام خارج ہو چکا ہو گا لہٰذا میں تمہیں دوبارہ داخلہ دلوا دوں گا اور پریشان نہ ہونا، اللہ ہماری مدد کرے گا پھر انہوں نے مجھے ایک پیک شدہ مہنگا موبائل سیٹ دیا اور کچھ نمبر مجھے بتائے اور میں نے اس میں فیڈ کرے۔ باقی انہوں نے سونیا سے کہا کہ وہ مجھے اس کا مکمل استعمال سمجھا دے اس میں انٹرنیٹ کی سہولت موجود تھی۔

لہٰذا پھر سونیا نے مجھے چند منٹوں اس کے استعمال کا طریقہ بتا دیا سونیا نے اس میں اپنا نمبر بھی سیو کر دیا تھا میں نے جب پوچھا کہ تم نے اپنا نمبر کیوں سیو کیا ہے تو کہنے لگی کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے اس میں 600 کے قریب بیلنس تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا تو انہوں نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور چچا حشمت اور عظمت کے ہاں لے آئے۔ گھروں کے سب لوگ بہت خوشی سے ملے میں نے محسوس کیا کہ واقعی ان لوگوں کو میں اتنا پیارا ہوں کہ چند دن دوری برداشت نہیں کر سکتے لیکن تمام لوگوں میں عاتکہ مجھے دکھائی دی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ آج اپنے گاڑی چاند پور گئی ہوئی ہے۔ کل اتوار کی چھٹی گزار کر واپس آ جائے گی میری امیدوں پر پانی پڑ چکا تھا کہ اب عاتکہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھے گی تو وہ کیسے ملے گی کیا کیا باتیں کرے گی لیکن تمام باتیں تیسرے دن تک ملتوی ہو چکی تھیں۔ گھر میں ہر طرف خوشی ہی خوشی پر چہرے پر نظر آ رہی تھی میں یہ خوشیوں سے دمکتے چہرے ایسے ہی چھوڑ کر گاؤں نہیں جا سکتا تھا ویسے بھی میں اب چوہدری کرم دین کی نظروں میں آ چکا تھا اب مزید پریشانی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا لہٰذا عاتکہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

☆.....☆

آخر کار خدا خدا کر کے پیر کا دن آ گیا۔ میں آج کافی دنوں بعد کالج جانے کے لیے تیار ہوا اور وقت پر کالج روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے میں پرنسپل روبینہ کے دفتر میں گیا تو وہ وہاں کسی فائل پر جھکی دکھائی دیں میں نے دیکھ لیا تھا وہ کالج کی ماہانہ فیسوں والی فائل کھولے کچھ دیکھ رہی تھیں میں اجازت لے کر داخل ہو چکا تھا تو پرنسپل روبینہ صاحبہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئیں اور فوراً ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

''آؤ حماد میاں بیٹھو تمہارے آنے سے پہلے تمہارے متعلق مجھے کال مل چکی ہے چانڈیو صاحب سے میری تفصیل سے بات تو نہیں ہوئی البتہ اب تم تفصیل سے اپنے غیر حاضر رہنے کا جواز پیش کرو میں سننا چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔'' میں نے مختصر کر کے تمام واقعہ بیان کر دیا تو وہ بولیں۔

''حماد بیٹے! گھبراؤ نہیں ایسے واقعات زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اس لیے ان کا سامنا ہوتا رہتا ہے اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تم اپنی کلاس اٹینڈ کر سکتے ہو میں روبینہ صاحبہ کا شکریہ ادا کر کے کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ کلاس روم کی طرف بڑھ گیا۔

(جاری ہے)

خونی ہرم

عاطر شاہین

فراعنہ کی سرزمین سے اُس خونی ہرم کی داستان جس میں
اک سادہ لوح نوجوان اپنی ہم سفر کی بھینٹ دے آیا تھا

میرا نام ابرار ہے اور میرا تعلق لاہور سے ہے۔ میرے پاپا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ ان کا بزنس دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلا ہوا تھا اور وہ بزنس کے سلسلے میں مختلف ممالک میں جاتے رہتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ بزنس ٹور پر جاتے تھے تو امی، مجھے اور میری بہن سارہ کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ سارہ مجھ سے چار سال چھوٹی تھی اور حال ہی میں بی ایس سی کر کے فارغ ہوئی تھی۔

اس بار پاپا کا ٹور مصر کا تھا اور ان کے ساتھ جانے والوں میں ہمارے علاوہ میری بیوی زرتاشہ بھی شامل تھی۔ میری زرتاشہ سے شادی کو پانچ ماہ ہو گئے تھے۔ زرتاشہ میرے پاپا کے دوست برہان فاروقی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ برہان فاروقی تھے تو پاکستانی مگر روزگار کے سلسلے میں نیوزی لینڈ میں مقیم تھے۔ ان کا بھی اپنا بزنس تھا۔ پاپا سے ان کی دوستی اس وقت سے تھی جب وہ پاکستان میں رہتے تھے۔ پاپا اور برہان فاروقی کلاس فیلو بھی تھے۔ انکل برہان جب بھی پاکستان آتے تھے تو زرتاشہ ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میری اور زرتاشہ کی دوستی ہو گئی جو بعد ازاں شادی میں بدل گئی۔

دو دن کے بعد ہم مصر کے شہر قاہرہ میں موجود تھے۔ مصر میں بھی پاپا کے ایک دوست رہتے تھے جنہوں نے ہمیں رہائش مہیا کی تھی۔ ان کا نام تاتیک تھا اور وہ بے حد اچھے انسان تھے۔ انہوں نے ہمیں مصر میں موجود اہراموں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں اہرام دیکھنے میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ دو روز کے بعد میں، زرتاشہ اور سارہ جیپ میں سوار ہو کر اہرام دیکھنے کے لئے نکل پڑے۔ چونکہ قاہرہ شہر کو دنیا کا سب سے زیادہ بڑا بازاروں کا شہر کہا جاتا ہے اس لئے ہم نے غور کیا کہ ہر چوک سے کئی بازار نکل رہے تھے۔ انکل تاتیک نے اپنے ایک ملازم کو گائیڈ کے طور پر ہمارے ساتھ روانہ کر دیا تھا تاکہ ہمیں اہراموں تک پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ اس ملازم کا نام پوتانو تھا۔ اس کی رنگت سفید تھی اور وہ چالیس سال کے لگ بھگ تھا۔ چونکہ فراعین اور اہراموں کی سرزمین کو دیکھنے کے لئے دنیا بھر سے سیاح آتے رہتے تھے اس لئے کسی نے ہمیں اجنبی سمجھ کر غور نہ کیا کیونکہ ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر سے ہر سال ستر لاکھ سیاح مصر کی پراسرار سرزمین کا رخ کرتے ہیں۔

جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر پوتانو بیٹھا تھا جبکہ سائیڈ سیٹ پر میں اور پچھلی سیٹوں پر زرتاشہ اور سارہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ کھانے پینے کا سامان بھی ہمارے پاس وافر مقدار میں موجود تھا تاکہ ہمیں کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔

''پوتانو۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے پوتانو سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہم فرعون اخناتون کے اہرام کی طرف جا رہے ہیں۔ کیا آپ نے فرعون اخناتون کا نام سنا ہے؟'' پوتانو نے جواب دیتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں نے تاریخ کی ایک کتاب میں فرعون اخناتون کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ واحد فرعون تھا جو نیک دل تھا اور اس نے کہا تھا کہ کوئی ایسی عظیم ہستی ہے جو اس کائنات کو چلا رہی ہے۔ ایک لحاظ سے وہ واحدنیت کا قائل ہو چکا تھا اور اس کی نیک دل اور حسین ترین بیوی ملکہ نفریتی ہر نیک کام میں اس کا ساتھ دیتی تھی لیکن اس نیک دل فرعون کو زیادہ دیر حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے داماد توتیخ آمن نے اس کا تخت الٹ دیا تھا اور خود حکومت کی تھی۔'' میں نے کہا تو پوتانو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ تو فرعون اخناتون کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں۔'' پوتانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دراصل مجھے تاریخ سے بھی لگاؤ ہے۔''

''پھر تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جب فرعون اخناتون کے داماد نے اس کا تختہ الٹا تھا تو اس وقت توتیخ آمن کی عمر چوبیس سال تھی اور فرعون توتیخ آمن کو مصری تاریخ میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے دور میں مصر نے بہت ترقی کی تھی اور بے شمار تاریخی عمارتیں اور دیگر تاریخی ورثے فرعون توتیخ آمن کے دور میں ہوئی تھیں۔ جہاں تک فرعون اخناتون اور اس کی بیوی نفریتی کی ہے تو مصری لوگ آج بھی ان کو یاد کرتے ہیں اسی لئے تو بعض مصری ٹکٹوں پر آج بھی ملکہ نفریتی کی تصویر لگی ہوئی ہے۔'' پوتانو نے میری معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا تو میں حیران رہ گیا۔

''میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ قدیم مصر میں جادوگری کو عروج بھی حاصل تھا۔'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ قدیم مصر میں جادوگری کو عروج حاصل تھا اور بڑے بڑے کاہن اور ساحر فرعونوں کے خاص ساتھی ہوتے تھے اور جہاں تک تاریخی مصری دریائے نیل کی بات ہے تو یہ دریا اپنے اندر بے شمار محبت اور نفرت امن اور جنگ کی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ اس عظیم اور قدیم

دریائے نیل پر چند ساحروں نے کالا عمل کر دیا تھا جس کی بنا پر مصر میں ہر سال پانی خشک ہو جاتا تھا اور اسی خوفناک کالے عمل کی بدولت دریائے نیل ایک کنواری دوشیزہ کی کنواری کی بھینٹ مانگتا تھا اور پھر رواں ہوتا تھا لیکن اسلام آنے کے بعد معجزاتی طور پر دنیا کے سب سے بڑے دریا یعنی دریائے نیل پر وہ کالا عمل ختم ہو گیا تھا۔'' پوتانو نے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ زرتاشہ اور سارہ خاموش بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔

''کیا مصر پر خواتین فرعونیہ نے بھی حکومت کی ہے۔'' پوتانو کے خاموش ہونے پر زرتاشہ نے پوچھا۔

''ہاں۔ مصر میں جو تخت پر بیٹھتا تھا اسے فرعون کہتے تھے اور بے شمار مردوں میں چند خواتین بھی فرعونیہ بنی تھیں۔ ویسے تو مصر میں معاشی طور پر خواتین کو معزز مقام حاصل تھا اور وہ اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز تھیں اور جائیداد کی مالک بھی بن سکتی تھیں تاہم مصری خواتین کو بحیثیت حکمران پسند نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی چند خواتین مصر کے تخت پر فرعونیہ بنی تھیں جیسا کہ پہلے خاندان کی میر نیتھ، چھٹے خاندان کی نیتو کریس، بارہویں خاندان کی سوبی خنیفرو، اٹھارویں خاندان کی سب سے طاقت ور فرعونیہ ہتشپ ست جو بیس سال تک فرعونیہ رہی اور اپنے دور میں بے شمار محلات، معبد اور دیگر یادگار آثار بنوائے۔ اس کے علاوہ مصر کی سب سے مقبول اور مشہور مصری حسینہ زمانہ عالم فرعونیہ قلوپطرہ جو بطلیموسی اور آخری سلطنت کی حسین ترین اور عیار ترین فرعونیہ تھی۔'' پوتانو نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو ہم حیران رہ گئے۔

کچھ دیر بعد ہماری جیپ دریائے نیل کے کنارے پہنچ کر آگے بڑھتی رہی اور آدھے گھنٹے بعد ہمیں ایک قدیم ہرم کے آثار نظر آئے جو حیرت انگیز طور پر بہت قدیم ہونے کے باوجود کافی حد تک درست حالت میں تھے۔ اس ہرم کے بس کچھ حصے ہی خستہ تھے۔ پوتانو نے جیپ روک دی اور ہم جیپ سے نیچے اتر کر ہرم کے اندر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اتفاق سے اس وقت یہ قدیم ہرم خالی تھا۔ ہرم کی دیواروں پر ایک معصوم صورت فرعون اور اس کی حسین ترین بیوی کی تصاویر بنی ہوئی تھیں اور حیرت انگیز طور پر زمانے کی گردش ایام گزرنے کے باوجود تصاویر ایسی دلکش اور جاندار تھیں کہ جیسے کچھ لمحہ پہلے بنائے جانے کا گمان ہوتا تھا اور یہی قدیم مصریوں کا فن تھا۔ تصاویر میں بعض جگہ فرعون اخناتون اور اس کی بیوی ملکہ نفرتیتی ایک تخت پر جلوہ افروز تھے۔ ہم ملکہ نفرتیتی کی حسین اور ملکوتی حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

''اپنی اپنی ٹارچیں روشن کر لو۔'' پوتانو نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا تو ہم نے اپنے اپنے بیگوں سے ٹارچیں نکال کر روشن کر لیں اور احتیاط سے ہرم کے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے جہاں نیچے گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا لیکن تیز روشنی والی ٹارچوں کی وجہ سے ماحول روشن ہو رہا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر ہم سب نیچے پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ یہ ایک گول کمرہ تھا اور یہاں بھی ہر طرف دیواروں پر قدیم نقش نگاری کندہ تھی جہاں تصویری طور پر قدیم مصری دیوتاؤں کی تصاویر کندہ تھیں جس میں گیدڑ، خرگوش، گائے، مینڈھا، شکرا، بندر، مگرمچھ اور بیل اور دیگر جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کی تصاویر کندہ تھیں جو کہ ان قدیم مصریوں کے دیوتا تھے۔ ان کے نیچے ان کے دیوتاؤں کے نام کندہ تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قدیم مصری کن کن دیوتاؤں کو مانتے تھے۔

''یہاں تو سوائے قدیم مصری دیوتاؤں کے ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے تیز ٹارچ کی روشنی میں قدیم مصری زبان کو کافی حد تک پڑھتے ہوئے کہا۔ زرتاشہ اور سارہ بھی حیرت اور خوف بھری نظروں سے ان تصویروں کو دیکھ رہی تھیں۔

''ارے وہ دیکھو یہاں ایک دروازہ بھی ہے جو کہ مقفل ہے۔'' اچانک سارہ نے تیز لہجے میں کہا تو ہم سب چونک کر اس بند چوبی دروازے کو دیکھنے لگے جس کی طرف سارہ اشارہ کر رہی تھی۔ قدیم مصریوں کے اس یادگار اور نہ بھولنے والے فن سے ہم سب پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے اور چوبی دروازے کو دیکھ کر ہم حیران ہو گئے کیونکہ یہ دروازہ مکمل طور پر باریک قدیم مصری تحریر اور باریک نقش نگاری سے مرقع تھا۔ سارہ اور زرتاشہ نے پوری کوشش کی کہ اس چوبی دروازے پر لکھی تحریر کو پڑھ سکیں لیکن یہاں دونوں کو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ میں نے چوبی دروازے پر لکھی تحریر پڑھنے کی کوشش کی لیکن مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو ایک زور دار گڑگڑاہٹ کے ساتھ چوبی

دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے اندر جھانکا تو اندر بھی گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ سب سے پہلے پوتانو اندر داخل ہوا اس کے بعد ہم تینوں باری باری اندر داخل ہو گئے۔

''ارے یہاں تو بے شمار راہداریاں اور محراب بنے ہوئے ہیں۔'' میں نے ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہی تو فراعین کا کمال تھا کہ وہ بھول بھلیاں بناتے تھے جس سے گم ہونے کا بھی خدشہ موجود ہوتا ہے۔'' پوتانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر تو ہمیں آگے بڑھنے سے پہلے یہاں کوئی نشان بنانے چاہئیں کیونکہ یہ نہ ہو کہ واپسی پر ایک جیسی راہداریوں اور گزرگاہوں کی بھول بھلیوں میں راستہ بھول کر بھٹک جائیں۔'' زرتاشہ نے تشویش سے کہا۔

''آپ درست کہہ رہی ہیں۔ ہم یہاں سے آگے جانے کے لئے ہر ان دیواروں پر ایک مخصوص نشان لگا دیتے ہیں جن راہداری سے ہم گزریں گے تاکہ واپسی پر بھٹکنے کا اندیشہ نہ رہے۔'' پوتانو نے ہماری طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میرے پاس ایک مارکر ہے اس کے ذریعے گھومتی راہداریوں میں جانے سے قبل ایک گول نشان لگا دیتی ہوں اس طرح واپسی پر بھٹکنے کا اندیشہ نہیں ہو گا۔'' اس بار سارہ نے کہا اور اپنے بیگ میں سے دو مارکر نکال لئے۔ اس نے ایک مارکر زرتاشہ کو دے دیا اور دونوں نے ایک دیوار پر گول بڑا سا مخصوص گول دائرہ بنا دیا اور پھر ہم آگے بڑھنے لگے۔ بے شمار راہداریاں، محرابیں اور واقعی بھول بھلیاں تھیں لیکن سارہ اور زرتاشہ دیواروں پر مخصوص نشان لگاتی جا رہی تھیں۔ جیسے ہی ہم سب ان بے شمار گھومتی راہداریوں اور بھول بھلیوں میں آگے بڑھتے گئے ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے پچھلی راہداریوں میں کوئی اندھیرے میں سائے گزر رہے ہوں جسے دیکھ کر ہمارے خون خشک ہو رہے تھے۔

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی کہ فراعین میں صرف اخناتون ہی ایک نیک دل فرعون تھا اور اس کی شکل بھی معصوم تھی پھر اس نے ایسا ہرم کیوں بنوایا تھا جس میں اتنے سارے قدیم مصری دیوی دیوتاؤں کی تصویریں اس ہرم میں ہمیں نظر آئی ہیں۔'' میں نے پوتانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ اس نیک دل فرعون کو زیادہ عرصہ حکومت کرنے کو نہیں ملا تھا۔ اس کے مرنے کے آنے والے فراعین نے اس کے آثار کو کافی حد تک مٹا دیا تھا اور صرف چند آثار ہی بچے تھے اور ان میں بھی دیگر فراعین نے اپنی مرضی سے فرعون اخناتون کے اہرام میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں کر دی تھیں اور ویسے بھی یہ بھول بھلیاں صرف فراعین کے مقبروں یعنی اہراموں میں ہوتی تھیں تاکہ چور وغیرہ خزانہ چوری نہ کر سکیں اور شاید کسی فرعون نے اس معبد کو اہرام بنانے کی کوشش کی تھی اور یہاں بے شمار بھول بھلیاں اور اپنے قدیم دیوتاؤں کی تصاویر اس بھرپور طریقے سے نقش کر دی تھیں کہ یہی وجہ ہے کہ ان کے زندہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔'' پوتانو نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اچانک زرتاشہ کے حلق سے چیخ نکل گئی تو میں بے اختیار اس کی طرف لپکا

''کیا ہوا زرتاشہ۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''میں اس دیوار میں بنی مگرمچھ کی بڑی اور خوفناک تصویر کے قریب نشان لگا رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے اس خونی نگاہوں کے مگرمچھ نے مجھ پر حملہ کیا ہو۔'' زرتاشہ نے خوف بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔

''اوہ نہیں مس زرتاشہ۔ یہ آپ کا صرف وہم ہے کیونکہ یہ تصویری مگرمچھ کیسے زندہ ہو کر آپ پر حملہ کر سکتا ہے ہاں البتہ قدیم مصریوں نے اس خونی نگاہوں والے مگرمچھ کو بہت جاندار طریقے سے بنایا ہے اس لئے اس کے زندہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔'' پوتانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ واقعی مجھے ایسا لگا ہے جیسے اس خونی مگرمچھ نے مجھ پر حملہ کیا ہو''..... زرتاشہ نے یقین سے کہا اور پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''ابرار۔ واپس چلو مجھے بے حد ڈر لگ رہا ہے''۔

''ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ تو ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''بھائی جان۔ مجھے بھی بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' سارہ نے بھی زرتاشہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''آپ

واپس چلیں۔''

میرا وہاں سے جانے کو دل نہیں کر رہا تھا کیونکہ میں تھوڑا ایڈونچر پسند بھی واقع ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں فرعون اخناتون کے حرم کی ویڈیو فلم بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں تاکہ ہماری یادگار رہے کہ ہم نے فرعون اخناتون کے حرم کی سیر کی تھی لیکن سارہ اور زرتاشہ واپس جانے پر بضد تھیں۔

''اچھا ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ میں تھوڑی سی ویڈیو بنا لوں۔'' میں نے کہا اور اپنی پتلون کی جیب سے سیل فون نکال کر وہاں کی ویڈیو بنانے لگا۔ مجھے ویڈیو بناتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک مجھے سارہ کی آواز سنائی دی۔

''بھائی جان۔ پوتانو غائب ہے۔''

میں نے بے اختیار چونک کر اور مڑ کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ وہاں پوتانو موجود نہیں تھا۔

''کیا مطلب۔ پوتانو کہاں چلا گیا ہے۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''پتہ نہیں۔''

''کیا تم نے اسے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟''

''نہیں۔'' سارہ نے انکار میں سر ہلایا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ پھر میں پوتانو کو آوازیں دینے لگا۔

''پوتانو۔ کہاں ہو تم۔''

پوتانو نے تو کوئی جواب نہ دیا البتہ میری آواز وہاں گونج کر رہ گئی تھی۔

''پوتانو۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟'' میں نے ایک بار پھر پوتانو کو آواز دی لیکن اس بار بھی نتیجہ پہلے جیسا نکلا۔

''ابرار۔ مجھے لگتا ہے اسی مگرمچھ نے پوتانو کو ہڑپ کر لیا ہے۔'' زرتاشہ نے خوف بھرے لہجے میں کہا تو میں اس کی احمقانہ بات پر ہنس پڑا۔

''زرتاشہ۔ تم بھی احمقانہ بات کر رہی ہو۔ یہ اصلی مگرمچھ نہیں اس کی تصویر ہے۔''

''پھر پوتانو اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے؟'' زرتاشہ جھنجلائی۔

''میں دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ باہر چلا گیا ہو۔'' میں نے کہا۔

''اگر وہ باہر جاتا تو ہمیں بتا کر جاتا۔'' سارہ نے کہا۔ ''بغیر بتائے وہ کیسے جا سکتا ہے؟''

سارہ کی بات معقول تھی اس لئے میں بھی الجھ کر رہ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا اچانک ہمیں ایک دلدوز چیخ سنائی دی تو ہم بے اختیار اچھل پڑے۔ خوف کا یہ عالم تھا کہ سارہ اور زرتاشہ یکلخت ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ ایک بار پھر دلدوز چیخ سنائی دی تو میرے جسم میں سنسناہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی کیونکہ یہ چیخ پوتانو کی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو یا اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔

''یہ چیخ تو پوتانو کی ہے۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''مگر پوتانو ہے کہاں؟''

''بھائی جان۔ کیا سوچ رہے ہیں۔ جلدی سے نکل چلیں۔'' سارہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں ٹھٹک گیا۔

''لیکن ہمیں پوتانو کو بچانا ہوگا؟''

''کیسے بچائیں گے۔ ہم تو یہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے۔'' زرتاشہ نے کہا۔

''آؤ دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ٹارچوں کی روشنی میں آگے بڑھنے لگے۔ ابھی ہم نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ہمیں ایک بار پھر پوتانو کی دلدوز چیخ سنائی دی تو ہمارے قدم ایسے رک گئے جیسے زمین نے ہمارے پیر جکڑ لئے ہوں۔ ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ آگے بڑھے اور پوتانو کو تلاش کرنے لگے۔ ہم حرم کی بھول بھلیوں میں الجھ کے رہ گئے تھے۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ پوتانو کدھر موجود ہے۔ پھر تو کئی لمحات گزر گئے تھے لیکن پوتانو کی چیخ سنائی نہ دی تو میں تشویش میں مبتلا ہو گیا اور میرے ذہن میں یہ سوال گردش کرنے لگا کہ کہیں پوتانو کو کسی غیبی طاقت نے ہلاک تو نہیں کر دیا۔

''بھائی جان۔ دیواروں پر دیکھیں۔'' سارہ کی سرسراتی آواز سنائی دی تو میں نے بے اختیار چونک کر ٹارچ کی روشنی دیواروں پر ڈالی اور میرے بھی اوسان خطا ہو گئے کیونکہ دیواروں پر سارہ اور زرتاشہ نے مار کر سے جو نشان لگائے تھے وہ بھی غائب تھے۔

''یہ آخر کیا اسرار ہے۔'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سوچا۔ اب تو میں بھی لرز گیا تھا اور میرے ذہن میں یہی بات آ رہی تھی کہ ہم کسی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔

''دیواروں پر مار کر سے لگے نشان کیسے مٹ سکتے ہیں؟'' سارہ نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہاں بدروحوں کا بسیرا ہے۔''

میں خاموش رہا اور غور سے دیواروں پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''آؤ۔''

ہم ایک بار پھر آگے بڑھے اور راہداری گھوم کر جیسے ہی دوسری طرف پہنچے تو بے اختیار ٹھٹک گئے۔ کیونکہ راہداری میں پوتانو اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ میں دوڑ کر اس کی طرف پہنچا۔ اس کے قریب بیٹھتے ہی میں نے اسے سیدھا لٹایا تو یہ دیکھ کر میں لرز کر رہ گیا کیونکہ اس کے سینے میں دل کے مقام پر ایک خنجر گڑا ہوا تھا اور اس کے جسم سے نکلنے والا خون فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ پوتانو زندہ تھا اور آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

''پوتانو۔ یہ۔ یہ۔'' آواز میرے حلق میں پھنس گئی تھی۔

''نن۔ نن۔ نکل جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔''

''تمہیں کس نے خنجر مارا ہے؟''

''وہ۔ وہ۔ نن۔ نن۔ نکل جاؤ۔'' پوتانو نے رک رک کر بولتے ہوئے کہا پھر اس نے ایک ہچکی لی اور بے حس و حرکت ہوتا چلا گیا۔

''پوتانو۔'' میں نے پوتا کو پکارا مگر پوتانو کی روح پرواز کر گئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی چاروں طرف گھمائی مگر مجھے وہاں ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی ذی روح دکھائی نہ دی۔ سارہ اور زرتاشہ بھی میرے قریب آ گئی تھیں۔

''ابرار۔ پوتانو کو کس نے ہلاک کیا ہے؟'' زرتاشہ نے لرزیدہ لہجے میں پوچھا۔

''پتہ نہیں۔ اس نے بتانے کی کوشش کی تھی لیکن نہیں بتا پایا۔'' میں نے جواباً کہا۔

''چلیں بھائی جان۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' سارہ کی کپکپاتی آواز سنائی دی۔ میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ فرعون کے حرم میں یقیناً کوئی ذی روح یا بدروح موجود تھا جس نے پوتانو کو خنجر مار کر ہلاک کیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہم پر بھی وار کرنے کی کوشش کرے اس لئے اب ہم انتہائی ہوشیاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارے پاس تو ہتھیار بھی نہیں تھے جس سے ہم بدروح کا مقابلہ کر سکتے۔

ہم پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ راہداری کافی طویل تھی اور دیواروں پر لٹکی ہوئی درندوں، جانوروں اور حشرات الارض کی تصویروں کی وجہ سے ہم پر خوف غالب تھا۔ آگے راہداری دائیں بائیں مڑ رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کس راہداری سے مڑ کر ادھر آئے تھے۔ راہداری کے اختتام پر رک کر میں نے ٹارچ کی روشنی دائیں طرف راہداری میں ڈالی تو وہ بھی طویل راہداری تھی۔ پھر میں نے بائیں طرف والی راہداری میں ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دوسرے ہی لمحے میں بے اختیار چونک پڑا چونکہ سارہ اور زرتاشہ راہداری میں ایک منظر کو دیکھ کر گنگنائیں اور انہوں نے اپنے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لئے جس کی وجہ سے ان کے منہ سے نکلنے والی چیخیں دب گئی تھیں۔ ایک دیوار کے قریب چار انسانی ڈھانچے موجود تھے۔ ان ڈھانچوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دو مردوں اور دو خواتین کے ڈھانچے تھے اور ان کو مرے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا اس لئے تو ان کی لاشیں گلنے کے بعد اب صرف ہڈیوں کے ڈھانچوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بیگ بھی پڑے ہوئے تھے جو کہ کافی بوسیدہ اور میلے ہو چکے تھے۔

نجانے یہ کون بدقسمت تھے جو اس حرم کے اندر آئے تھے اور غالباً بھول بھلیوں میں پھنس کر آخر کار موت کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے لباس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی مغربی ٹیم ہی کافی عرصہ پہلے یہاں آ پھنسی تھی۔ ان کو شاید کسی خزانے کی تلاش تھی۔ ان کی موت بھول بھلیوں میں بھٹکنے سے ہوئی ہوگی اور آخر کار راستہ نہ ملنے کی وجہ سے بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر موت کے منہ میں چلے ہوں گے۔ کئی سوالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے۔

''ابرار۔ نکلو یہاں سے ورنہ میں خوف سے بے ہوش ہو جاؤں گی۔'' زرتاشہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''زرتاشہ۔ تم دونوں اپنے حواسوں پر قابو رکھو۔''

''جب اتنے خوفناک منظر دکھائی دیں گے تو ہم کیسے اپنے حواسوں پر قابو رکھ سکتی ہیں۔'' سارہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آؤ۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور دوسری راہداری کی طرف بڑھ گئے۔ یہ راہداری بھی آگے جا کر دائیں بائیں مڑ رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ہم کدھر جائیں۔ ایسی کون سی راہداری تھی جو باہر کی طرف جاتی ہو۔ راہداری کے اختتام پر پہنچ کر ہم پھر رک گئے۔

''اب کس طرف چلیں۔'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا اور پھر دائیں طرف والی راہداری میں داخل ہو گئے۔ ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اچانک ایک قوی ہیکل چمگادڑ راہداری کے کونے سے نکل آیا۔ اس قوی ہیکل چمگادڑ کی آنکھوں سے آگ کے مزارے نکل رہے تھے۔ چمگادڑ نے اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور کریہہ چیخ مار کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ چمگادڑ بہت ہی قوی ہیکل اور خوفناک تھا۔ اس سیاہ اور بھدے چمگادڑ کو دیکھ کر زرتاشہ اور سارہ کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ میں نے ٹارچ کی روشنی راہداری کی دیواروں پر پھینکی لیکن سیاہ چمگادڑ مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ نجانے وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔

ہم ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔

''بھائی جان۔ پاپا کو فون کریں۔ وہ انکل ہرتیک کی مدد سے ہمیں اس ہرم سے نکال لیں گے۔'' سارہ نے کہا۔ اس کی تجویز معقول تھی چنانچہ میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور پاپا کو کال کرنے لگا لیکن بدقسمتی کہ وہاں سگنل نہیں آ رہے تھے اس لئے کال نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے سیل فون آف کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھ دیا۔

''کیا ہوا؟'' زرتاشہ نے پوچھا۔

''سگنل نہیں آ رہے۔''

''اوہ۔''

سارہ اور زرتاشہ نے اپنے اپنے سیل فونوں سے پاپا کو کال کرنے کی کوشش کی مگر ان کے سیل فون پر بھی سگنل نہیں آ رہے تھے۔

''مجھے لگتا ہے ہم بھی یہاں دوسرے مسافروں کی طرح بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔'' زرتاشہ نے کہا۔

''اللہ نہ کرے۔'' سارہ نے فوراً کہا۔ ''بھابی، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔''

''تو کیا کہوں۔'' زرتاشہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''مایوسی کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔'' میں نے کہا۔ ''اللہ ہماری مدد کرے گا اور ہم اس ہرم سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

ابھی ہم تھوڑا آگے ہی گئے ہوں گے کہ ہمیں دبیز قالین لٹکے ہوئے نظر آئے۔ نجانے یہ قالین کپڑے یا کس چیز کے بنے ہوئے تھے جو عرصہ دراز گزرنے کے باوجود اپنی جگہ پر قائم اور صحیح حالت میں تھے۔ میں نے غور سے دیکھتے ہوئے قالین کا پردہ ایک طرف کیا تو یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹنے لگیں کہ دوسری طرف ایک خوبصورت کمرہ تھا جہاں خوبصورت قالین اور مرصع کرسیاں اور ایک بڑی میز موجود تھی جو کہ بہت خوبصورت تھی۔ سارہ اور زرتاشہ بھی کمرہ کی زیبائش دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔

''شاید یہ کمرہ ملکہ نفرتیتی کا تھا۔'' میں نے کہا لیکن میری بات کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں ان کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ میں خود بھی اندر سے گھبرایا ہوا تھا لیکن ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ہمت ہار دی تو زرتاشہ اور سارہ تو ہمت ہارنے میں ایک سیکنڈ بھی دیر نہیں لگائیں گی۔ میں نے پردہ گرایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ راہداری کے اختتام پر پہنچ کر ہم ٹھٹک گئے کیونکہ راہداری کے اختتام پر ایک دروازہ تھا جو کہ بند تھا اور دروازے سے کچھ فاصلے پر فرش پر جگہ جگہ لوہے کی میخیں نکلی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے ان کے آگے جانے کا راستہ بند ہو رہا تھا۔ ہم واپس مڑے اور تیز تیز مگر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ مختلف راہداریوں میں گھومنے پھرنے کے باوجود جب ہمیں ہرم سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو میں بھی مایوس ہونے لگا۔

''جس نے بھی یہ ہرم بنایا ہے انتہائی بے وقوف انسان تھا۔'' زرتاشہ کی جلی کٹی آواز سنائی۔

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے اتنی بھول بھلیاں بنانے کی کیا ضرورت تھی کہ انسان اندر آ کر واپس ہی نہ جا سکے۔''

''اس دور میں ان لوگوں کو سارے راستے معلوم تھے۔''

''کاش ہم یہاں نہ آتے۔'' سارہ نے کہا۔

''سارہ۔ میری بہن، پریشان نہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو ہم جلد ہی اس ہرم سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''مجھے تو آپ بھی مایوس دکھائی دے رہے ہیں۔''

''نہیں۔ میں مایوس نہیں ہوں۔'' میں نے کہہ تو دیا لیکن یہ سچ تھا کہ میں بھی مایوس ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد ہم پھر باہر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ میں چونکہ سب سے آگے تھا اس لئے میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ ہم بھول بھلیوں میں گھومتے ہوئے واپسی اسی راہداری میں آ گئے جہاں پوتانو کی لاش پڑی تھی۔ مگر جیسے ہی میں نے ٹارچ کی روشنی پوتانو کی لاش پر ڈالی تو ایک لرزہ خیز منظر دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ پوتانو کی لاش سے بے شمار سانپ اور بچھو چمٹے ہوئے تھے اور اس کو نوچ رہے ہیں۔ یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر سارہ اور زرتاشہ خوف سے کانپ اٹھیں۔ سانپوں نے پھن اٹھا کر جب ہماری طرف دیکھا تو ان کے منہ سے پھنکاریں نکلنے لگیں۔ ہم تیزی سے پلٹے اور دوڑتے چلے گئے۔

''بھائی جان۔ بھابی۔'' اچانک مجھے سارہ کی آواز سنائی دی تو میں نے رک کر اور پلٹ کر دیکھا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ وہاں زرتاشہ موجود نہیں تھی۔

''زرتاشہ۔ زرتاشہ۔'' میں نے زرتاشہ کو اونچی آواز میں پکارا لیکن زرتاشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سارہ کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

''زرتاشہ کہاں ہو تم۔''

لیکن زرتاشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے دل میں ہولناک خیالات کسمسانے لگے۔ کیونکہ پوتانو بھی اسی طرح غائب ہوا تھا جس طرح زرتاشہ غائب ہوئی تھی۔

''زرتاشہ۔''

میری آواز راہداری میں گونج کر رہ گئی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں سب جگہوں پر دیکھ لیا لیکن مجھے زرتاشہ کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ انجانے خوف سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اپنے ہاتھ پاؤں پھولتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ زرتاشہ میری زندگی کی ہمسفر تھی۔ میں اس کی جدائی ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''زرتاشہ۔ کیا تم میری آواز سن رہی ہو؟'' میں نے ایک بار پھر زرتاشہ کو آواز دی۔

''زرتاشہ۔'' سارہ نے بھی اسے آواز دی۔

میں پاگلوں کی مانند زرتاشہ کو تلاش کرنے لگا۔ میں نے سارہ کا ہاتھ تھام لیا تھا تاکہ وہ ہرم میں کہیں گم نہ ہو جائے۔ مختلف راہداریوں میں گھومتے ہوئے ہم جیسے ہی ایک کمرے میں پہنچے تو وہاں ایک خوفناک منظر ہمارا منتظر تھا۔ کمرے میں چار مشعلیں جل رہی تھیں جن کی روشنی سے کمرہ منور تھا۔ کمرے کے کونے میں زرتاشہ کی آدھی گردن کٹی لاش پڑی تھی اور اس کی گردن سے نکلنے والا خون فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ میں اور سارہ دونوں تیزی سے زرتاشہ کی طرف بڑھے۔ میں نے ٹارچ فرش پر رکھ دی اور زرتاشہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا لیا۔

''زرتاشہ۔ زرتاشہ۔ کس نے تمہارے ساتھ یہ کیا ہے۔'' میں نے زرتاشہ کی جھنجوڑتے ہوئے کہا لیکن زرتاشہ تو مر چکی تھی بھلا وہ مجھے کیا جواب دیتی۔ سارہ کی حالت بھی دیدنی تھی۔ وہ خوف سے یوں لرز رہی تھی جیسے اسے جاڑے کا بخار ہو گیا ہو۔ پھر میں نے زرتاشہ کی لاش فرش پر لٹا دی۔

میرا اپنا حال بھی سارہ سے مختلف نہ تھا۔ میری زندگی کی ساتھی، میری ہمسفر مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں اب اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں اہرام دیکھنے کے شوق میں یہاں آیا تھا۔ کاش ہم نہ آتے لیکن یہ کاش، صرف کاش ہی رہ گیا۔ اچانک مجھے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں تو میں نے بے اختیار چونک کر اور مڑ کر دیکھا تو کمرے کے دروازے پر ایک سیاہ پوش کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیاہ پوش نے سیاہ رنگ کا کپڑا اپنے سر پر اس انداز میں باندھا ہوا تھا جس سے اس کا چہرہ ڈھک گیا تھا اور آنکھیں بھی دکھائی نہ دے رہی تھیں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک خنجر تھا جس پر خون واضح دکھائی دے رہا تھا۔ سارہ خوف سے لرزتی ہوئی میرے عقب میں چھپ

کرا سے دیکھنے لگی۔

''کون ہو تم؟'' میں نے لرزیدہ لہجے میں پوچھا۔

''تم دونوں کی موت۔'' سیاہ پوش نے جواب دیا تو مجھے اپنے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔''

''موت بکواس نہیں ہوتی۔''

''کیا تم نے میری بیوی کو قتل کو کیا ہے؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''میں یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اس ہرم میں آئے۔'' اس نے کہا۔

''کیوں۔ کیا یہ ہرم تمہاری ملکیت ہے۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں تم دونوں کو مارنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھو۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''مجھے کون روک سکتا ہے۔'' اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ اس کی بات سن کر میں سمجھ گیا تھا کہ پوتا نو کو بھی اس نے خنجر مار کر ہلاک کیا ہے۔

''ب۔ ب۔ بھائی۔'' سارہ کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''ڈرو نہیں۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' میں نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ اور زیادہ مضبوطی سے تھام لیا۔ میری نظریں سیاہ پوش پر جمی ہوئی تھیں۔ سیاہ پوش آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہرم میں ہمارے ساتھ اس طرح کے حالات پیش آنے تھے تو میں اپنے ساتھ کوئی ہتھیار ضرور لے کر آتا۔ جوں جوں سیاہ پوش ہماری طرف بڑھ رہا تھا ہم دونوں بہن بھائی الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہے تھے اور پھر ہم دیوار سے جا لگے۔

''تم دونوں میرے ہاتھوں مرنے سے نہیں بچ سکتے۔'' سیاہ پوش نے کہا لیکن میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دائیں طرف دیوار کی طرف دیکھا تو وہاں ایک فٹ کے فاصلے پر مشعل موجود تھی۔ میں نے لپک کر مشعل اتار لی اور اسے سیاہ پوش کے سامنے کر کے لہراتے ہوئے اسے ڈرانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہٹ جاؤ ہمارے راستے سے ورنہ۔''

''ورنہ کیا۔''

''میں تمہیں اس مشعل سے جلا دوں گا۔''

میری بات سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

''کوشش کر کے دیکھ لو۔''

یہ کہتے ہی سیاہ پوش نے خنجر سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں چونکہ اس کی طرف سے ہوشیار تھا اس لئے میں نے مشعل گھماتے ہوئے سیاہ پوش کے خنجر والے ہاتھ پر مار دی۔ مشعل سیاہ پوش کے خنجر والے ہاتھ پر تو نہ لگی البتہ وہ چند قدم پیچھے ضرور ہٹ گیا۔

''سارہ۔ تم دروازے کی طرف بڑھو۔ میں اسے دیکھتا ہوں۔'' میں نے سارہ سے مخاطب ہو کر کہا تو سارہ لرزتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ سیاہ پوش نے سارہ کو خنجر مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے مشعل آگے کر دی جس کی وجہ سے سیاہ پوش یکدم پیچھے ہٹ گیا۔

''جلدی کرو سارہ۔''

میں نے کہا۔ اسی لمحے سیاہ پوش نے چیخ مارتے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے اس کے حملے سے بچنے کی حتی الوسع کوشش کی لیکن سیاہ پوش کا وار کامیاب ہو گیا۔ اس کا خنجر میرے دائیں بازو پر لگا تھا جس کی وجہ سے میرے حلق سے دردناک چیخ نکل گئی اور میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ سیاہ پوش دوبارہ مجھ پر حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے مشعل گھما کر اس کے ہاتھ پر مار دی۔ مشعل لگتے ہی سیاہ پوش کے ہاتھ سے خنجر نکل کر دور جا گرا۔ وہ خنجر اٹھانے کے لئے پلٹا ہی تھا کہ میں نے اسے زور سے دھکا دے دیا۔ سیاہ پوش اچھل کر سینے کے بل فرش پر گر گیا۔ میں نے سارہ کی طرف دیکھا تو وہ دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ سیاہ پوش اٹھ کر اور خنجر اٹھا کر ہماری طرف آتا میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر جلتی ہوئی مشعل سیاہ پوش کے لباس سے لگا دی۔ اس نے میری بیوی کو قتل کیا تھا پھر بھلا میں اسے کیسے زندہ چھوڑ سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے مشعل اس کے لباس سے لگائی تو اس کے لباس نے آگ پکڑ لی اور اس کا لباس سوکھی لکڑی کی

طرح جلنے لگا۔ سیاہ پوش فرش پر کروٹیں بدل بدل کر آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے حلق سے دل دہلا دینے والی چیخیں نکل رہی تھیں۔ نجانے میرے اندر کیسا یارہ بھر گیا تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر سیاہ پوش کا خنجر اٹھایا اور دوڑتے ہوئے سیاہ پوش کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ سیاہ پوش کے حلق سے نکلنے والی چیخوں سے کمرہ تو کمرہ باہر راہداری بھی گونج اٹھی تھی۔ میں نے اس کے پیٹ سے خنجر نکال کر دوبارہ اس کے سینے میں دل کے مقابل پر گھونپ دیا۔ اس بار سیاہ پوش کے حلق سے نکلنے والی چیخوں سے مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ پھر میں نے سیاہ پوش کو دھکا دیا تو وہ اچھل کر پشت کے بل فرش پر گرا اور بری طرح سے تڑپنے لگا۔ میں نے اپنی ٹارچ اٹھا کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈالی اور زرتاشہ کی لاش اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

''سارہ۔ دروازے کو کنڈی لگا دو۔''

سارہ نے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ دروازہ بند ہوتے ہی سیاہ پوش کی چیخیں بھی معدوم ہو گئیں۔ میں نے زرتاشہ کی لاش اپنے کاندھے پر ڈالی اور ہم ایک بار پھر بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے ہرم سے باہر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعا کرتے ہوئے مدد مانگ رہا تھا کہ وہ ہمیں بحفاظت اس ہرم سے باہر نکال دے۔ شاید وہ وقت قبولیت کا تھا۔ اللہ نے میری فریاد سن لی تھی۔ مختلف راہداریوں سے گھومتے ہوئے ہم اس راہداری میں آ گئے جدھر سے ہم ہرم میں داخل ہوئے تھے۔ دروازہ بند تھا البتہ دروازے میں موجود ایک درز سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔

''اللہ۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا اور ہم بہن بھائی دروازہ کھول کر ہرم سے باہر نکل آئے۔ میں شدت غم سے نڈھال ہو چکا تھا۔ مجھے سارہ نے سہارا دیا ہوا تھا اور ہم لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے ہوئے بالآخر اپنی جیپ تک پہنچ گئے۔ میں نے زرتاشہ کی لاش جیپ کی پچھلی سیٹ پر لٹائی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ سارہ سائیڈ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ خوف کے تاثرات ابھی تک سارہ کے چہرے سے ہویدا تھے۔

''بھائی جان۔ مجھے بھابی کی موت کا بے حد دکھ ہے۔'' سارہ نے میری طرف دیکھ کر کہا تو میں نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔'' میں نے دھیرے سے کہا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ جب ہم انکل تاتیک کی رہائش گاہ پر پہنچے تو پاپا، مما اور انکل تاتیک ہمیں اجڑے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پاپا اور امی زرتاشہ کو وہاں نہ پا کر پریشان ہو گئے۔

''ابرار۔ یہ تم دونوں نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔'' پاپا نے پوچھا۔

''زرتاشہ کہاں ہے؟'' اس بار امی نے پوچھا۔

''اس نے زرتاشہ کو قتل کر دیا ہے۔'' میں نے بمشکل کہا تو وہ سب حیران رہ گئے۔ امی کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ اگر سارہ آگے بڑھ کر انہیں سہارا نہ دیتی تو امی فرش بوس ہو جاتیں۔

''یہ۔ یہ۔ کیا کہہ رہے ہو۔'' پاپا ہکلائے۔ ''کس نے زرتاشہ کو قتل کیا ہے؟''

میں نے ہرم میں جانے اور وہاں پیش آنے والے واقعات و حالات بتا دیئے تو امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ زرتاشہ کو ایک بہو کی نظر سے نہیں بلکہ اپنی بیٹی کی نظر سے دیکھتی تھیں اس لئے ان سے یہ غم برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ انکل تاتیک بھی پوتا نو کی موت پر افسردہ تھے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔

اگلے روز کی فلائٹ سے ہم واپس پاکستان آ گئے۔ پاپا نے انکل برہان کو بھی اطلاع کر دی تھی اور وہ بھی پہلی فرصت میں فیملی سمیت پاکستان آ گئے تھے۔ زرتاشہ کی تجہیز و تدفین کر دی گئی تھی۔

آج خونیں ہرم میں گزرے اُس واقعہ کو پانچ سال ہو گئے ہیں مگر زرتاشہ کی یاد آج بھی میرے دل میں موجود ہے۔ گو کہ امی اور پاپا نے بار بار اصرار کر کے مجھے دوسری شادی کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا تھا کیونکہ میں زرتاشہ کی جگہ کسی اور کو نہیں دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

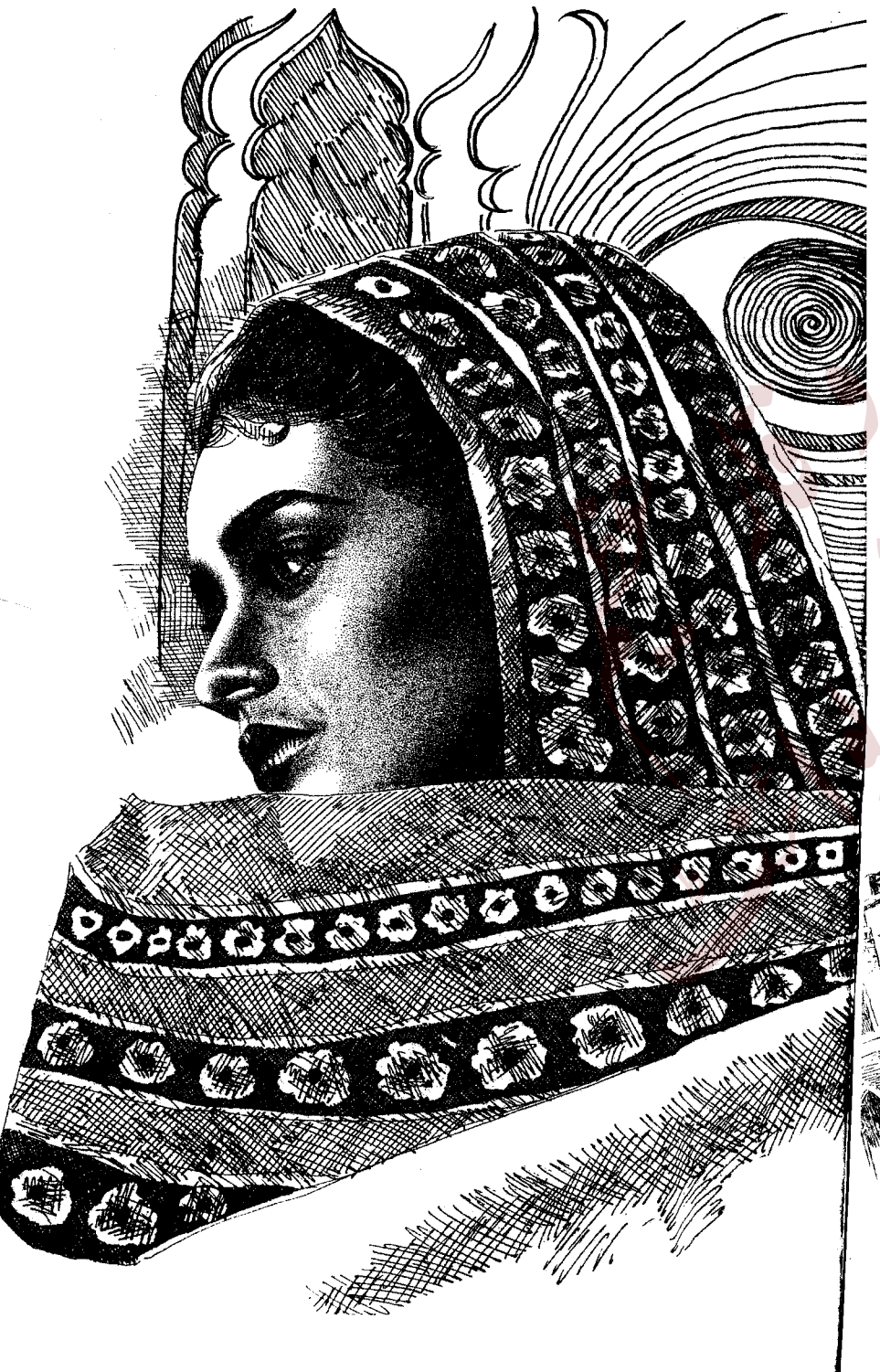

ناول

کاوش صدیقی

خانقاہ

قسط نمبر:03

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مرد درویش کی داستانِ عجب

تصوف اور محبت کی پراسرار دنیا کی کہانی

ہوا دار کمرہ تھا۔ جس میں بید کا سادہ سا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ درمیان میں دیوار کے ساتھ بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا جس پر سلیقے سے بستر بچھا ہوا تھا۔ اور سفید گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے عین درمیان میں ایک

خوبصورت قالین پڑا ہوا تھا۔ جس کے وسط میں ایک شیشے کی میز رکھی تھی اور اس کے اردگرد دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ایک خوبصورت دل آویز سادگی آمیز تقدس تھا۔ مجھے اندر لانے والے نے دھیمے سے کہا۔ ''تنزیل میاں آپ یہاں تشریف رکھئے۔ قادری سرکار ابھی تشریف لاتے ہیں۔'' وہ کہہ کر اندر کھلنے والے دروازے کے عقب میں غائب ہوگیا۔

میں تھوڑی دیر کھڑا رہا پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ آج پہلی بار مجھے انہوں نے بلایا تھا۔ جبکہ میں ان سے پہلے کبھی مخاطب نہیں ہوا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ مجھے جنم جنم سے جانتے ہیں۔

اچانک کمرے میں ایک مسحور کن خوشبو پھیل گئی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا یہ خوشبو بہت منفرد، بہت دلآویز تھی۔ اس خوشبو کا تعلق صرف قادری سرکار اور اس خانقاہ سے ہی تھا۔ یہ خوشبو سب میں نمایاں اور منفرد مہک لئے ہوئے تھی۔

''السلام علیکم!'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

وہ حسب معمول سفید شلوار کرتے میں تھے سر پر خوبصورت سا سادہ عمامہ اور مسحور کن دلفریب مسکراہٹ لئے قادری سرکار میرے سامنے تھے

وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ میری نگاہیں ان کے پیروں پر جمی تھیں۔ میرے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ کتنا عجیب معاملہ تھا کہ میں ان سے بھاگتا تھا، دور جانا چاہتا تھا۔ اس خانقاہ اور خود ان کے حوالے سے، میرے دل میں کوئی خاص جذبہ نہیں تھا۔ مگر آج ان کے بلاوے پر ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈر، خوف، آس امید، الجھن، بے چینی، عقیدت اور بے بسی کے متضاد جذبوں نے مجھے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اس سے ان کے حوالے سے مجھ پر گزری تمام قلبی واردا تیں، معاملات، جن کی میرے پاس کوئی تفہیم نہیں تھی۔ سب محض کچھ دیر میں میرے سامنے روشن ہوگئیں۔

''وعلیکم اسلام ورحمتہ وبرکاتہٗ۔'' ان کی نرم میٹھی آواز نے میری بے خودی کی کیفیت کو، شعور کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پتا نہیں کیا ہوا، میں نے جھک کر بڑی عقیدت سے ان کے ہاتھ کو تھام لیا، اور ہونٹوں سے چوم کر بوسہ دیا ان کے ہاتھوں سے بڑی نرمی، مگر گرمجوش ہی حرارت کا احساس ہوتا تھا۔

''بیٹھو۔!'' انہوں نے اشارہ کیا۔

میں نے آہستگی سے سر ہلایا۔ اور کرسی کی جانب رخ کیا مگر ان کے بیٹھنے کا منتظر رہا۔ جب وہ بیٹھ گئے تو میں بھی کرسی پر ٹک گیا۔

چند ہی لمحوں میں ایک خادم نے چائے لاکر رکھ دی۔ میں مودب بیٹھا رہا۔ انہوں نے چائے کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے کپ اٹھا لیا۔ انہوں نے مجھے بغور دیکھا اور سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا۔ ''تنزیل میاں آپ حیران ہو رہے ہونگے کہ ہم نے آپ کو کیوں بلایا ہے۔؟''

اُن کا پہلا ہی جملہ ان گنت سوالوں کے جواب کا دیباچہ بن رہا تھا۔ جن پر میرے تجسس کی کتاب لکھی تھی۔ لیکن ان کے احترام نے مجھے سوالات سے باز رکھا۔ میں صرف ان کی طرف دیکھتا ہی رہا۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ ''بعض حادثے زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔ صبح وشام، دن ورات کا، سُود وزیاں کا مفہوم بدل دیتے ہیں۔ اندھیروں کو اُجال دیتے ہیں اور خوف کو مار دیتے ہیں۔ جب انسان اپنے اندر کے خوف کو مار دیتا ہے تو پھر ترک کی منزل بہت آسان ہو جاتی ہے۔'' ان کی

گہری، مدھر آواز میں ایک عجیب سا سحر تھا۔

''بہت سے لوگ پوچھتے ہیں، جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ صبر کیا ہے۔؟ ان کے نزدیک مصیبت پیش آنے پر خاموش رہنا، واویلا نہ کرنا صبر ہے۔ جبکہ صبر اس سے بلند ہے۔ صبر ترک خواہش کا نام ہے۔ تمام جاہ و جلال، مال ومنال، حیثیت کے چھین جانے کے باوجود اس کے دوبارہ حصول کی خواہش پیدا نہ ہونا، ضائع ہونے پر ملال کے احساس سے پاک رہنا ترک ہے۔ اور اسی ترک کا نام صبر ہے۔ اور یہ بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔!''

''جی۔۔!'' مجھے پسینے آرہے تھے۔ ان کے ہر لفظ میں میرا جلتا ہوا، زہر گزیدہ، دم گھوٹنے والا ماضی تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ مجھے پیاز کی طرح پرت در پرت کھولتے جا رہے ہیں۔

''کبھی کبھی ہم اس پر حیران ہوتے ہیں کہ دوسرا ہمارے متعلق کیسے جان لیتا ہے۔!'' وہ مسکرائے اور مجھے غور سے دیکھا۔

مجھے عریانیت کا احساس ہونے لگا۔

''جذبے شرمندہ ہونے کے لئے نہیں ہوتے۔'' انہوں نے کہا۔ ''جب لوگ دین سے ناآشنا ہوتے ہیں تو انہیں پیر مافوق الفطرت شخصیت نظر آنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ رسول متین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور ایک جگہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مقدس ہے کہ مومن مومن کے لئے آئینہ ہے۔ تو پھر جب ایک مسلمان منفی جذبوں کو ترک کر کے ایمان اور سنت کے اوپر اپنی زندگی استوار کر لیتا ہے۔ تو پھر اس کا قلب مصفا ہو جاتا ہے اور روح قدسی صفات سے ہم آہنگ ہونے لگتی ہے۔ پھر دل اور جذبے ایک دوسرے پر روشن ہو جاتے ہیں۔'' وہ خاموش ہوگئے۔ کتنی سادگی سے انہوں نے میرے تمام سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔

انہوں نے چائے کا کپ اٹھالیا اور ہونٹوں سے لگایا۔ ایک ننھا سا گھونٹ بھرا۔ میں نے بھی ان کی اتباع کی۔

الائچی دار چائے کے خوشگوار ذائقے نے میری طبیعت میں ایک عجیب سی بشاشت بھر دی۔ ان چند منٹوں میں مجھے یوں لگا کہ جیسے ہم ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہیں۔ یہ اللہ والے اتنے مثبت ہوتے ہیں کہ طویل مسافرت۔ اجنبی فاصلوں کو لمحے بھر میں منفی کر دیں۔

''ہم اپنی ایک امانت آپ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''جی۔۔ای۔۔ای۔۔ی!'' میرے اوپر حیرتوں نے گھیرا کر لیا۔ ''کیا میں اس قابل ہوں۔۔!'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''بار امانت اہل کو ہی منتقل کیا جاتا ہے۔ تنزیل میاں۔۔!'' انہوں نے کہا۔

میں چپ ہی رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں، کیا کہوں۔ سوائے اس کے کہ میں ان کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کئے جا رہا تھا۔

''کانچ ٹوٹ جائے تو اس کو سنبھالنا بہت کاریگری کا کام ہے۔ انگلیاں فگار ہو جاتی ہیں۔ کرچی کرچی کانچ چنتے ہوئے پلکیں خون آلود ہو جاتی ہیں۔ تب کہیں کسی کی بخیہ گری ہوتی ہے۔ بہت دھیمے دھیمے۔۔!'' وہ خاموش ہوگئے!

فضا میں جیسے سکوت چھا گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور ہاتھ پیروں میں عجیب سے سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ میرے ذمے کونسی ایسی امانت کرنے والے ہیں کہ جس کے لئے اتنی لمبی تمہید باندھی گئی۔ اور پھر ایسے کیا معاملات ہوئے ہیں کہ وہ امانت میرے پاس زیادہ

محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہاں نہیں۔؟

''تو پھر آپ تیار ہیں۔۔!'' انہوں نے پوچھا۔

''جی بالکل۔۔!'' مجھے اپنی آواز کی مستعدی اور مضبوطی پر خاصا تعجب ہوا۔

کیا میرے اندر کوئی اور بولتا تھا؟ کیا میں اندر سے تقسیم ہو چکا ہوں۔ کیا میرے لئے کوئی نیا طلسم تیار ہو رہا ہے۔ زندگی ہر پل نئے معنی، نیا جہاں کھوجتی ہے۔ سرسری تم جہاں سے گزرے۔ وگرنہ ہر جاء جہان دیگر تھا۔ کیا ہم اپنے اپنے جہان پہچانتے بھی ہیں؟ یا یونہی بنا ادراک کئے اپنے جہان سے بے خبر ہی گزر جاتے ہیں۔

انہوں نے ایک گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ ان کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے سارے سوال، سارے خیال، ان کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔

''آپ نہ پریشان ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر فرمائیں گے۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔ پھر اپنے خادم کو آواز دی۔ اور لحہ بھر میں ہی وہ خادم اندر آموجود ہوا۔ اور مودب کھڑا ہو گیا۔

''جائیں لے کر آئیں انہیں۔۔!'' قادری سرکار نے خادم کو حکم دیا۔ اس نے سر جھکایا۔ اور اندر دروازے کی طرف غائب ہو گیا۔

میں خاموش ہی کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد خادم خاص ایک برقعہ پوش خاتون کے ہمراہ اندرونی دروازے سے نمودار ہوا۔

''نرگس بیٹا۔! آپ تنزیل میاں کے ساتھ جائیں۔۔!'' قادری سرکار نے کہا۔ اور میری طرف مخاطب ہوئے ''یہ ہماری بیٹی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ آپ وعدے کے پاس دار ہیں!''

''جی۔!'' میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ میں کیا کہوں؟ کیا بولوں؟ گھر جا کر اماں سے کیا کہونگا؟ ان کی کو کیا بتاؤں گا؟''

''پریشان نہیں ہوتے۔۔!'' وہ خیالات کو پڑھنے میں ملکہ رکھتے تھے۔ ''نیکی اور اچھائی آپ اپنا جواز ہوتی ہیں۔ ان کو منوانے کے لئے بلاوجہ تاویل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔!''

''جی۔۔!'' اس بار بھی میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

''جایئے۔۔! اللہ بیلی۔۔!'' انہوں نے کہا۔

ہم تینوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ خادم ہمیں خانقاہ کے بیرونی دروازے پر چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ میں چند لمحے خانقاہ کے دروازے پر کھڑا سوچتا رہا۔ کیا سوچتا رہا۔ میں بھی نہیں جانتا۔ کبھی کبھی ہمارا اپنا کاسۂ سر بھی غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک بوجھ کی مانند جس کے خالی گنبد میں بے معنی، بے خیال سوچیں، آوارہ روح کی مانند چکراتی رہتی ہیں۔

اچانک نزدیک ہی کوئی کھانسا۔ میں چونکا، وہ برقعہ پوش میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ سیاہ باریک نقاب کے پیچھے سے اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ شائد وہ میری کیفیت سے باخبر تھی کہ میں بے بس، بے خبر ہو رہا ہوں۔ میں نے زور سے سر جھٹکا۔ اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا، وہ میرے پیچھے پیچھے تھی۔ میں نے کک لگا کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اس کو اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بلا تامل میرے پیچھے میری پشت تھام کر بیٹھ گئی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہزاروں اندیشوں، اور ہزاروں خوف کے ساتھ، جب راستہ طے نہ کرنا چاہیں تو پھر راستہ کتنی جلدی سمٹ جاتا ہے۔ آج مجھے پہلی بار ادراک ہوا۔ جب جیسے لمحوں میں گھر آ گیا۔ میں نے سائڈ پر بائیک کھڑی کی اور نرگس کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا۔

اماں نماز عشاء کے بعد برآمدے میں بیٹھی حسب معمول اپنا وظیفہ کر رہی تھیں۔ وہیں موی بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ کتاب رکھ کر تیزی سے اٹھی۔ ''بھائی آپ آ گئے ہیں۔'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ میرے عقب میں برقعہ پوش نرگس پر نظر جمائے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اماں نے اس کی آواز پر سر گھما کر مجھے دیکھا، اور وظیفہ ختم کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ وہ تھوڑی دیر دعا مانگتی رہیں۔ ہم تینوں ایک ساکت منظر کی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ دعا مانگ کر انہوں نے حسب معمول ہماری طرف دم کیا اور موی سے بولیں۔ ''جاؤ کھانا لگاؤ۔!''

''آؤ تم لوگ ادھر آؤ!'' انہوں نے جاء نماز سے اٹھتے ہوئے کہا اور تخت پر جا بیٹھیں۔

ہم دونوں تخت کی طرف بڑھ گئے۔

''اماں۔۔!'' میں نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ ''انہیں قادری سرکار نے بھیجا ہے۔!'' میں نے نرگس کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا۔۔!'' اماں نے گہری سانس لی۔ اور نرگس کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ''بیٹا اطمینان سے برقعہ اُتارو یہ تمہارا ہی گھر ہے۔'' اماں کے نرم و ملائم الفاظ میری سماعت میں دھماکہ بن کر گونجے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔۔؟'' قادری سرکار کیسا اسم ہیں۔ کیسا طلسم ہیں، کہ ہر کوئی ان کا اسیر ہو جاتا ہے۔؟ مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا وجود بگولوں کی زد میں ہے۔ اور میں اس میں تنکے کی طرح اڑا جا رہا ہوں۔

''آپ آئیں میرے ساتھ۔!'' موی نے آگے بڑھ کر نرگس کا ہاتھ تھام لیا اور اندر لے گئی۔

برآمدے میں صرف میں اور اماں رہ گئے۔

''اماں۔۔!'' میں نے کہنے کی کوشش کی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس ساری صورت حال کی وضاحت کس طرح کروں۔

''تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔۔!'' انہوں نے جیسے میری تمام مشکلیں آسان کر دیں۔ ''جو کچھ زندگی میں پیش آنا ہوتا ہے اس کو ظہور پذیر ہونا ہوتا ہے!'' ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''میں سمجھا نہیں اماں!'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ ''کیا ظہور پذیر ہونے والا ہے۔؟''

''کچھ نہیں۔!'' انہوں نے جیسے ٹالتے ہوئے کہا۔ ''تم تھک گئے ہو گے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لو۔!'' اور پھر سے تسبیح میں مصروف ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ اماں اب مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی ہیں۔ میں چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر اندر چلا گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے کپڑے نکالے اور نہانے گھس گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جب میں فریش ہو کر باہر آیا تو موی میرے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی میری منتظر تھی۔ اس کے ایک ایک روئیں سے تجسس چھلکا پڑ رہا تھا۔

''یہ نرگس کون ہیں۔ سچ کتنی سادہ، کتنی خوبصورت ہیں۔ کتنا کم بولتی ہیں۔ گاؤں کی ہیں۔ انہوں نے بی اے کیا ہے۔ یہاں کیسے آئی ہیں۔ آپ ان کو کیسے جانتے ہیں۔ اماں کو کیا پہلے سے ہی سب پتا تھا۔؟'' موی کے ایک ہی سانس میں سوالات کا اژدھام تھا۔

''صبر۔۔۔صبر۔۔۔!'' مجھے اس کے انداز پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ''اتنے سارے سوالات تو مجھ سے اماں نے بھی نہیں کئے۔!''

''خیر اماں کے تو آپ لاڈلے ہیں۔!'' وہ منہ بنا کر بولی۔ ''مگر مجھے یہ ساری رپورٹ چاہیے ابھی اور اسی وقت۔!'' اس کے انداز میں بے حد لاڈ تھا۔ وہ ناز، وہ نخرہ جہاں، اپنائیت کی حدیں

دل کے تعلق سے جڑ جاتی ہیں۔

''کیا ہم صبح باتیں نہ کریں۔'' میں نے صلاح دی، مجھے سوچنے کا موقع چاہیے تھا۔ مجھے نرگس کے حدود اربعے کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ بلکہ شائد گھنٹہ پھر پہلے وہ کسی بھی حوالے سے میرے لئے نامعلوم تھی۔ بالکل الجبرے کے ایکس کی طرح جسے معلوم کرنا لازمی ہوتا ہے۔

☆☆☆

''ٹھیک ہے پھر جلدی سے آجایئے کھانا لگا دیا ہے۔ بس آپ ہی کا انتظار ہے!'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں کھانے کے لئے اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور ٹی وی لاؤنج میں پہنچ گیا۔ جہاں ہم سب کھانا کھاتے تھے۔ اماں بھی آچکی تھیں مومی اور نرگس آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ اور اماں خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔

''چلیں سبھی کھانا شروع کریں بھائی بھی آگئے۔!'' مومی مجھ پر نظر پڑتے ہی بولی اور سالن کے لئے پلیٹ نرگس کے آگے رکھی۔

میں خاموشی سے اماں کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھا۔ اماں نے سب سے پہلے کھانا نکالا اور پلیٹ میری طرف سرکائی۔ ہمیشہ سے ہی اماں کا دستور تھا کہ وہ پہلے کھانا ہمارے لئے نکالتی تھیں۔ پھر سب سے آخر میں اپنی پلیٹ میں، سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ بہت اچھا لگتا تھا۔ یوں جیسے ہم چھوٹے چھوٹے بچے ماں کے اردگرد گھیرا لگائے بیٹھے ہوں۔

کھانے کے دوران صرف مومی باتیں کرتی رہی۔ نرگس ہوں ہاں کرتی رہی، اس نے بہت تھوڑا کھایا۔ شائد یہ اجنبی ماحول کا اثر تھا۔ اجنبیت آہستہ آہستہ ہی ختم ہوتی ہے۔

کھانا ختم ہوگیا، مومی برتن اٹھانے لگی۔ نرگس بھی اس کے ساتھ اٹھ گئی اور اس کی مدد کرنے لگی۔ حالانکہ مومی اسے منع کرتی رہی مگر وہ نہ مانی اماں اور میں اس دوران خاموش ہی رہے۔

اماں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے گھر میں کوئی تبدیلی آئی ہی نہ ہو۔ اماں نے صرف یہ سن کر کہ نرگس کو قادری سرکار نے بھیجا ہے ایک لفظ نہ کہا، نہ سنا۔ یوں جیسے سب کچھ پہلے سے ہی ان کے علم میں ہو۔ مجھے ایک گھبراہٹ آمیز تجسس ہونے لگا۔ کیا معاملہ ہے؟ کیا اسرار ہے؟۔ اماں کے معاملات میں ہم کبھی کچھ پوچھنے یا بولنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں باپ بن کر پالا تھا۔ انتہائی سخت گیر۔ مگر بے حد محبت سے بھرپور۔ ہمیں اپنے معاملات میں ہمیشہ ان سے راہ نمائی ملتی رہی اور وہ بڑے سہج سے ہمیں معاملاتِ زندگی کا شعور دیتی رہیں۔

میں اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم اماں کے کمرے میں اکھٹا ہوجاتے تھے۔ اور اکھٹے چائے پیتے تھے۔ دن بھر کی سرگرمیاں، خاندانی معاملات۔ سوال جواب سب اسی وقت ہوتے تھے۔ مگر آج پہلی بار مجھے اماں کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا۔ میں اماں کے کمرے میں پہنچا تو وہاں چائے کے صرف دو کپ ہی موجود تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ مومی آج وہاں نہیں آئے گی۔ اماں اپنے بیڈ پر نیم دراز تھیں میں اماں کے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔

اماں نے مجھے دیکھا اور مسکرائیں۔ ''کیا بات ہے تم پریشان لگ رہے ہو۔؟''

''اماں۔۔!'' میں نے انہیں چائے کا کپ اٹھا کر تھماتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ ساری صورت حال میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ آپ نے نرگس کے متعلق ایک لفظ نہیں پوچھا۔ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟۔ بس

میں نے بتایا۔ انہیں قادری سرکار نے بھیجا ہے اور آپ نے بس!'' میں چپ ہوگیا۔ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ مجھے آگے کیا کہنا چاہیے۔

''اچھا۔۔!'' اماں نے چائے کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور مجھے دیکھ کر بولیں۔ ''تو پھر بتاؤ نرگس کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔؟''

''مجھے۔۔۔ مجھے کیا پتا؟'' میں سچ مچ گڑبڑا گیا۔

''جب تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں تو پھر میں تم سے کیا پوچھوں۔؟'' اماں نے سوال کیا۔

''لیکن۔۔۔!''

''لیکن کیا۔۔؟'' انہوں نے نہایت سکون سے سوال کیا۔ ''یہ سارے سوال جواب تو تمہیں وہاں کرنے چاہیے تھے کہ جہاں سے تم اسے لائے ہو۔!''

''وہ تو بس پتا ہی نہیں کیا ہوا۔ قادری سرکار نے مجھے بلایا اور کہا کہ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں تو کچھ بھی بول نہ پایا۔''

''بیٹا جی پہلی بات تو یہ ہے کہ جو سوال بروقت نہ کئے جائیں وہ اپنی افادیت تو چاہے نہ کھوئیں مگر فرد کی اہلیت پر ضرور سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص ہم سے کہہ رہا ہے اس کی ہمارے نزدیک اہمیت کیا ہے۔ ماننے کا معاملہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔!'' اماں نے دھیمے سے کہا۔

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ واقعی ہر بات تو سچ تھی۔

''نرگس قادری سرکار کے مرید کی بیٹی ہے۔ گریجویشن کیا ہے۔ گاؤں میں اس کے لئے کچھ مسائل کھڑے ہوگئے تھے۔ اس لئے قادری سرکار اسے چند دن قبل اپنے پاس لے آئے۔ بن ماں کی بچی ہے اب ہمارے پاس رہے گی۔!''

''جی اچھا۔۔۔!'' میری حیرت کو انہوں نے بھانپ لیا۔

''قادری سرکار نے مجھے فون کیا تھا اور بچی کو رکھنے کے متعلق کہا تھا۔ میں نے حامی بھر لی!'' ماں نے بتایا۔

''قادری سرکار نے آپ کو فون کیا تھا۔؟'' میری حیرت دیدنی تھی۔

''ہاں برسوں پہلے تمہارے والد کے انتقال پر وہ آئے تھے۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیا وہ ابا کے دوست تھے۔!'' میں نے پوچھا۔ آج پہلی بار قادری سرکار کے متعلق مجھے کچھ معلوم ہو رہا تھا۔

اماں نے ایک گہری سانس لی اور کہنا شروع کیا کہ اچانک مومی کی چیخ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی لائٹ چلی گئی۔

میں بجلی کی سی تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ مگر باہر اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید پورے علاقے کی لائٹ جا چکی تھی۔

☆☆☆

شاہ ہارون گیلانی سخت غصے میں تھے۔ صورت حال جس تیزی سے تبدیل ہوئی تھی۔ اس کا انہیں قطعاً اندازہ نہیں تھا۔ حویلی پہنچ کر انہوں نے ریاضے کمدار کو طلب کیا اور اس کے ذریعے اپنے تمام لوگوں کو بلوایا۔

ریاضے کمدار نے انہیں آج بہت عرصے کے بعد اس جاہ وجلال کے عالم میں دیکھا تھا۔ اور جب یہ عالم آتا تھا۔ تو سارے ہی یہ بات جانتے تھے کہ اب ضرور کوئی ایسی آندھی چلنے والی ہے جس کے بعد کئی رونے

والے اپنے پیاروں کی یاد میں ہمیشہ کے لئے روتے رہیں گے۔

وہ سب بہت مودّب، بہت محتاط، بہت سہمے ہوئے تھے۔ شاہ ہارون گیلانی صوفے پر کبھی بیٹھتے تھے، کبھی اٹھتے تھے، اتنے میں ان کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے موبائل آن کیا۔ اور دوسری طرف کی بات سننے لگے۔ پھر انہوں نے سوئچ آف کر دیا۔

''یہ ملک ریاض ہمارے علاقے میں کیا کر رہا ہے۔؟'' انہوں نے درشت انداز میں اُن سے سوال کیا۔

''ملک ریاض۔؟'' ریاضے کمدار نے حیرت سے کہا۔ ''شاہ جی وہ تو شہری بندہ ہے۔ دو تین بار ادھر ایک جلسے میں آیا تھا۔ اس نے ادھر کوئی زمین، کوئی رقبہ وغیرہ تو نہیں لیا''

''کس کے جلسے میں آیا تھا وہ۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔

''علی مراد جی کے جلسے میں۔! علی مراد جی پہلے بھی دو بار الیکشن میں کھڑا ہوا تھا۔ مگر ایک بار اس کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی۔ اور دوسری بار اس کو صرف اٹھارہ سو ووٹ ملے تھے۔ بڑی دیگاں شیگاں کھلا کے۔ روپیا بانٹ کے منت ترلا کر کے۔'' ریاضے کمدار نے رپورٹ دی۔

''ہونہہ۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی کو اندرونی طور پر اچھا لگا تھا کہ ان کے بندے علاقے کی تمام سرگرمیوں کی باخبری رکھتے ہیں۔

''تم جانتے ہو کہ ملک ریاض ضمنی ہر قیمت پر جیتنا چاہتا ہے۔؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہ جی۔؟'' اقبال عرف بالا نے کہا۔ ''الیکشن تو ہمارے عبداللہ شاہ جی نے جیتنا ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے بھلا الیکشن کوئی اور لے جائے، شیروں سے گوشت کون چھڑائے۔؟'' بالا کے لہجے میں بلا کی لاپرواہی تھی۔ یوں جیسے اس نے عبداللہ کے لئے الیکشن کے نتیجے کا اعلان سن لیا ہو۔ وہ الیکشن جنہوں نے ابھی ہونا تھا۔

شاہ ہارون گیلانی کو تسلی تو ہوئی۔ لیکن انہیں پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کا لہجہ یاد آ گیا ''ذرا اپنی حویلی سے باہر نکل کر دیکھو لوگ بدل رہے ہیں!''

''عبداللہ کے لئے کیا صورت حال ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔ ''کتنے ووٹ ہونگے۔؟''

''چونتیس ہزار تو پکے ہیں۔!'' ریاضے کمدار نے کہا ''آگے دو چار سو کا فرق پڑے تو پڑے۔''

''شاہ جی سرکار۔!'' طارق منیجر نے شاہ ہارون گیلانی کے پاؤں چھوئے۔ ''اگر کوئی بات ہے تو سرکار صرف حکم کریں۔'' وہ بلا کا مزاج شناس تھا۔

شاہ ہارون گیلانی نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور ان سب کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ سب انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں ان کے لئے مر مٹنے کا، قربان ہو جانے کا عزم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کو ایک طمانیت کا احساس ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ان کی سلطنت کے رعب و دبدبے کو قائم رکھتے، طاقت، خوف، لالچ کے نادیدہ آسیبوں سے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑتے تھے۔ وہ نادیدہ مہرے جو نظر نہیں آتے، مگر اپنے پورے وجود کی طاقت سے محسوس ہوتے ہیں۔

''عبداللہ کا جلسہ کب ہے۔؟'' انہوں نے جیسے بات بدل دی۔

''کل شام کو۔''

''حالات تو ٹھیک ہیں نا۔؟'' انہوں نے بڑے سرسری لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک ہیں سرکار جی۔!'' نیاز نے مستعدی سے جواب دیا ''سیکورٹی بڑی سخت ہے۔ پھر آپ بھی وہاں جا رہے ہیں۔ اس لئے سرکاری اور ہماری دونوں ہی مل کر ہر طرح سے معاملات دیکھ لیں گے!''

''وزارت داخلہ کی طرف سے بھی احتیاط کی ایڈوائس آئی ہوئی ہے!'' شاہ ہارونی گیلانی نے کہا۔ ''سیکورٹی کی صورت حال پورے ملک میں مخدوش ہے۔ جگہ جگہ دھماکے ہو رہے ہیں۔ پھر سب سے مشکل اور پے چیدہ صورت حال تو خودکش حملہ آوروں نے پیدا کر رکھی ہے۔ ان کو روکنا بے حد مشکل ہوتا ہے اس لئے احتیاط بہت ضروری ہے۔!''

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور محفل برخاست ہوئی۔ سب دبے پاؤں نکلتے چلے گئے۔

☆☆☆

شاہ ہارون گیلانی حویلی کے اندر آئے، تو شاہ عبداللہ گیلانی اندر ہی موجود تھا۔ اونچا، لمبا، بے حد خوبصورت، امریکا سے کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں ماسٹرز کر کے آیا تھا۔ عبداللہ ان کی نازوں پلی بیٹی نازاں کا منگیتر بھی تھا۔ اس وقت وہ سارے ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔

''آئیں چاچو۔!'' عبداللہ گیلانی ان پر نظر پڑتے ہی کھڑا ہو گیا۔ وہ نزدیک آئے تو اس نے بڑے ادب سے سر جھکا دیا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا، پھر پیار سے بولے ''کھانا کھا لیا۔؟''

''نہیں۔۔۔!'' ان کی بیگم نے کہا۔ ''ہمیں معلوم ہوا کہ آپ باہر آ گئے ہیں، اور کوئی لوگ بھی نہیں ہیں تو سوچا کہ آج سب آپ کے ساتھ اکٹھا کھانا کھا لیں۔!''

''یہ تو بہت اچھا ہے!'' شاہ ہارون گیلانی مسکرائے۔ ''آج تو ہمیں اپنے گھر والوں کے ساتھ کھانے کا موقع مل رہا ہے۔ اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ عبداللہ بھی موجود ہے۔!'' وہ خوش دلی سے بولے اور کپڑے تبدیل کرنے اندر بڑھ گئے۔

انہیں عبداللہ سے پیار بھی بہت تھا۔ صرف ایک ہی بھتیجا تھا ان کا، ان کے بڑے بھائی اب سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ دو بیٹیوں کی شادی کر چکے تھے۔ دونوں داماد میں سے ایک کی شوگر مل تھی اور دوسرے داماد کی ایک بہت بڑی ہوم اپلائنسز بنانے والی کمپنی میں ساجھے داری تھی۔ اور ان دونوں کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر شاہ ہارون گیلانی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ عبداللہ کو سیاست میں لائیں گے۔ کیونکہ صنعت کاری، زمینداری، حکمرانی کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔

☆☆☆

رات کا پچھلا پہر رخصت ہو رہا تھا۔ شاہ ہارون گیلانی اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیوبا کا موٹا سا گار ان کی انگلیوں کے درمیان سلگ رہا تھا۔ پورے اسٹڈی روم میں تمباکو کی خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی چوڑی پیشانی قدرے شکن آلود تھی۔ چہرے پر تفکرات کے سائے صاف محسوس ہو رہے تھے۔ انہوں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ساتھ ہی دروازہ کھول کر دو آدمی اندر آ گئے۔ دونوں نے چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان دونوں نے جھک کر شاہ ہارون گیلانی کے پاؤں چھوئے اور احترام سے کھڑے ہو گئے۔

''بیٹھ جاؤ۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی بھاری آواز گونجی۔ انہوں نے اپنی چادریں اتاریں اور نیچے بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک اقبال عرف بالا تھا، اور دوسرا اجنبی۔

''حکم شاہ جی۔!'' اجنبی شخص نے ان کے پیروں کو پھر سے ہاتھ لگایا۔ اور بہت نرم، احسان سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہماری جان تو سرکار کا قرض ہے۔ آپ کی امان ہے۔''

پہلی بار شاہ ہارون گیلانی کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہوئے۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی باریک سی لکیر نمودار ہوئی۔

''کل عبداللہ گیلانی کا جلسہ ہے۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہنا شروع کیا۔ ''اس مرتبہ ملک کی سیکیورٹی کی صورت حال کافی مخدوش ہے۔ آئے دن دھماکے اور خودکش حملے معمول بنتے جارہے ہیں۔ اس سے کبھی کبھی بہت نقصان بھی ہوجاتا ہے۔!''

''سمجھ گیا سرکار۔۔!'' بالے نے شاہ ہارون گیلانی کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ ''علی مراد کے جلسے میں کیا کرنا ہے؟ دھماکہ۔۔ یا خودکش دھماکا؟''

''ہونہہ۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے بالے کی بات پر یوں ہنکاری بھری، جیسے اس نے انتہائی بچکانہ تجویز پیش کی ہو۔ ''بے وقوف۔ دھماکا علی مراد کے جلسے میں نہیں، عبداللہ گیلانی کے جلسے میں کرنا ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے قدرے خفگی سے کہا۔

''جی۔۔!'' مارے حیرت کے بالے کا منہ کھل گیا۔ ''سرکار اپنے جلسے میں، اِدھر تو اپنے عبداللہ شاہ جی ہونگے۔!''

''شاہ جی دھماکے کا کہہ رہے ہیں پاگلے، خودکش دھماکے کا نہیں۔!''

''رحیم شاہ ٹھیک سمجھا۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے توصیفی نگاہوں سے تیسرے اجنبی جس کا نام رحیم شاہ تھا، کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''مخالف کے جلسے میں دھماکے کا الزام تخریب کاروں اور ملک دشمن عناصر سے پہلے ہمارے اوپر آجائے گا۔!''

''ٹھیک سات بجے دھماکا ہونا چاہیے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''ٹھیک پونے سات بجے عبداللہ ڈائس چھوڑ دے گا۔ اس کے ڈائس سے ہٹنے اور کرسیوں پر بیٹھنے کے دوران۔ چار پانچ بندوں سے زیادہ کام نہ آئیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے چار پانچ پر خصوصاً زور دیتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا شاہ جی سرکار۔!'' رحیم شاہ نے اطمینان دلایا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ اس سے پہلے کبھی آپ کو شکایت کا موقع ملا ہے؟ جواب ملے گا؟''

''ہاں یہ تو ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے سر ہلایا۔ ''اس کے بعد تم گھومنے پھرنے کے لئے دوبئی چلے جانا۔ سارا انتظام بالے کے ذمے ہے''۔ انہوں نے کہا اور بالے کی طرف دیکھا۔ یہ گویا بات چیت ختم ہونے کا اشارہ تھا۔

وہ دونوں اٹھے اور شاہ ہارون گیلانی کے پیروں کو چھوکر، سلام کر کے اسٹڈی روم سے باہر نکل گئے۔

شاہ ہارون گیلانی نے کرسی کی پشت سے خود کو ٹکا کر پشت سیدھی کر کے گردن پیچھے ٹکا دی۔ اس سے قبل بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ مفاد کے سامنے کوئی دیوار نہیں کھڑی ہوسکتی۔ سیاست کی دنیا میں کامیابی کا صرف ایک ہی اصول ہوتا ہے کہ اس سے قبل کہ اگلا تمہیں کچل کر تم پر پاؤں رکھ کر کامیابی کی سیڑھی پھلانگ جائے، اسے ہر قیمت پر شکست دیدو، ملیامیٹ کردو۔ ان کا ہر فیصلہ بڑا نپا تلا، ہر قدم سود وزیاں کے حساب کے بعد اٹھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے تھے، مگر آج پہلی بار انہیں قدرے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ اس مرتبہ ان کا بھتیجا ان کے سامنے تھا۔ بے حد عزیز اور پیارا بھتیجا۔ جوان کی بیٹی نازاں کا مستقبل بھی تھا۔ انہوں نے اس کے متعلق بہت سارے خواب بُنے تھے۔ اس لئے ان کی ساری محبت اور توجہ کا مرکز ان کا بھتیجا عبداللہ شاہ گیلانی ہی تھا۔ انکا بیٹا ابھی نوعمر تھا۔

☆☆☆

صبح کے دس بج رہے تھے۔ عبداللہ شاہ گیلانی حویلی کے وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد تقریباً چالیس پچاس افراد کا مجمع تھا۔ عبداللہ گیلانی کہہ رہا تھا۔ ''جب تک ہم لوگوں کی رائے کا احترام کرنا نہیں سیکھیں گے۔ ان کے احساسات اور جذبات میں شامل نہیں ہونگے۔ ہم اپنے لوگوں اور اپنے عوام کے درمیان کے فاصلے نہیں مٹا سکتے۔!''

''لو جی شاہ جی۔!'' ایک طرف سے آواز آئی۔ ''بھلا آپ جیسے اُجلے اُجلے آدمی کا میلی، کچیلی، بدبودار عوام سے کیا تعلق۔؟ ایک ہی کمرے میں بیوی، بکری تندور، لڑکے بالے، لنگڑ بالن، ساز وسامان اور کہاں آپ خوشبودار، لش پش۔۔۔''

''سوچ کو بدلنا پڑے گا۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''جب تک ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کو برابر نہیں سمجھیں گے خوشبو اور بدبو کے احساسات ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھیں گے۔!''

''لیکن شاہ جی۔!'' فیقے نے سر کھجاتے ہوئے سوال کیا۔ ''جب ہم نزدیک جائیں گے۔ تو پھر دوری مٹ جائے گی۔ اور جب دوری مٹ جائے گی تو خوف ختم ہوجائے گا۔ پھر ضروری تو نہیں کہ ہر آدمی ہمارے کہے کو حکم سمجھے۔ اور صرف ہم ہی کو ووٹ دے۔ پھر ہماری سرداری کہاں جائے گی۔؟''

''جی یہ ٹھیک کہہ رہا ہے چھوٹے شاہ جی۔!'' دوسری آوازیں اس کی تائید میں بلند ہوئیں۔ ''لوگ آنکھ کا اشارہ تربیت کے بعد ہی سمجھتے ہیں۔ عوام جانور کی طرح ہوتے ہیں۔ اور جانوروں کو مار، مار کر سدھایا جاتا ہے۔ خوف، لالچ، اور انعام۔ جی ان سے جانور بھی سیکھتے ہیں اور بندے بھی۔!''

عبداللہ شاہ گیلانی نے انہیں بے بسی سے دیکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لئے وہ خواب بنتا تھا۔ امریکا چھوڑ کر آیا تھا۔ چاچا جی تو کس قدر انسانیت اور محبت سے بھرپور تھے۔ مگر یہ لوگ شائد اس کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ان کے لئے آج بھی کامیابی کے اصول لگے، بندھے اور صدیوں آزمودہ والے ہی صحیح تھے۔

عبداللہ شاہ گیلانی اپنے چچا شاہ ہارون گیلانی سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کے لئے چچا ایک آدرش، ایک معیار، ایک علامت تھے۔ جن سے اس نے زندگی کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ وہ اپنے نرم وگداز چچا کے سیاسی معاملات کو نہیں جانتا تھا۔ اور سیاست کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بے نیاز ہوتی ہے۔

اسی وقت دروازے پر ہلچل سی ہوئی۔ تین چار لوگ اندر آئے۔ ان کے درمیان میں چھوٹے شاہ جی نعمان شاہ گیلانی تھا۔ شاہ ہارون گیلانی کا اکلوتا لاڈلا بیٹا۔ شکل وصورت میں، قدبُت میں اپنے باپ کی مکمل تصویر۔

''بھائی جان۔!'' وہ عبداللہ شاہ گیلانی سے لپٹ گیا۔ وہ بہت پیار کرتا تھا اپنے چچازاد سے۔ بچپن میں ہر وقت عبداللہ شاہ گیلانی کا ناک میں دم کئے رکھتا تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔ دس برس چھوٹا تھا وہ عبداللہ شاہ گیلانی سے۔

''کب آئے۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔

''مجھے امی نے فون پر بتایا کہ آپ کو آئے ہوئے تین چار دن ہوگئے ہیں۔ میرے سمیسٹر کے آخری دو پیپرز تھے وہ دیتے ہی سیدھا آگیا۔ آپ کیسے ہیں آتے ہی سیاست میں لگ گئے۔!''

''چچا جان کا حکم جو ہے۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے بھی بطخ کا بچہ پانی کے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔؟ سیاست کے بغیر ہم، اور ہمارے بغیر سیاست ادھوری ہے۔''

''مگر مجھے تو آپ سیاست دان سے زیادہ ہالی وڈ کے ہیرو لگتے ہیں۔'' نعمان شاہ نے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اُدھر کسی جگہ ٹرائی ماری تھی۔؟''

''تم بالکل بھی نہیں بدلے۔!'' عبداللہ شاہ نے پیار سے چپت لگائی، اس کے گالوں پر۔ اسی وقت اندر سے ایک ملازم نے آکر کہا کہ ان دونوں کو اندر بلایا جارہا ہے۔ یہ سن کر نعمان شاہ گیلانی اٹھ کھڑا ہوا اور اندر چلا گیا۔

عبداللہ شاہ گیلانی نے دوبارہ ان لوگوں سے پوچھا۔ ''جلسے کے لئے سارے انتظامات مکمل ہیں؟''

''جی شاہ جی۔!'' فیقے نے ادب سے کہا۔ ''آپ بے فکر رہیں بس آپ نے جلسہ لوٹ لینا ہے!''

''کیا مطلب۔؟'' عبداللہ شاہ نے حیرت سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے جی ایسی تقریر کرنی ہے کہ بس جی لوگ آپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھیں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ بس جی ذرا جذباتی شذباتی، آستین چڑھا کر، مخالفوں کے لتے لینے ہیں۔''

''یہ سلطان راہی کی کوئی فلم نہیں۔!'' عبداللہ شاہ نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ''لوگ کو جب حقائق بتائے جائیں، ان کی ضروریات کو اُجاگر کیا جائے۔ صحیح راہ دکھائی جائے تو پھر لوگ خود بخود ساتھ ہو جاتے ہیں۔''

''اچھا جی۔!'' فیقے نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہو۔!'' اور کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔

عبداللہ شاہ گیلانی اندورنی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی چوڑی پشت پر نظر جمائے پہلی بار فیقے کو احساس ہوا کہ عبداللہ شاہ گیلانی کے اندر کچھ بہت مختلف ہے۔ لیکن کیا؟ اسکا اس کو ادراک نہیں تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا۔!'' میں نے تیزی سے پوچھا۔ اور تیزی سے گرتے ہوئے سراپے کو اندھیرے میں ہی تھام لیا۔

''وہ میں۔'' اس کے منہ سے بے معنی سی آواز نکلی۔ یہ موی نہیں کوئی اور تھا۔ ''وہ میں۔'' اس نے کسماتے ہوئے کہا اور دھیمے سے مجھ سے ہاتھ چھڑا لیا۔

میں نے آواز دی۔ ''موی کیا ہوا؟''

''پتا نہیں۔ یو پی ایس کا بٹن آن کر دیں''۔ موی کی آواز سنائی دی۔

میں نے کہا۔ ''جہاں ہو وہیں رہو۔ میں بٹن آن کرتا ہوں۔'' میں اندازے سے یو پی ایس کی جانب گیا۔ اس کی سرخ بتی اندھیرے میں روشن تھی میں نے بٹن آن کیا۔ اس کے ساتھ ہی روشنی ہوگئی۔

''اب بتاؤ کیا ہوا۔؟'' میں نے کچن کے دروازے پر کھڑی موی سے پوچھا۔

''وہ چھپکلی میرے ہاتھ پر گری تھی۔!'' موی نے بتایا۔ ''میں ڈر گئی اسی وقت لائٹ چلی گئی۔!''

''چھپکلی۔!'' نرگس نے کہا۔ ''اس سے ڈرنے کی کیا بات ہے کدھر ہے۔؟'' اس نے وائپر اٹھایا۔

''آپ کو ڈر نہیں لگتا۔؟'' موی نے حیرت سے پوچھا۔

''ڈر کیسا۔؟'' نرگس نے اطمینان سے کہا۔ ''گاؤں میں سانپ، بچھو، کھن کھجورے، چھپکلیاں، لال بیگ، نیولے، چوہے، روزمرہ کا معمول ہیں۔ بالن کے ساتھ چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر ان سے ڈر گئے تو پھر زندگی کیسے گزاریں گے۔؟'' وہ مسکرائی۔

''پھر آپ کو ڈر کس سے لگتا ہے۔؟'' موی نے سخت متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''انسانوں سے۔!'' اس نے ایک گہری سانس بھر کے کہا اور ساتھ ہی وائپر بھاگتی ہوئی چھپکلی پر

مارا۔ چھپکلی کی دم کٹ گئی اور پیٹ پھٹ گیا۔ اس نے وائپر سے چھپکلی کو اٹھایا اور کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا۔ موی اسے دیکھتی رہ گئی اور وہ ہاتھ دھونے غسل خانے میں چلی گئی۔

''بھائی یہ کتنی عجیب سی ہیں۔!'' موی نے میرے نزدیک ہو کر کہا۔ ''مجھے تو اچھی لگنے لگی ہیں۔!''

''تمہیں تو ہر کوئی اچھا لگنے لگتا ہے۔!'' میں نے ہنس کر کہا۔ اسی وقت امی نے آواز دی اور میں اندر چلا گیا۔

☆☆☆

وہ کہہ رہے تھے اور لوگ سر جھکائے سن رہے تھے ''ہمارے پاس انبیاء علیہ السلام آئے، کتابیں، صحیفے آئے۔ پھر شعور اس بلندی پر پہنچا کہ جب انسانیت کی معراج کی تکمیل کو سمجھ سکے، تو رسول مکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، توحید کا پیغام لیکر، خالص، سچا اور معتبر پیغام جس میں ہر مشکل کا حل، ہر سوال کا جواب موجود ہے۔!''

''سرکار!'' ایک طرف سے ایک ہاتھ بلند ہوا اور وہ ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ ''میں ایم ایس سی میتھ کا طالب علم ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید میں جو تخلیقی فارمولے ہیں ان کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں ایسے فلسفی، ایسے پیر، ایسے عالم دین مل جائیں تو پھر دنیا بہت جلد اسلام سے مطمئن ہو جائے گی''۔

''اچھی بات ہے۔!'' قادری سرکار مسکرائے۔ ''میں اس پر چند باتیں آپ لوگوں کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ دین کے ایک ایسے رُخ کو دیکھ سکیں جو آپ کے لئے بے حد ضروری ہے۔!'' وہ نوجوان بیٹھ گیا اور نہایت توجہ سے سننے لگا۔

قادری سرکار نے بات کا آغاز کیا۔ ''آج کل ایک وبا چلی ہے کہ نماز کے یہ فائدے ہیں۔ سجدہ کرنے سے دوران خون تیز ہو کر سر کی جانب جاتا ہے۔ دماغ کو آکسیجن زیادہ ملتی ہے۔ بندہ زیادہ ذہین ہوتا ہے۔ رکوع سے کمر کی ہڈی پر بہتر اثر پڑتا ہے۔ روزے سے امراض کو کنٹرول کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جگر، گردے، شوگر کے مریضوں کے لئے روزہ بہت مفید ہے۔ مسواک کے یہ طبی فائدے ہیں۔ کھانے میں اکڑوں بیٹھنے سے معدے پر بہتر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ معدہ کم پھیلتا ہے۔ لیکن۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی اور حاضرین کی طرف دیکھا۔

''لیکن عزیزان گرامی! ہم فرائض دین کی توجیہات میں الجھ گئے۔ اور دین کا اصل مفہوم بھول گئے کہ ہمارے رکوع اور سجود، ہمارے روزے اور عبادت، فقط حصولِ رضائے الٰہی کے لئے ہے۔ اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر دین کی عمارت قائم ہے۔ جب محبت اور اطاعت میں تاویلات شامل ہو جائیں گے تو پھر سودے بازی، سود و زیاں کے معاملات سر اٹھائیں گے۔ پھر نماز، عبادت اور حضوری کے بجائے۔ یوگا کی ایکسرسائز بن جائے گی۔ کیونکہ نماز مومن کی معراج کے بجائے، بدن کی اصلاح کے حوالے سے قائم ہوگی۔ تو پھر میرے دوستوں۔! عبادت تو غیر مشروط ہوتی ہے۔ حساب کتاب سے بے نیاز، محبت میں سودا نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو مکمل خود سپردگی اور حوالے کرنے کا کام ہے۔!''

''سبحان اللہ! اللہ اکبر۔۔۔ ماشاء اللہ!'' بے ساختہ آوازیں بلند ہوئیں۔ کئی لوگ بے تابانہ کھڑے ہو گئے اور بے ساختہ ان کے ہاتھ چومنے لگے۔

''حضور سرکار آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔!'' اسی نوجوان نے کہا۔

''بیٹے آپ لوگ ہماری آنکھیں ہو۔ ہمارا کل ہو۔ ہمارے وطن کا سرمایہ ہو۔ تم لوگوں کی فکری تربیت، دین کی اصل کا علم ہمارے مستقبل کو نہیں ہوگا۔ تو پھر ہم کھو کھلے ہو جائیں گے۔!'' انہوں نے بڑی محبت سے

نوجوان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیا اجازت ہے کہ ہم لوگ آئندہ بھی حاضر ہوتے رہیں۔؟''

''کیوں نہیں عرفان میاں۔'' قادری سرکار نے محبت سے کہا۔ ''آپ لوگوں سے مل کر طمانیت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان علم اور عمل دونوں کی جانب توجہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس ملک کے نوجوان علم اور عمل دونوں پر آمادہ ہو جائیں اس ملک کو ترقی پانے اور اٹھ کھڑے ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔!''

''کاش علماء اور مرشد آپ جیسے ہو جائیں۔!'' عرفان کے ساتھ آئے ہوئے لڑکے نے عقیدت سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''سب اچھے ہیں۔ بس ہر شخص گفتگو اپنے فہم کے مطابق کرتا ہے۔ ہمیں کسی سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔!'' قادری سرکار نے ملائمت سے کہا۔

''جی صحیح فرماتے ہیں آپ۔!'' اس نے کہا اور قادری سرکار کے ہاتھوں کو عقیدت سے بوسہ دیکر ہٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب ایک ایک کر کے خانقاہ سے نکل گئے۔

''یہ کون تھے۔؟'' میں نے ایک خادم سے سوال کیا۔

''یہ سب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس تھے۔ سرکار سے گفتگو کے لئے آئے تھے۔!'' خادم نے بتایا۔

''اچھا۔!'' میں نے قادری سرکار کی طرف دیکھا وہ اپنے تخت پر بیٹھ گئے تھے۔ ایک خادم ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھے۔ انہوں نے سر جھکائے خادم سے کوئی بات کی، خادم نے ادب سے سر ہلایا۔ اور پھر اٹھ کر میری طرف آنے لگا۔

خادم کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ نجانے کیا بات تھی جب بھی قادری سرکار سے میرا آمنا سامنا ہوتا تھا۔ تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ ایک انجانا سا خوف میرے رگ و پے میں سمانے لگتا تھا۔ مجھے ان کے دیکھنے کے انداز میں، توجہ سے یوں لگتا تھا کہ جیسے اندر تک اترے جا رہے ہوں۔ جیسے ان سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ میں نہ ان کا مرید تھا نہ عقیدت مند، لیکن میں کیوں یہاں آتا تھا؟۔ کیوں ان کے سامنے سرنڈر ہو جاتا تھا؟۔ میں نہیں جانتا تھا۔ شاید کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تفہیم آسان نہیں ہوتی۔ یہ رشتہ بھی ان ہی رشتوں میں سے ایک تھا۔ خادم نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کشاں کشاں اس کے پیچھے چل دیا۔ یہ وہی خادم تھا جو مجھے کل بلانے آیا تھا۔

☆☆☆

میں کمرے میں داخل ہوا تو قادری سرکار سامنے ہی بیٹھے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے خوش دلی سے میرے سلام کا جواب دیا اور بولے۔ ''تنزیل میاں آپ سے ہمیں ایک بہت ضروری کام ہے۔!''

''جی مجھ سے۔؟'' میں نے حیرت آمیز لہجے میں سوال کیا۔ ''میں بھلا آپ کے کیا کام آ سکتا ہوں۔؟''

''ہر آدمی اس کائنات میں اپنی اپنی جگہ اہم کام سرانجام دے رہا ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہم اس کے اور اپنے کام کے درمیان کی نسبت اور معنویت تلاش کر لیں۔!'' انہوں نے بڑے رسان سے کہا۔

''جی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔!'' میں نے کہا۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

قادری سرکار میری بات پر مسکرائے۔ مجھے لگا کہ جیسے ان کی مسکراہٹ کہہ رہی ہو کہ ہم جانتے ہیں کہ تم کچھ نہیں سمجھے۔! انہوں نے خادم کی طرف دیکھا وہ جلدی سے ایک قلم اور لیٹر پیڈ اٹھا لایا۔ اور بڑے ادب سے میز پر رکھ دیا اور اس کے بعد پھرتی سے وہاں سے غائب ہو گیا۔

قادری سرکار نے مجھے لیٹر پیڈ اور قلم اٹھانے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''تنزیل میاں جو لکھوانے جا رہے ہیں اس کو احتیاط سے قلم بند کیجئے۔!''

''جی۔۔۔!'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔ میرے اندر کسی سوال جواب کا یارا نہیں تھا۔ ان کے سامنے تو میں جیسے سحر زدہ ہو جاتا تھا۔ ''جی لکھوایئے۔!''

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

انہوں نے آغاز کرتے ہوئے کہا۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔! عزیزان گرامی۔! سب سے پہلے تو میں آپ تمام بہن بھائیوں، عزیزوں اور بزرگوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے مسائل کی نشاندہی کے لئے ایک ایسے فرد کو منتخب کیا۔ جس کا ماضی، کردار، معاملات آپ کے سامنے ہیں۔ جو اپنے مالی وسائل، ذہنی قابلیت، جسمانی مشقت آپ کے بہتر مستقبل کے لئے کر رہا ہے۔ یاد رکھئے کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ہے کہ ایسے بے داغ کردار کے نوجوانوں کو اپنے معاملات کی باگ ڈور سونپنی چاہیے، جو کہ کسی طور بھی اپنے اصولوں سے انحراف نہ کرتے ہوں۔ کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت دین دی۔ تو سب سے پہلے اپنے بے داغ، اجلے، روشن، چالیس سالہ ماضی کو پیش کیا۔ ایک اعلیٰ خاندان ہونے کے باوجود دین کی دعوت دینے کے لئے خاندان کی نسبت کو ساتھ میں نہیں جوڑا۔ اپنے مال کا لالچ نہیں دیا۔ صرف اپنے بااثر، خوشحال دوستوں کو اپنا ساتھی نہیں بنایا۔ بلکہ تمام عزیز و اقربا، دوست احباب، آزاد، غلام، پست و بلند ہر مرتبے کے شخص کو دعوت دین دی۔ ایک ایسے دین کو اپنانے کی دعوت، جس میں سطوت، عظمت، قربانی، جنت اور دنیا شانہ بشانہ چلتے تھے۔ اور چلتے ہیں۔ آج کے اس پر آشوب دور میں، جب کہ ہر طرف ظلم، بددیانتی، اقربا پروری، جھوٹ، منافقت، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، کا بازار گرم ہے۔ تو کیا آپ کردار کو، علم کو، ذہانت کو، سچائی کو، عزم کو، ہمت اور خدمت کو اپنائیں گے۔ یا ایک بار پھر ظلم، زیادتی، خوف، خاندان، لالچ کو ووٹ دے کر منتخب کریں گے؟۔ اور پھر ان کے ہر ظلم میں بھاگی دار بن کر برابر کا عذاب چکھنے کو ترجیح دیں گے۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ وطن عزیز میں زلزلے، سیلاب، امراض و باؤں کی صورت میں کیوں پھوٹتے ہیں؟۔ ہم تو حکمران بھی نہیں پھر ہمیں عذاب کیوں مل رہا ہے؟۔ عام لوگ کیوں عذاب جھیل رہے ہیں؟۔ تو دوستوں۔! تو پھر دوستوں۔! اس کا جواب یہ ہے کہ غربا، مساکین اور عام افراد پر عذاب اس لئے آتا ہے کہ یہ ظلم و زیادتی کو برداشت کر کے سنت کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اپنے خوف، مصلحت پسندی بزدلی، بے ہمتی کو آزمائش قرار دیکر اس خدائی فرمان کو پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ جس میں کہا گیا ہے۔ کہ ''خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو قوم خود اپنے حالات کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔'' اگر آپ آج نہیں بدلیں گے تو پھر کل آپ نہیں ہونگے۔! عزیزی خادم حسین کے پاس دولت نہیں کہ جس سے وہ ووٹ خرید سکے۔ اتنی افرادی قوت نہیں کہ جس سے وہ گھر، گھر جا کر ووٹ کی پرچیاں بانٹ سکے۔ حق اور سچائی کی راہ میں آپ ہی اس کے نمائندے، آپ ہی اس کے سپورٹر، آپ ہی اس کے پولنگ ایجنٹ ہیں۔ کیا آپ دین کے راستے پر چلتے ہوئے خادم حسین کا ساتھ دیں گے؟ میرے امیدوار، میرے بچے کا ساتھ دیں گے۔ وہ سچائی اور ایمانداری جس کی سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری حیاتی تبلیغ کی۔ جس کے لئے ہر مشکلات جھیلیں اور ہم تک دین پہنچایا۔ سچائی اور اصول دیئے۔! اب اس اصول کی پاسداری اور اس تعلیم کا امتحان ہے۔ جو رسول اکرمؐ نے ہمیں دی۔ آپ فیصلہ کر لیجئے کہ آپ سچے شاگرد اور امتی ہیں یا نہیں؟۔!''

والسلام دعا گو!

تصوف اور محبت کی اِس پراسرار دنیا کے حیرت ناک واقعات' اگلے ماہ ملاحظہ فرمایئے

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1).....مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2).....منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3).....اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II ۔خیابانِ جامی ۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ۔فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھا کرو۔ اس نفسا نفسی کے دور میں جو لوگ اللہ کے بندوں کی مدد کرتے ہیں وہ اللہ کے پسندیدہ بندوں کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں۔ اللہ تمام مسلمانوں کو توفیق دے کہ اُن کا شمار بھی رب العزت کے مقرب بندوں میں ہو۔

جو والدین اپنی بچیوں کی شادی میں تاخیر کی وجہ سے پریشان ہیں۔ وہ 40 دن بعد نماز ظہر 7 تسبیح سبحان اللہ کی پڑھیں اور بعد نماز عصر اپنے ہاتھوں سے چڑیوں کو باجرہ اور پانی دیں۔ یہ عمل بچیاں خود بھی کرسکتی ہیں۔ جن لڑکوں کی شادی میں دشواری اور رکاوٹ ہے وہ بھی یہ عمل کرسکتے ہیں۔ انشاء اللہ 40 دن پورے ہونے سے قبل حاجت پوری ہوگی۔

☐ مائرہ۔ گجرات

o پیارے بابا جی! السلام علیکم! میری بہن جس کی عمر 40 سال ہے، وہ شادی شدہ ہے، رات میں سو کر جب صبح اٹھتی ہے تو بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ اُس کا وزن زیادہ ہے اور روز بہ روز بڑھتا جارہا ہے۔ میری بہن بے چاری بہت پریشان ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو لکھ کر بھیجوں۔ بابا جی! آپ میری بہن کے لیے دُعا کریں اور دوا بھی ضرور بتائیں تاکہ میری بہن کو شفا ہوجائے۔

☆ بیٹی مائرہ! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ جسم میں درد وزن بڑھنے کی وجہ سے ہے۔ مناسب ہوگا غذا متوازن لے اور یا شافعی کا بہت ورد کرو۔ انشاء اللہ مکمل افاقہ ہوگا۔ وزن کم کرنے کی دوا سچی کہانیاں کے آفس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

☐ ثمینہ۔ کوٹ ادّو

o محترم بابا جی! اُمید ہے کہ آپ ضرور میرے مسئلے کا کوئی حل نکالیں گے۔ عمر 43 سال ہے۔ آج سے 10 سال پہلے میں نے اپنی 2 فرینڈز کے ساتھ اسکول میں پارٹنر شپ کرلی۔ وہ دونوں بی۔اے، بی۔ایڈ اور میں پرائمری تک پڑھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تم پیسا لگاؤ محنت ہم دونوں کریں گی اور منافع تینوں میں تقسیم ہوجائے گا، لہٰذا میں نے اپنی تمام جمع پونجی لگادی اور کچھ پیسے گھر والوں سے بھی لے لیے۔ اس کے باوجود اسکول کے اخراجات بڑھتے جارہے تھے، جبکہ آمدنی کوئی نہیں تھی۔ جب بھی فرینڈز سے بات کرتی، یہی جواب ملتا کہ پہلے سال چٹی، دوسرے ہنی، تیسرے سال کھٹی۔ ابھی پیسا لگاؤ پھر کچھ ملے گا۔ پیسے کو پیسا کماتا ہے اور اس کام میں تو پیسا ہی پیسا ہے۔ میں ان کی باتوں میں آتی چلی گئی اور سود پر قرض لے لیا۔ ایک سال تک قسط ادا نہ کرسکی اور میرے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ تو بُری طرح پھنس چکی ہے۔ اسکول کا سامان سیل کرکے رقم بانٹ لی کہ ہم دونوں نے محنت کی ہے، لہٰذا یہ ہمارا حق ہے۔ تم جانو تمہارا قرض، 15 لاکھ روپے اسکول پر خرچ کردیے، 7 لاکھ روپے سود کا قرض چڑھ گیا۔ میری بیوقوفی کہ میں نے ان پر اندھا اعتماد کیا۔ میرے پاس کوئی ثبوت، کوئی گواہ نہیں۔ جب بھی میں

اطلاعِ عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II ۔فرسٹ فلور۔خیابانِ جامی کمرشل۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

نے ان سے کہا کہ معاہدہ کرلیتے ہیں۔ جواب ملا کہ کرلیں گے اتنی جلدی کیا ہے۔ والدین بیمار ہیں، وہ میری مدد نہیں کرسکتے۔ بھائی ہے تو وہ قتل کرنے پر تلا ہوا ہے، گھر بدر ہوچکی ہوں۔ رشتے دار اور ملنے جلنے والے دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں کہ ہم سے کچھ مانگ نہ لے۔ 3 گھروں میں کام کرتی ہوں۔ 6000 روپے ملتے ہیں جو سود کی آدھی قسط کٹ جاتی ہے۔ ساری زندگی لگی رہوں تو یہ قرض ادا نہیں کرسکتی۔ بہت سارے عاملوں کے پاس گئی ہوں جنہوں نے مجھے برباد کردیا لیکن کام نہیں کیا۔ زندگی سے تنگ آچکی ہوں، آپ سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ مجھے یا تو قرض سے نجات دے یا پھر موت یا مجھے ہی اتنی ہمت دے کہ میں گلے میں پھندا ڈال لوں یا پھر غیب سے میری مدد کردے اور اس ذلت اور بدنامی والی زندگی سے نجات دے، میں اب تھک چکی ہوں۔ میں آپ کو بتاتی چلوں کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں اور بہت ساری بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں عطا فرمائے۔ (آمین) آپ کو پڑھنے میں مشکل پیش آئے گی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

☆ بیٹی ثمینہ! تم نے بھروسا کیا اور دوستوں نے اس بھروسے کو توڑ دیا۔ اسی لیے حکم ہے کہ ہر معاملے میں تحریری ثبوت رکھنا چاہیے اور خاص کر جہاں معاملہ پیسے کا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اتنی سمجھ دار ہو کہ حرام موت کے بارے میں سوچو گی بھی نہیں۔ بے شک یہ مشکل وقت ہے، مگر یقین رکھو گزر جائے گا۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے، نماز کی پابندی رکھو اور سورۂ توبہ کی آخری آیت بکثرت پڑھو۔ اللہ غیب سے مدد فرمائے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ شہناز۔ حاصل پور۔

○ بابا جی! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں اپنا اصل نام شائع نہیں کرا سکتی کیونکہ آپ کا کالم میرے سسرال میں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے مگر بابا جی! افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کے قول و فعل میں بہت تضاد ہے۔ مجھے یہی بہتر لگا کہ میں آپ سے ان کی شکایت کروں۔ بیٹیوں کے لیے اصول الگ ہیں اور میں بہو ہوں تو میرے لیے ہر چیز بالکل جدا۔ میری ساس آپ سے پوچھے بنا کوئی کام نہیں کرتیں۔ میری شادی بھی آپ سے استخارہ نکلوانے کے بعد ہوئی۔ رشتہ کرنا ہو یا کاروبار، گھر بدلنا ہو یا کوئی بھی کام، وہ آپ کو خط لکھتی ہیں اور آپ جو کہتے ہیں، وہ کرتی ہیں۔ آپ کے جواب پڑھ کر مجھے بھی ہمت ہوئی کہ آپ سے بات کروں۔ بابا جی! میری ساس مجھے بہت پریشان کرتی ہیں۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں مگر ان کو بھی میرے ساتھ زیادتی کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بابا جی! پلیز، آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ کا ایک جملہ میری زندگی بدل دے گا۔ میرے والد حیات نہیں۔ میں آپ کو اپنا باپ سمجھ کر درخواست کررہی ہوں اس بھروسے کے ساتھ کہ آپ میرا پردہ رکھیں گے۔

☆ بیٹی شہناز! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تمہارا تفصیلی خط شائع کرنا ممکن نہیں مگر کچھ حصہ شائع کررہا ہوں۔ بیٹی.....! میں جو کچھ بھی بتاتا ہوں، وہ کلامِ الٰہی کے توسط سے بتاتا ہوں۔ ہم دینِ اسلام کے ماننے والے کبھی کسی پر ظلم نہیں کرسکتے، خود تو تکلیف سہ سکتے ہیں مگر کسی اور انسان کو زبان سے بھی دکھ نہیں دیتے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میرے رابطے میں رہنے والے اپنے گھر میں موجود ایک یتیم بچی کو دکھ دے رہے ہیں جو ان کے گھر کی عزت ہے۔ بیٹی.....! تم پریشان مت ہو۔ مجھے خط لکھ کر تم نے بہت اچھا کیا۔ اطمینان رکھو، یہ بات صرف تمہارے اور میرے درمیان رہے گی اور آئندہ آنے والے دنوں میں تمہاری ساس اور دیگر افراد کو اپنی کوتاہیوں کا بھی احساس ہوجائے گا۔ تم نماز پابندی سے پڑھو اور یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ بِرَحمَتِکَ اَستَغِیثُ کی تسبیح بہت پڑھا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ داؤد شاہ۔ لاہور

○ پیارے بابا جی! بہت اہم مسئلے کے ساتھ آپ کے پاس حاضر ہوں۔ میں بہن بھائیوں میں چھوٹا ہوں۔ چند ماہ قبل شادی ہوئی ہے، سب نے مل کر امی اور ابو کو

ناگہانی سے بچنے کا عمل

رات کے دوسرے پہر اُٹھ کر 2 نفل شکرانہ ادا کریں اور سوجی کا حلوہ تیار کرکے اس سے سحری کریں اور روزہ رکھ لیں۔ ظہر اور عصر کی نمازوں کے بعد 11-11 تسبیح 'یا حی یا قیوم برحمتک استغیث' کی پڑھیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش اور ناگہانی سے اپنی اور اپنے پیاروں کی حفاظت کی دعا کریں۔ مغرب کی اذان کے ساتھ روزہ کھول کر کچھ رقم خیرات کردیں۔ یہ نہایت مجرب عمل ہے اگر یہ نفلی روزہ بروز جمعہ رکھیں تو بہت اچھا ہے۔

میرے پاس رہنے پر مجبور کردیا ہے، حالاں کہ وہ دوسرے بیٹوں کے پاس بھی رہنا چاہتے ہیں۔ ابو کو تو اب بہت سے نام اور راستے یاد بھی نہیں، البتہ امی بہت بہتر ہیں، میں چاہتا ہوں امی میرے ساتھ رہیں اور ابو کو بڑے بھائی دیکھیں مگر یہاں بھی میرے لیے مسئلہ ہے کہ امی کہتی ہیں ابو کے کام دوسرے لوگ نہیں کرسکتے۔ میری بیوی کا کہنا ہے کہ اگر ابو کی ذہنی حالت ٹھیک ہوجائے گی تو وہ دوسری جگہ رہنے میں مشکل محسوس نہ کریں گے۔ بہت ہی دشوار وقت گزار رہا ہوں۔ بھائیوں کی اجنبیت، خود غرضی اور اپنے مسائل میں الجھ کر شادی کی خوشی بھی بھول گیا۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ میں بھی نفسیاتی مریض بن رہا ہوں۔ کچھ کریں پلیز بابا جی!

☆ بیٹے داؤد شاہ! والدین بوڑھے ہوجاتے ہیں تو بچے ان کو اپنے ساتھ رکھتے ہوئے پریشان ہوتے ہیں۔ جس طرح تمہارے بھائیوں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیا اور اب تم بھی مسائل محسوس کررہے ہو۔ والدین تمہارے ساتھ رہ رہے ہیں تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔ دنیا اور آخرت سنوارنے کا بہترین موقع مل رہا ہے۔ والد کی ذہنی حالت میں بہتری ممکن ہے، اس کے لیے تمہیں انہیں وقت دینا ہوگا۔ ان کے ساتھ بیٹھو۔ ان سے باتیں کرو، ان کو اپنے ساتھ گھر سے باہر لے کر جاؤ۔ جس طرح انہوں نے بچپن میں تمہیں سنبھالا آج وقت ہے کہ ان کا خیال رکھا جائے جو لوگ والدین کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو قدم قدم پر خوشیاں نصیب ہوتی ہیں۔ باقی پابندی سے نماز ادا کرو اور الصبور کا ورد نمازِ مغرب کے بعد تین ہزار بار کرو۔ خدا راحت دے گا۔

□ عدنان۔ گجرات

○ بابا جی! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے۔ میرے بہت سے مسائل ہیں جو میں بیان نہیں کرسکتا لیکن اِن میں دو بہت اہم مسائل ہیں جو آپ سے بیان کررہا ہوں۔ اِن کا جواب علیحدہ علیحدہ دیجیے گا۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کے فضل و کرم سے حافظِ قرآن ہوں لیکن میں صحیح رَوانی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ بابا جی! میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں، میرے باپ اور میرے چچا حج کے لیے چلے جائیں۔ پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اِس کے لیے بھی کوئی تعویذ دے دیں۔

☆ بیٹے عدنان! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ روزانہ سورۃ یٰسین کی باآوازِ بلند تلاوت کیا کرو۔ والد سے کہو اللہ سے دُعا کیا کریں کہ وہ اپنے گھر ضرور بلائے۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

□ سبین۔ کھاریاں

☆ بیٹی سبین! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے مگر بیٹی! کچھ باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ میرے اندازے کے مطابق بیٹی! تمہارے گھر پر اثرات ہیں جو تم لوگوں کو کافی پریشان کرسکتے ہیں اور تمہاری خوشیوں میں رکاوٹ بھی ڈال سکتے ہیں لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ جلد از جلد دونوں مسئلوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ جب تک تعویذ تیار نہیں ہوتے، روز بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو۔ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھو۔

□ تسلیم۔ بنوں

○ بابا جان! میرا مسئلہ حل کردیں، میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔ میری شادی کو 8 سال ہو چکے ہیں

اور اَب تک اولاد سے محروم ہوں۔ لوگوں کے رویے اَب مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ آپ نے میری جیٹھانی کو تعویذ دیا تھا' اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اَب پھر انہوں نے آپ سے تعویذ منگوایا۔ بابا جی! پلیز' مجھے بھی تعویذ تیار کردیں تاکہ میری بھی اولاد ہوسکے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ مجھے طریقۂ کار سب پتا ہے مگر میری جیٹھانی نے کہا' آپ ہر ایک کو تعویذ نہیں دیتے لہٰذا پہلے اجازت لے لو۔ بابا جی! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں' میری بھی مشکل حل کردیں تاکہ میں اپنے سسرال میں خوش وخرم رہ سکوں۔

☆ بیٹی تسنیم.....! اللہ سے مدد مانگو' وہ ضرور تمہاری دُعا قبول فرمائے گا۔ میں تعویذ تیار کردوں گا' بس خیال رکھنا' تعویذ استعمال کرنے کا بھی خاص طریقہ ہے۔ اِس پر عمل لازمی ہے۔ انشاء اللہ' کلامِ الٰہی کی برکت سے ضرور کرم ہوگا۔ خط میں مکمل کوائف اِرسال کرنا۔

□ شہرین۔ لاہور

○ پیارے بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتّے میں پتھری ہے۔ ہومیو پیتھک علاج کروا رہی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وِرد یا وظیفہ دیں جس کو پڑھنے سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہوکر پتّے سے نکل جائے۔ وظیفہ وغیرہ کتنے دن پڑھنا ہے اور کتنی مرتبہ' سارا تفصیل سے لکھ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ بابا جی! میری بڑی بہن کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ اُس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں کہ بغیر آپریشن کے پتّے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی شہرین! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو' ہزار بار یَاشَافِیُ پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دَم کرو اور پھر یہ پانی دن بھر پیتی رہو۔ دن بھر میں تمہارے کم از کم دس گلاس پانی کے ہونا چاہئیں۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ بہن سے کہو' وہ بھی یہی عمل کرے۔

□ صالحہ۔ فیصل آباد

○ میرا نام صالحہ ہے۔ میں فیصل آباد میں رہتی ہوں۔ میری امی کا نام رضیہ ہے، میں ایک دُکھی لڑکی ہوں۔ میں بچپن میں نفسیاتی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے پانچ جماعتوں کے آگے نہ پڑھ سکی، لیکن بفضلِ خدا اب ٹھیک ہوں۔ میری عمر اب 18 سال ہے۔ 15 سال کی عمر میں میرا نکاح ہوا جو ایک سال بعد ختم ہوگیا۔ میرے بھائی لوگوں نے ان کو گالیاں دے کر دباؤ ڈال کر طلاق لے لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بھائی کہتے تھے کہ ابھی شادی نہیں ہوئی صرف نکاح ہے، وہ کیوں ہمارے گھر آتا ہے۔ وہ پیار کرتا تھا، جان دیتا تھا مجھ پر اور میں بھی پیار کرتی تھی، ہوں اور رہوں گی۔ اس لڑکے کا نام نعمان ہے۔ اس کی امی کا نام روشن ہے۔ میری ابھی بھی بات ہوتی ہے نعمان سے۔ میں سچی محبت کرتی ہوں اس لڑکے کے بعد بھی میری شادی ہوئی، وہاں سے بھی طلاق ہوگئی، وہ شراب پیتا تھا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میں نعمان کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں، لیکن اس کی ایک جگہ منگنی ہوگئی ہے۔ وہ توڑ بھی سکتا ہے لیکن اس کے ابو وہاں شادی چاہتے ہیں۔ وہ ابو کی وجہ سے نہیں توڑ رہا اور میں اس کی محبت میں پاگل ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میری جہاں بھی شادی ہو، میں وہاں دل نہیں لگا سکتی۔ پلیز کوئی ایسا تعویز دیں کہ میری اس لڑکے سے شادی ہوجائے۔ پلیز پلیز پلیز میرے جذبات کو سمجھیں۔ آپ کے نزدیک شاید میری بے وقوفی ہو، لیکن میں ان انسانوں میں نہیں جو ٹائم پاس ہوتے ہیں۔ میری زندگی میں ایک تھا، ایک ہے اور یہ ایک ہی رہے گا۔ خدا کا واسطہ مجھ پر رحم کریں۔ ایسا نہ ہو اس کی شادی ہوجائے۔ اگر ایسا ہوا تو میں جیتے جی مرجاؤ گی۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو کب کی کرچکی ہوتی، کیوں کہ جسے میرے پیار کو میرے گھر والوں نے دور کیا، حالاں کہ وہ شوہر بھی تھا میرا، وہ میں جانتی ہوں یا خدا جانتا ہے کہ میں روز جیتی ہوں، روز مرتی ہوں۔ اس کی یاد میں رو رو کر نظر دور کی مکمل ختم ہے اور کانوں کی سماعت بہت متاثر ہے۔ میں نے لاہور سے 74 ہزار کے آلے لگوائے ہیں۔ اگر آلے اتار دوں تو مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔ ابھی عمر

بڑی ہے، میرا کیا بنے گا۔ پلیز نظر کا اور کان کی سماعت کا بھی کوئی حل بتائیں اور تعویذ بھی دیں۔ جس عمر میں لڑکیاں کالج جاتی ہیں، مجھے 2 بار طلاق ہوئی اور پیار کی خاطر تڑپ رہی ہوں۔

☆ بیٹی صالحہ! تمہارے بڑوں نے واقعی میں زیادتی کی۔ نکاح کے بعد وہ شخص تمہارا شوہر تھا، اگر بھائیوں کو اس کا آنا جانا پسند نہیں تھا تو تمہاری رخصتی کردیتے۔ طلاق مذاق نہیں ہے۔ بہرحال تم تعویز منگوانا چاہتی ہو۔ اس کے لیے کچھ کوائف کی ضرورت ہوگی۔ مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تمہیں تفصیل ارسال کی جاسکے۔

□ عمر خان۔ چمن۔

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ بابا جی! جس طرح آپ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں' اِس کا اجر اللہ آپ کو دونوں جہاں میں دے۔ بابا جی! ہم بھی آج ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ وہ مسئلہ میرے کزن کا ہے۔ بابا جی! کچھ عرصے پہلے اُس نے کاروبار شروع کیا جو بہت اچھا چل رہا تھا مگر اَب بالکل نہیں چل رہا۔ وہ بہت پریشان ہے کیونکہ اُس کا سارا سرمایہ اِس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ بابا جی! آپ ہمیں ایسا تعویذ دیں جس کے کرنے سے کاروبار بہت ترقی کرے۔ ہم آپ کو تمام عمر دُعائیں دیں گے۔ اللہ حافظ! اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف فرمائیں۔

☆ بیٹے عمر.....! تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے مکمل معلومات حاصل کرلو۔ نماز کی پابندی کرو۔ خیال رہے' نماز قضا نہ ہو۔ مسئلہ حل ہونے پر کچھ رقم ضرور خیرات کردینا۔

□ شگفتہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی شگفتہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہارے شوہر درست کہتے ہیں مگر بیٹی! والدین بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ تم اُن سے ملنے ضرور جایا کرو اور کھڑے کھڑے جایا کرو۔ شوہر کو ساتھ مت لے جاؤ۔ بیٹی! والدین کی خبرگیری کرنا تمہارا فرض ہے۔ بھائی یا بھاوج کے رویے کی وجہ سے جانا ترک مت کرو تاکہ زندگی میں تمہیں ہمیشہ اطمینانِ قلب رہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 71-71 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ راحیل۔ میانوالی

○ بابا جی! السلام علیکم۔ اچھے پرچے کرنے کے باوجود میرا رول نمبر اخبار میں نہیں آیا، جان بوجھ کر فیل کردیا گیا۔ میٹرک کے بعد آگے پڑھنے کے کتنے خواب دیکھے تھے، سب بکھر گئے۔ خاندان میں جتنے لڑکوں نے امتحان دیا تھا وہ سب ہی اچھے گریڈ میں پاس ہوئے ہیں یا ہوسکتا ہے کہ جھوٹ بول رہے ہوں۔ ابو کہتے ہیں اب کوئی کام سیکھو۔ میں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ اب دل اس قدر ٹوٹا ہے لگتا ہے کبھی بھی پاس نہیں ہوسکتا۔ دوبارہ میٹرک کے پرچے دینے سے میں احساس کمتری کا شکار ہوجاؤں گا۔ بابا جی! پلیز کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں کامیاب ہوجاؤں۔

☆ بیٹے راحیل! محنت کرنے کے بعد دوبارہ امتحان سے تم پاس ہوجاؤ گے اور احساس کمتری ختم ہوجائے گا جبکہ میٹرک پاس نہ کرنے پر ساری عمر فیل ہونے کا احساس رہے گا۔ مان لو کہ جان بوجھ کر کسی نے فیل نہیں کیا۔ یہ ناکامی عارضی ہے اس کو مستقل نہ بناؤ۔ ناکامی کا اعتراف ہی کامیابی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ حوصلہ نہ ہارو۔ کام سیکھنے میں بھی برائی نہیں لیکن میٹرک پاس کرنا ضروری ہے۔ باقی نماز پنجگانہ کو عادل بناؤ اور ''یا حی یا قیوم'' ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھ لیا کرو۔

□ مہوش۔ سجاول

○ پیارے بابا جی! میں اپنے بہت اہم مسئلے کے ساتھ آپ کے پاس حاضر ہوں۔ بابا جی! میں ایک بینک میں جاب کررہی تھی، وہاں وولڈ کے ایسے تھے جو مجھے اکثر پریشان کرتے۔ کچھ بڑی عمر کے لوگ تھے وہ بھی غیر ضروری باتیں کرنا چاہتے۔ میں نے تنگ آکر استعفیٰ دے دیا۔ مجھے امید تھی منیجر مجھے روک لیں گے کیوں کہ وہ میرے کام کی تعریف کرتے تھے مگر ایسا نہ ہوا۔ میرے جانے سے پہلے ایک لڑکی آگئی۔ گھر آکر مجھے بہت رونا آیا اور اب میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی امی کو ساتھ لے کر بینک جاؤں اور منیجر سے ملوں، ان کو بتاؤں کہ میں کس قدر ضرورت مند ہوں۔ بابا جی! خدا کے لیے ان کے دل

میں رحم ڈالنے کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں اور کوئی تعویز ہو تو میرے لیے عنایت کیجیے۔

☆ بیٹی مہوش! استعفیٰ دینے سے پہلے دوسری ملازمت تلاش کرلی جاتی تو بہتر تھا۔ آئندہ کبھی بھی جذبات میں آکر استعفیٰ نہ دو، بلکہ درپیش مسائل مثبت انداز میں حل کرنے کی کوشش کرو۔ کوئی شخص غیر ضروری باتیں نہیں کرسکتا اگر تم نہ چاہو۔ گھر سے باہر نکلنے والی لڑکیوں کو سادگی اختیار کرتے ہوئے خود کو مضبوط بنانا چاہیے اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے باہر کے مسائل کا خود مقابلہ کریں۔ اس کے علاوہ کبھی خود کو مجبور نہ سمجھو اور نہ ہی کسی سے اپنی مجبوری یا پریشانی کا ذکر کرو۔ اب دوسری ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ نماز کی پابندی کرو اور الفتاح کی تسبیح ہر نماز کے بعد جاری رکھو۔ سابقہ تجربہ، اعتماد اور جستجو سے پہلے سے زیادہ بہتر مل سکتی ہے۔ یقین کرو بیٹی ہر پریشانی عارضی ہوتی ہے۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

□ دردانہ۔ امریکہ

○ بابا جی، السلام علیکم۔ میں اپنی زندگی سے بے زار ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے اس قدر خوش تھی کہ ملک سے باہر جارہی ہوں۔ ایک نئی دنیا دیکھنے کو ملے گی، مگر شوہر بہت خشک مزاج ہیں۔ ہم زیادہ تر گھر میں رہتے ہیں۔ اگر میں کوئی شکوہ شکایت کروں تو ان کا مزاج خراب ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں میکے میں جاکر کچھ عرصہ رہ لو، جب دل خوش ہوجائے تو آجانا۔ امی حیات نہیں، ابو نے دوسری شادی کرلی ہے۔ میرا میکے میں کوئی اپنا نہیں۔ کبھی کہتے ہیں پڑھ لو، یہ سوچ کر گھبراہٹ ہوتی ہے۔ میں نے تو اپنے ملک میں ہی میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ زندگی کی ناکامی اور شادی کے ٹوٹنے سے ڈرتی ہوں، اس لیے صبر کررہی ہوں۔ ان ساری باتوں کی وجہ سے میں پہلے کی طرح شوخ طبیعت نہیں رہی۔ بابا جی! خدارا کچھ ایسا کریں کہ میری بے کلی کو سکون ہوجائے۔

☆ بیٹی دردانہ! وجہ خواہ کوئی بھی ہو، یہ اچھی بات ہے کہ تم صبر کررہی ہو۔ صبر کرنے پر مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تو ایک مثبت رویہ ہے۔ صبر کا مطلب ہے منفی ردعمل سے رکنا اور بے سوچے سمجھے اقدامات کرنے سے خود کو روکنا، خاص طور پر جذبات میں آکر فیصلہ نہ کرنا بلکہ سوچ سمجھ کر شعوری صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے وقتی مایوسی اور ناامیدی کو برداشت کرکے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے کام کرتے جانا۔ شوہر کی طرف سے پڑھنے کا مشورہ بہت بہترین ہے۔ اس سلسلے میں وہ بھی تمہاری مدد کریں گے۔ شوخ طبع لوگوں میں دوسروں کو خوش رکھنے کی بے شمار صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ تم بھی اپنی کسی امتیازی خصوصیت سے کام لو اور گھر کی بے زار اور بورفضا کو خوشگوار صورتحال میں بدل دو۔ بعض اوقات صرف مسکراہٹ اور ہمدردی کے چند الفاظ ازدواجی زندگی کو پرکشش بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیٹی، نماز کی پابندی کرو۔ یا سلام کی تسبیح ہر نماز عصر کے بعد معمول بنالو۔

□ عائشہ۔ سکھر۔

○ محترم بابا جان! عرض یہ ہے کہ ہم نے تین سال پہلے یہ گھر خریدا تھا۔ جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں، ہمیں شدید نقصان ہورہا ہے، جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں، بنتے بنتے کام بگڑ جاتے ہیں، نہ ہی بچوں کو کوئی جاب مل رہی ہے نہ ہی کوئی کام ہورہا ہے۔ دو چار عالموں سے پتا کروایا ہے، کوئی کہتا ہے کہ آپ کے رشتے دار آپ سے بہت حسد کرتے ہیں۔ آپ رشتے داروں سے دور چلے جائیں تو آپ کے مسئلے حل ہوسکتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ پر کسی نے کالا جادو کروایا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ کی فیملی پر ہوائی چیزوں کے اثرات ہیں۔ اب کسی نے بتایا ہے کہ آپ کا گھر قبرستان کے پاس ہے، آپ کے گھر جنات کا سایہ ہے، آپ فوراً یہ گھر بیچ دیں۔ بابا جی! ہمیں سمجھ نہیں لگ رہی کہ کیا کریں؟ دس پندرہ لاکھ کا قرضہ بھی چڑھ گیا ہے۔ بابا جی! میں نے تقریباً گیارہ ماہ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الوکیل کا وظیفہ تہجد کے ٹائم 450 مرتبہ یہ بھی کیا ہے۔ آخر میں روزانہ فجر کے بعد سورۃ یٰسین، سورۃ رحمٰن اور سورۃ مزمل پڑھتی ہوں۔ عشاء کے بعد سورۃ واقعہ بھی پڑھتی ہوں لیکن پھر بھی کوئی کام نہیں ہورہا۔ ہمیں کسی نے بتایا ہے کہ آپ پر جو اثرات ہیں، اس کی وجہ سے آپ کے ہر کام میں رکاوٹ آرہی ہے۔ بابا جی! ہماری تمام رکاوٹیں ختم ہوجائیں، اس کے لیے کوئی وظیفہ بتادیں اور یہ بھی

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کرجاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

بتائیں کہ اگر ہم گھر بیچ کر کراچی شفٹ ہو جائیں تو کیا ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے؟ ہمارے لیے کیا کراچی جانا بہتر رہے گا؟ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا اس سال سی ایس ایس کے پیپر دے رہا ہے' اس کے لیے دُعا کردیں کہ اس کا سی ایس ایس کلیئر ہو جائے اور اس کو بہت اچھی جاب بھی مل جائے' اس کو پڑھنے کے لیے کچھ بتا دیں۔ بابا جی! ہمارے پانچ سال پہلے انگلینڈ کے ویزے لگے تھے جو کہ مئی 2017ء میں ختم ہو رہے ہیں۔ بابا جی! ہم نے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے دوبارہ اپلائی کیا تھا لیکن انہوں نے ہماری فیملی کے ویزے refuse کر دیے ہیں۔ بابا جی! ہمارے تمام مسائل کے حل کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں۔

☆ بیٹی عائشہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ کراچی شفٹ ہونے میں ابتدا میں تو مسائل ہوں گے مگر بعد میں حالات قابو میں آئیں گے۔ تم جو کچھ پڑھ رہی ہو' پڑھتی رہو' بس کچھ دنوں کے لیے سورۃ یٰسین پڑھنا ترک کر دو۔ بیٹے پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر دن میں 5 بار ضرور دم کیا کرو۔ فوراً تعویذ حاصل کرو اس کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے فوری معلومات حاصل کرو۔

□ سحر۔ ملتان

o محترم بابا جان! السلام علیکم! کئی سال سے میں ''سچی کہانیاں'' پڑھ رہی ہوں مگر خط لکھ نہ سکی۔ میرا پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میری شادی کو 18 سال ہو گئے ہیں۔ پہلے میرے شوہر کڑھائی کی دکان کرتے تھے مگر گھریلو مسئلے کی وجہ سے وہ دکان چھوڑنا پڑی پھر وہ سرکاری محکمے میں کلرک ہو گئے۔ بابا جی! میرے پانچ بچے ہیں۔ میرا مہینے کا آخر اتنا پریشان کن گزرتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ دوسرا کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کر نہیں پاتے۔ کئی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے بھی وظیفہ بتا دیں جس سے ہماری پریشانی دور ہو جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری چار لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جائیں لیکن ان کی پڑھائی میں دلچسپی بہت کم ہے۔ بابا جی! میں نماز پڑھتی ہوں۔ بچیاں بھی پڑھتی ہیں مگر میری فجر کی نماز اکثر قضا ہو جاتی ہے جس کا مجھے بہت ملال ہوتا ہے۔ کسی نے میرے شوہر کو نمازِ فجر کے بعد سورۃ رحمٰن اور عشاء کے بعد سورۃ واقعہ پڑھنا بتایا تھا' میں وہ پڑھتی ہوں۔

☆ بیٹی سحر! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ سورۃ رحمٰن پڑھنا جاری رکھو۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر ضرور دَم کر دیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہو۔

□ انعم۔ جلال پور پیروالا

o محترم بزرگ! السلام علیکم! امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ ربّ العزت آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ اس سے پہلے بھی آپ کو کئی خط پوسٹ کروائے مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ڈاک کی خرابی ہے' آپ تک تو پہنچ جاتے ہیں مگر پھر نہیں پتا؟ بہرحال اب مجھے رسالے میں ہی جلد از جلد جواب دے دیں۔ حالات بہت سنگین ہیں۔ میری عمر 33 سال ہو چکی ہے' اب تک رشتے آئے اور ختم ہو گئے۔ کافی عالموں کو دکھایا۔ تمام حالات بتانے بیٹھ گئی تو کئی کاپیاں بھر جائیں گی۔ اصل مسئلہ جو کھل کر سامنے آیا' وہ یہ ہے کہ میری امی کے ساتھ کوئی سایہ ہے جو کہ شادی سے پہلے کا ہے' اس نے مجھے (بچپن سے) میری چھوٹی بہن اور ایک بھائی ہم تینوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر کام میں بہت رکاوٹیں ہیں۔ صحت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ کسی سے بھی علاج کرواؤ تو وقتی فائدہ ہو جاتا ہے اور رشتے آنا شروع ہوتے ہیں' یہ وقتی فائدہ مہینہ بھر رہتا ہے۔ کبھی خواب میں دیکھتی ہوں کہ بہت بڑی 3 منزلہ بلڈنگ ہے' وہاں سے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہوں' آگے سیڑھیاں تنگ ہیں اور ابھی میں یہی سوچ رہی ہوں کہ گھر اتنا اچھا ہے اور سیڑھیاں کیسی بنائی ہیں کہ وہ بلڈنگ مجھ پر آ گرتی ہے اور آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی اور کبھی بہت اسی طرح کے خواب ہیں۔ امید ہے کہ اللہ ربّ العزت آپ کے ہاتھوں اس شیطان سے جان چھڑائیں گے۔ کوئی بہت جلالی وظیفہ اور جو بھی ہدایت دیں' عطا فرمائیں۔ جس بہن اور بھائی کے ساتھ مسئلہ ہے' اُن کا نام بھی لکھ رہی ہوں۔ جلد از جلد جواب دیں۔ بہت پریشان ہیں۔

☆ بیٹی انعم! تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا' بس اللہ سے دُعا کرو اور والدہ سے کہو کہ اپنے نام سے تعویذ منگوا کر گھر

میں محفوظ مقام پر رکھیں۔ انشاء اللہ' مسائل حل ہوں گے۔

□ زرمینہ۔ پشاور

o محترم بابا جی! السلام علیکم! جب سے میری شادی ہوئی ہے' میں نے تکلیف اور پریشانی ہی دیکھی ہے۔ میرا پہلے بیٹا ہوا تھا جو کہ مر گیا اور اس کے بعد 7-6 بیٹیاں ہوئیں جن میں سے 4 زندہ ہیں۔ چار میں سے تین کی شادی ہو گئی ہے اور ایک ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس زمانے سے اب تک میرے شوہر نے کچھ کام کاج نہیں کیا۔ بابا جی! جوانی میں تو مجھے کچھ پتا نہیں چلا' اِدھر اُدھر کام کاج کر کے گھر کی ضرورتیں پوری کر لیا کرتی تھی اور شوہر بھی مجھے مار پیٹ کر مجھ سے پیسے لے لیا کرتا تھا۔ اب بھی میرا شوہر کام نہیں کرتا ہے۔ میں پانچ سال تک اپنی بیٹی کے پاس رہی ہوں' اب اس سے علیحدہ ہوئی ہوں۔ وہ صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور رات کو 4-3 بجے تک آتا ہے۔ گھر کا سارا سامان بک چکا ہے۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں اس سے علیحدہ ہو جاؤں۔ یٰسین شریف میں مکمل روزانہ پڑھتی ہوں۔ آپ مجھے کوئی آسان سا وظیفہ بتائیں جو میں پڑھ سکوں۔ نماز پابندی سے پڑھتی ہوں۔ تمام عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی زرمینہ! اب بہت دیر ہو چکی ہے' علیحدگی کا فیصلہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہاری ذمے داریاں خوش اسلوبی سے مکمل فرمائے۔ نماز عشاء کے بعد 33 بارہ سورۃ اللھب پڑھو اور دعا کرو۔ کرم ہوگا۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ صدف۔ ملتان

☆ بیٹی صدف! بڑا دُکھ اور افسوس ہوتا ہے جب مسلمان گھروں کے افراد الٹے سیدھے عملیات کروانے والوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ایمان کی شدید کمزوری ہے اور یاد رکھو' اللہ کے ہاں بھی اس کی معافی نہیں۔ پریشانی' خوشی' بیماری' صحت سب خدا کی طرف سے ہے۔ خوشی میں شاکر رہنا اور پریشانی میں صابر رہنا ہی ایک مومن کا فرض ہے۔ اللہ سے خوب معافی مانگو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر نماز کے بعد الحمد شریف' چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دَم کیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کرو۔

علاج اور مکمل شفاء

[illegible] بزو!

ان [illegible] سب کو اپنی امان میں رکھے۔

[illegible] اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

[illegible] بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

[illegible] دانتوں کی گوناگوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

[illegible] موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ [illegible] کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان [illegible] اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

II C-88۔ فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

جنت دو قدم پر

ایک اللہ والے فرمایا کرتے تھے کہ جنت دو قدم پر ہے۔

کسی نے کہا: ''حضرت جنت دو قدم پر ہے اس کا کیا مطلب ہے؟'' فرمایا: ''اے دوست! تو اپنا پہلا قدم اپنے نفس پر رکھ لے تیرا دوسرا قدم جنت میں پہنچ جائے گا۔

روایت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: ''ایک آدمی کسی دوسرے بستی میں اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے میں ایک فرشتہ بٹھا دیا جو اس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ شخص اس کے پاس سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''اس بستی میں میرا بھائی رہتا ہے اس کے پاس جا رہا ہوں۔''

فرشتے نے پوچھا۔ ''کیا اس کا تم پر کوئی احسان ہے جس کی وجہ سے تم یہ تکلیف اٹھا رہے ہو اور اس کا بدلا اتارنے جا رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں صرف اس لیے جا رہا ہوں کہ میں اس سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔''

فرشتے نے کہا۔ ''میں تیری طرف اللہ کا فرشتہ ہوں (اور یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ) اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت کرتا ہے جیسے تو اس سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہے۔ (مسلم)

حسنِ انتخاب: حنا بشریٰ۔ لاہور

حضرت حسن بصریؒ کہتے تھے

☆ اے ابن آدم! تیرے لیے ایک دنیا کی زندگی ہے اور ایک آخرت کی۔ یعنی تو اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح نہ دے۔ اللہ کی قسم! میں نے ان لوگوں کو دیکھا جنہوں نے اپنی دنیا کو آخرت پر ترجیح دی کہ وہ ہلاک ہوئے۔ ذلیل ہوئے، رسوا ہوئے۔

☆ اے ابن آدم! جب تیرے لیے آخرت کی بھلائی ذخیرہ کر لی گئی تو دنیا کی جو تکلیف آئے وہ نقصان نہیں دیتی اور جب تو آخرت کی خیر سے محروم کر دیا گیا ہو تو کیا دنیا کی کوئی راحت تجھے نفع دے سکتی ہے۔

☆ اے ابن آدم! دنیا سواری ہے اگر تو اس پر سوار ہوگا تو وہ تجھے اٹھائے گی اور اگر تو نے اسے اٹھایا تو یہ تجھے مار ڈالے گی۔

حسنِ انتخاب۔ شاعر عتیق۔ کراچی

لفظوں کی کرنیں

☆ غصہ کرنے کا مطلب ہے ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں اور یہ کتنی حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بات ہے۔

☆ عقلمند دوسروں کی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں جب کہ بے وقوف اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔

☆ دوست کمزور ہو جائیں تو دشمن خود بخود طاقت ور ہو جاتے ہیں۔

حسنِ انتخاب۔ تابندہ طارق۔ پشاور

عظیم باتیں

☆ عظیم ہیں وہ لوگ جو زندگی کے مشکل ترین لمحات کی کڑواہٹ کا مزہ چکھنے کے باوجود بھی خود کڑوے نہیں ہوتے۔ مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ زندگی ان ہی لوگوں کی وجہ سے خوب صورت لگتی ہے۔

☆ کسی کو معاف کر کے اچھے بن جائیں مگر اس پر دوبارہ اعتبار کر کے بے وقوف مت بنیں۔

☆ انسان سب سے سستا محبت کے نام پر بکتا ہے اور سب سے مہنگی انسان کو محبت ہی پڑتی ہے۔

☆ اپنے چہرے پر کوئی درد تحریر نہ کرو، وقت کے پاس نہ آنکھیں ہیں، نہ احساس، نہ دل۔

☆ اس تعلق سے لاتعلقی اچھی ہے جو دوسروں کے درد کو دیکھ کر ملے ورنہ اپنا درد تو جانوروں کو بھی محسوس ہوتا ہے۔

☆ فاصلے بڑھ جاتے ہیں تو غلط فہمیاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ پھر وہ بھی سنائی دیتا ہے جو کہا نہ ہو۔

☆ زندگی کا اپنا ہی رنگ ہے، دکھ والی رات سویا نہیں جاتا اور خوشی والی رات سونے نہیں دیتی۔

☆ کچھ لوگ جب روتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ کمزور ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ مضبوط رہتے رہتے تھک جاتے ہیں۔

حسنِ انتخاب: محمد جواد انور۔ اسلام آباد

تمہید

میں جب کہوں کہ تھک گئی ہوں بہت
سہارے کے لیے وہ ہاتھ بڑھا دیتا ہے
لڑکھڑا جائیں قدم کہیں چلتے چلتے
مہرباں بانہوں میں اپنی وہ سما لیتا ہے
کوئی خیال تھا یا خواب تھا جو بچھڑا ہے
سائے کی طرح مگر ساتھ ساتھ چلتا ہے
کمالِ ضبط سے میں نے اسے کیا تھا جدا
اب خلش بن کے میرے دل میں وہ مچلتا ہے
اتنی تمہید کیوں باندھی تھی اس نے حیرت ہے
میں بھلا کرتی ہی کیا جو کسی اور پہ وہ مرتا ہے

شاعرہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

مسلمان حاکم

حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں امیرِ شام حضرت ابو عبیدہؓ کی یہ حالت تھی کہ جب حضرت عمرؓ ملک شام پہنچے تو یہ دیکھنے کے لیے کہ امیر کہیں زہد و سادگی کو چھوڑ کر دنیاوی طمع میں تو نہیں آ گئے، ابو عبیدہؓ نے فرمایا: ''امیر شام! ہمیں اپنے گھر لے چلیں۔''

حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا کہ آپؓ وہاں جا کر کیا کریں گے۔ وہاں رونے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے اصرار پر امیرِ شام انہیں اپنے گھر لے گئے۔ جہاں پر ایک نمدے، لکڑی کی رکابی اور مشکیزے کے سوا کچھ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تم امیر شام ہو، تمہارے پاس مال اسباب کچھ نہیں؟ اگر کھانے کے لیے کچھ ہو تو وہ لاؤ۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے آپؓ کے سامنے سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے لا کر رکھ دیئے، جنہیں دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ رونے لگے۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا۔ میں نے پہلے ہی آپؓ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کو رونے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہمیں زیادہ سامان کی کیا ضرورت ہے۔ اتنا ہی کافی ہے جو اصل قیام گاہ یعنی آخرت تک پہنچا دے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے آپؓ کو گلے سے لگا لیا۔

حسنِ انتخاب: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن، وہاڑی

اقوال زریں

☆ تمام گناہوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔

☆ گناہ سے نفرت کرو لیکن گناہ گار سے نہیں۔

☆ اگر کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو مسلسل محنت کرو۔

☆ غصہ ایسی آندھی ہے جو دماغ کا چراغ بجھا دیتی ہے۔

☆ ہنسنے والوں کے ساتھ ہنسا مت کرو بلکہ رونے والوں کے ساتھ رویا کرو۔

☆کسی کا دل مت دکھاؤ کیونکہ کوئی تمہارا دل بھی دکھا سکتا ہے۔
☆غصہ تھوڑی دیر اور غرور ہمیشہ پاگل پن ہے۔
☆بڑے کام کرو بڑے دعوے نہ کرو۔
☆ناخوش انسان سمندر کی طرح ہوتا ہے۔
☆اللہ تعالیٰ فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
مرسلہ: یاسر کی نظام دین۔ اوکاڑہ

کچھ کھٹا میٹھا

☆اگر آپ کسی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑنا چاہیے۔
☆تجربہ بہترین استاد ہے لیکن اس مدرسے کی فیس بہت زیادہ ہے۔
☆ڈپلومیٹ وہ شخص ہے جو ایک عورت کی سالگرہ کا دن تو یاد رکھے لیکن اس کی عمر بھول جائے۔
☆تین آدمیوں میں راز، راز رہ سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان میں سے دو مر چکے ہوں۔
☆ایک مرتبہ شادی کرنا فرض ہے دوسری مرتبہ حماقت اور تیسری مرتبہ پاگل پن۔
☆ہجوم میں کئی سر ہوتے ہیں لیکن دماغ نہیں ہوتے۔
☆مہمان چلے جانے کے بعد اکثر بہت اچھے لگتے ہیں۔
☆جب دولت محو گفتگو ہوتی ہے تو کوئی قطع کلامی نہیں کرتا۔
☆اپنے متعلق آپ خود کچھ نہ کہیں یہ کام آپ کے جانے کے بعد ہو جائے گا۔
☆کوئی آئینہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر نہیں پیش کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔
☆خوشی امید کی ایک ''ماسٹر کی'' ہے جس سے ہر بند دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔
☆انسان کی زندگی کبھی پودوں جیسی ہوتی ہے کچھ کو پانی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی کو راہ دکھاتے ہیں کچھ کو جنگل کے پودوں کی طرح خود سنبھالتے ہیں۔
حسنِ انتخاب۔ کرن شہزادی۔ راولپنڈی

نصیب والا

جھڑکیاں دینے والا، رعب جمانے والا، دھمکیاں دینے والا بھول چکا ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان ہے۔ انسانوں پر رعب جمانے اور انہیں جھڑکیاں دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہر نقلی استحقاق صرف غرور نفس کا دھوکا ہے اور غرور انسان میں صرف اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ بدقسمت نہ ہو۔ نصیب والے ہمیشہ عاجز و مسکین رہتے ہیں۔ (واصف علی واصف)
مرسلہ۔ عامر بشیر۔ سعودی عرب

کہانی مرے بس یہی ہے

کئی غم ہیں میری کہانی کے اندر
اداسی بھری ہے میرے دل کے اندر
بھلا کس طرح میں بچھڑ کر جیوں گی
کہ آنکھوں سے امنڈا ہوا ہے سمندر
بھی بھی تمہیں میں بھلا نہ سکوں گی
مرے دل پہ تیری جدائی کے نشتر
تمہیں یاد ہو گا کہ ہم کب ملے تھے
مجھے یاد پورے دسمبر کا منظر
بڑی ہی کٹھن ہیں جدائی کی راتیں
تیری یاد آتی ہے شدت سے اکثر
تمہیں میرے راجہ حویلی مبارک
غریبوں کی قسمت غریبی مقدر
فری یہ زمانہ بڑا مطلبی ہے
سبھی پھول چہرے مگر دل کے پتھر
شاعرہ: فریدہ فری۔ لاہور

سوچ ریزے

☆کچھ ارادے کچھ فیصلے کچھ خواہشیں در پا کنارے بنی بستیوں جیسی ہوتی ہیں۔ جنہیں کچھ پورا نہیں ہونا ہوتا۔ وقت مٹی کی ڈھیری میں تبدیل ہو جانا ہوتا ہے اور انسان کیا ہے ایک مٹی کی ڈھیری اور اکڑتا کتنا ہے؟
☆کوئی کوئی لمحے ایسے بھی تو زندگی میں آتے ہیں جب دعائیں بھی پوری نہیں مانگی جا سکتیں اور ادھوری دعائیں بھی روگ جیسی ہوتی ہیں۔ ہم کسی کا ساتھ مانگتے ہیں اور وہ مل بھی جاتا ہے لیکن پھر نباہ نہیں ہو پاتا۔ فطرتوں میں تضاد نکل آتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جھگڑے پھیل کر جدائیوں کا دشت بن جاتے ہیں تو وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ہم نے دعائیں ادھوری مانگی ہوتی ہیں۔ دعائیں تو بڑی مکمل بڑی جامع ہونی چاہئیں۔
حسنِ خیال۔ اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

یادیں

چاہتوں کے سفر میں کچھ یادیں ہمارے ذہن و دل میں بہت گہرے نقوش مرتب کرتی ہیں۔ وہ یادیں ان خوشگوار لمحوں پر محیط ہوتی ہیں جو ہمارے لیے ان گنت مسکراہٹوں کا باعث بنتے ہیں جب کہ ان میں سے کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے لیے نہایت اذیت کا سبب بنتی ہیں۔ جس گھڑی ان یادوں کا دل پر نزول ہوتا ہے اس وقت ہماری آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ ہر نئی سانس ہمارے لیے ایک نئی اذیت کی پیامبر بن کر ابھرتی ہے۔ یہ یادیں ایک زہریلی ناگن کی شکل میں ہمیں ڈستی رہتی ہیں اور ان یادوں کا زہر ہماری روح و جسم میں سرائیت کر جاتا ہے۔ ہم اپنی زندگی سے اس زہر کو نکالنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن یہ زہر ہماری رگ و جان میں پیوست ہو جاتا ہے کیوں کہ جن لوگوں کو ہم اپنے دل میں بسا لیتے ہیں۔ ان سے وابستہ یادیں ہمارے دل میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ ہم ان یادوں کو بھلانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر وہ یادیں ہمارے دل پر حملہ آور ہو جاتی ہیں اور پھر سے ان یادوں کے زہر آلود نشتر ہمارے دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ یادیں ایک عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور یہ عذاب زندگی کی سانسوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ ہم اپنے دل پر بوجھ تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس بوجھ سے خود کو آزاد نہیں کر پاتے۔ ہم [illegible] ہوتے ہیں لیکن ''جی'' نہیں سکتے۔ زندگی اور [illegible] میں فرق یہ ہے کہ جینے سے مراد ایسی زندگی [illegible] خوشیوں سے بھرپور ہو۔ ہر لمحہ ہمیں نئی [illegible] ہمارے ساتھ ایک ایسا شخص ہو جس کا وجود ہمارے لیے سراپا خلوص ہو۔ ہم اپنی زندگی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اس کی مرضی سے بسر کریں جب کہ محض زندہ رہنے کا مطلب ایسی زندگی بسر کرنا ہے کہ جس میں ہماری زندگی کی تمام تر خوشیاں ہم سے روٹھ چکی ہوں گویا ہم سانس تو لیتے ہیں لیکن ہمارا دل انہی یادوں کے جھروکوں میں کھو جاتا ہے اور ہم انہی یادوں میں تمام عمر بسر کر دیتے ہیں۔
مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

غزل

سب میں موجود اور سبھی سے الگ
اب میں بیٹھی ہوں زندگی سے الگ
عشق آباد لے کے جاتا ہے
یہ جو رستہ ہے آگہی سے الگ
ایسا منظر بھی آنکھ نے دیکھا
تھا دیا اپنی روشنی سے الگ
دور اک جھیل بہتی رہتی ہے
خشک ہونٹوں کی تشنگی سے الگ
مسئلہ ہے یہی محبت کا
اس کے دل میں ہوں اور اُسی سے الگ
زندگی ایسے موڑ پر آئی
غم سے محروم ہے خوشی سے الگ
اپنی دنیا میں وہ مگن ہے بہت
میرے دل کی شکستگی سے الگ
کوئی رستہ نکل نہیں سکتا
میر و غالب کی شاعری سے الگ
شاعرہ۔ حمیرا راحت

تم کیا جانو کہ زندگی کیا ہے؟

زندگی بھی ایک دائرے کی مانند ہے جس کے ہر صفحے پر دن، تاریخ، ماہ و سال زندگی چسپاں ہیں۔ صفحہ ایک سے لے کر آخر تک زندگی اس پر بے شمار تاریخیں لکھتی ہیں ہر تاریخ کی نوعیت زندگی کے مزاج پر منحصر ہے۔ جب یہ خوشی ہوتی ہے تو دھنک کے ساتوں رنگ ڈائری پر سجاتی ہے اور جب ناخوش ہوتی ہے تو ماتمی سیاہ رنگ سے صفحوں پر کالا کر دیتی ہیں۔ ہم اگر شروع

سے آخر تک اسے پڑھتے جائیں تو پتہ چلے گا کہ تاریخ کے ساتھ ساتھ تحریروں میں پختگی سوچ اور تجربہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن افسوس کہ جوں ہی ہم ان تجربوں اور پختگیوں سے فیض یاب ہونے لگتے ہیں۔ ڈائری کے صفحات ختم ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ: فرح عالم، چک شہزاد

محبت

محبت اپنے عروج کے بعد زوال ضرور دیکھتی ہے۔ جس طرح خاموشی سے کوئی دل میں گھر کر جاتا ہے۔ اسی طرح بہت خاموشی سے کوئی اپنے سے پرایا بھی بن جاتا ہے۔ چند واقعات محض کچھ لمحے ہی درکار ہوتے ہیں۔ کسی کے دل سے اترنے میں اور پھر دل کی زمین بنجر ہو جاتی ہے۔ وہاں محبت پھر کبھی پروان نہیں چڑھتی بس یادوں کی کھردری زمین رہ جاتی ہے۔

عظمیٰ ناصر۔ کراچی

مرد اور عورت

مرد فطرتاً ایک بچہ ہے۔ جب کسی کی چاہت میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر اسے پانے کے لیے اس کی کیفیت ایک ایسے ضدی بچے کی سی ہو جاتی ہے جسے اپنا من پسند کھلونا ہر حال میں چاہیے ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ خود کو سر بازار نیلام تک کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

جب کہ ہمارے معاشرے کی عورت اکثر ایک ایسی خاموشی جھیل کی مانند ہوتی ہے جس میں پتھر پھینکنے سے وقتی تلاطم ضرور پیدا ہوتا ہے مگر پھر شانت ہو جاتی ہے وہ جس سے محبت کرتی ہے اسے پانا بھی چاہتی ہے مگر جب کوئی راہ دکھائی نہ دے تو حالات کے آگے ہتھیار بھی ڈال دیتی ہے۔

دعاؤں کی چھاؤں میں وہ اپنی چاہت کو نم آنکھوں سے اپنے ہی ہاتھوں کسی اور کو سونپ دیتا ہے اور اف تک نہیں کرتی۔

مرسلہ: جمیلہ بشیر۔ لیاری ایکسپریس، کراچی

دولت

دولت کا انبار کھاد اور کوڑی کے ڈھیر کی مانند ہے۔ جس شخص کے پاس یہ ڈھیر جمع رہتا ہے اس کے وجود سے اس کے گرد و نواح اور اس کی سانسوں سے بدبو کے بھبکے آتے رہتے ہیں لیکن جونہی کھاد کا یہ ڈھیر دور دور بکھیر دیا جاتا ہے اور آسمانوں سے اس پر شبنم کا نزول ہوتا ہے۔ تو اس میں سے خوب صورت رنگوں والے خوشبو دار پھول پیدا ہوتے ہیں جن کی خوشبو سے ساری کائنات مہکنے لگتی ہے۔

حسنِ انتخاب: شاہانہ احمد کراچی

غزل

طاقِ رفتہ پہ سجایا تو نہیں جا سکتا
تیرے جانے کو بھلایا تو نہیں جا سکتا
یاد کر لیتا ہوں ہر روز تیرے ملنے کو
دوسرے شہر سے آیا تو نہیں جا سکتا
جو ملے تیری شباہت سے الگ ہوتا ہے
اب کوئی تجھ سا بنایا تو نہیں جا سکتا
اپنے دل میں ہی رکھو آتشِ احساسِ زیاں
شہر کا شہر جلایا تو نہیں جا سکتا
اپنے سائے کی رفاقت ہے بڑی بات مگر
ہر جگہ ساتھ یہ سایہ تو نہیں جا سکتا

شاعر۔ احمد رضوان۔ ملتان

حیا

مولوی اپنے درجن بھر بچوں اور بیوی کے ساتھ کسی دعوت میں گیا۔ میزبان نے جب اتنے لوگ دیکھے تو غصے اور طنز سے بولا۔

''حیا نہیں آئی؟'' مولوی صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

''نہیں جناب! اس کے پیپر ہو رہے تھے اس لیے وہ نہیں آئی۔''

حسنِ انتخاب۔ احسن شہزاد۔ لاہور

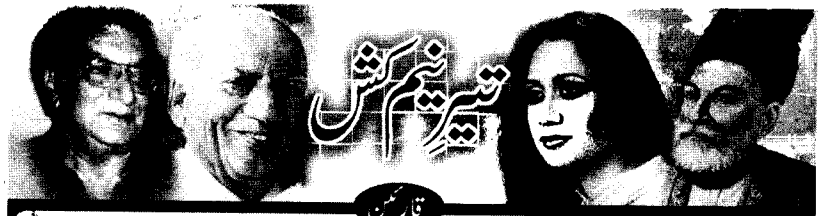

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

عبدالغفار عابد..... چیچہ وطنی

پھر نہ ہمت ہوئی سوالوں کی
اس قدر مختصر جواب ملا

مور شاہد حسین..... قمبر، شہداد کوٹ

ہماری مختصر محبت کا یہ انجام ہوا جاناں
تم بچھڑ گئے اور ہم ٹوٹ کر بکھر گئے

ہارون الطاف..... سنگیال

عرش والے میری توقیر سلامت رکھنا
فرش والوں کے خداؤں سے الجھ بیٹھا ہوں

مہر پرویز احمد دولو..... میاں چنوں

رستوں پہ نہ بیٹھو کہ ہوا تنگ کرے گی
بچھڑے ہوئے لوگوں کی صدا تنگ کرے گی
مت ٹوٹ کے چاہو اسے آغاز سفر میں
بچھڑے گا تو اک ایک ادا تنگ کرے گی

شعبان کھوسہ..... کوئٹہ

دنیا میں وفاؤں کا صلہ پوچھ رہے ہو
اک بار تمہیں کہہ تو دیا، کچھ نہیں ہوتا
ہوتا ہے اگر عشق تو ہوتا ہے فقط عشق
پندار و خودی یا میں انا کچھ نہیں ہوتا

خواجہ حسین جاوید..... مظفر آباد

کہا میں نے کہاں ہو تم
جواب آیا، جہاں ہو تم

رضوانہ کوثر..... لاہور

ہمارے رشتے میں سچ ہے، معاملے میں نہیں
ہمارے بیچ میں ہوتی انا زیادہ ہے

دنوں کے بعد مجھے اس نے دکھ دیا تھا کوئی
میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکا زیادہ ہے

خضر حیات..... روڑہ بھل

کسی نے جب اس سے پوچھا کہ چاہت کیا ہے
پہلے تو بہت رویا پھر میری مثال دی اس نے

عمر العطاس..... کراچی

میرے اندر ہی کہیں میرا سفر جاری ہے
آپ کہتے ہیں کہ ہجرت ہی نہیں کی میں نے
خود کو قربان کیا ہجر کے مقتل میں سلیم
کون کہتا ہے سخاوت ہی نہیں کی میں نے

سعادت علی خان..... لیہ

میں کر رہا تھا اس سے بچھڑنے کی التجا
وہ شخص میرا ہاتھ بٹانے میں لگ گیا

سید عدنان علی..... لانڈھی، کراچی

میں خیر و شر کے توازن میں جینا چاہتا ہوں
مجھے پتا تو چلے مجھ میں کیا زیادہ ہے
یونہی نہیں ملے معنی مری خموشی کو
بس اپنے آپ کو میں نے سنا زیادہ ہے

محمد عزیز..... وہاڑی

دھوپ میں پیڑ کا کیا حال ہے احساس نہیں
راہ میں چھاؤں کا ہر شخص تمنائی ہے

علی رضا عمرانی..... جھجو، سندھ

اطراف میں ایسی تاریکی، جگنو بھی نہیں، آنسو بھی نہیں
اے شام دعا اب روشن ہو، میں شام سے تنہا زندہ ہوں
آنگن میں گم صم بیٹھا ہوں اسباب کا رنج لیے
سناٹا باتیں کرتا ہے مجھ سے میں گویا زندہ ہوں

ابوہریرہ بلوچ.....بورے والا

انتظارِ یار بھی لطفِ کمال ہے
آنکھیں کتاب پر اور سوچیں جناب پر

منشی محمد عزیز مئے.....لڈن وہاڑی

چاہا ہے تجھ کو تیرے تغافل کے باوجود
اے زندگی تُو یاد کرے گی کبھی مجھے

سلمان شبیر.....اکوال، تلہ گنگ

سرمئی شام کی آنکھوں میں خوف طاری ہے
جس طرح سوگ کی راتوں میں بین جاری ہے
جسے قسمت کے ہاتھوں سے جیت ملتی رہی
آج اس نے مرے ہاتھوں میں زیست ہاری ہے

یاسر وکی.....دیپال پور، اوکاڑہ

اشک کی بوند کو مٹی سے بچا کر رکھنا
یہ ٹپک جائے تو مشکل ہے اٹھا کر رکھنا
وہ جو پیتے رہے آنسو وہ بھلا کیا جانیں
قطرۂ اشک کو مژگان پہ سجا کر رکھنا

ارسلان افسر.....کراچی

غم تو یہ ہے کہ دل کے جلنے سے
ان کی تصویر جل گئی ہوگی

مسز عبداللہ شاہد.....کراچی

نگاہیں بے تحاشہ بولتی ہیں
محبت پاگلوں کی گفتگو ہے

ترین گل.....مانسہرہ

مانگے تو اگر، جان بھی ہنس کر تجھے دے دیں
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی
معلوم ہمیں بھی ہیں بہت سے ترے قصے
پر بات تری ہم سے اچھالی نہیں جاتی

الفت جہاں.....کراچی

پھول کھلتے ہی چلے جاتے ہیں
کس قدر شوقِ نمو ہے مجھ میں
زخم کھا کر بھی دُعا دیتا ہوں
اپنے اجداد کی خو ہے مجھ میں

مختار بانو طاہرہ.....کراچی

مندمل تلوار کے تو زخم ہو جاتے ہیں پُر
زخم بھرتا ہی نہیں ہے لفظ کی شمشیر کا

طیبہ عبید.....کراچی

میں نے ان سب چڑیوں کے پر کاٹ دیے
جن کو اپنے اندر اڑتے دیکھا تھا

بینش خان.....ایبٹ آباد

ہر ایک گھر پہ مسلط ہے دل کی ویرانی
تمام شہر پہ سایہ مرے مکان کا ہے

نیلی کنول.....لالہ موسیٰ

دل جیتنا کسی کا بڑے فن کی بات ہے
یہ فن خدا نے اس کی اداؤں میں رکھ دیا

سبط جہاں.....گوجرانوالہ

فاقہ کشی میں خوش ہوں پر اتنا تو دے مجھے
شرمندگی نہ ہو کسی مہماں کے سامنے

نازنین.....کراچی

بہت کٹھن ہے ترازو میں زندگی رکھنا
نباہ دونوں ہی پلڑوں سے کر رہا ہوں میں

مہک بانو.....پتوکی

عجیب درد کا رشتہ تھا، سب کے سب روئے
شجر گرا تو پرندے تمام شب روئے

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem

میرا یہ پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے

نام:

پتا:

کوپن برائے

تیرنیم کش

اپریل 2017ء